علی نصیری

علوم حدیث

کا تعارف

قال رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انا مدینۃ العلم و علی بابہا

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

علوم حدیث کا تعارف

تالیف : حجۃ الاسلام علی نَصیری

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

نام کتاب فارسی	....	آشنائی با علوم حدیث
نام کتاب اردو	....	علوم حدیث کا تعارف
تالیف	....	حجۃ الاسلام علی نصیری
ترجمہ	....	محمد حسن جعفری
تطبیق وتہذیب	....	رضا حسین رضوانی
ہمکار	....	علی محمد رحمانی
طبع دوم	....	مارچ ۲۰۱۶ء
مطبع	....	محراب پریس کراچی

ISBN 978-969-9303-25-0

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئیؒ نے ۱۹۷۷ء میں جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان کی بناء رکھی تھی۔ یہ ادارہ اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ کی سرپرستی میں کوشش کر رہا ہے کہ حتی الامکان معتبر اسلامی لٹریچر دنیا تک پہنچایا جاسکے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم و معارف کی طرف متوجہ کرانا اور اُس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا اور اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

الحمد للہ یہ ادارہ اب تک اردو اور انگریزی زبانوں میں عراق، ایران، لبنان، افغانستان، سوڈان، مصر اور تیونس کے علماء اور دانشوروں کی سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

علاوہ ازیں یہ ادارہ ایک ہزار سے زائد مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم نونہالوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اسلام کی دعوت ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لیے تمام مومنین کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں تعاون کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بحق محمدؐ و آل محمدؑ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی

وکیل آیت اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی

اسلام

اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ نے اپنی پہچان کرانے کے لیے پسند کیا، اپنی نظروں کے سامنے اس کی دیکھ بھال کی، اس کی تبلیغ کے لیے بہترین خلق کا انتخاب فرمایا۔ اپنی محبت پر اُس کے ستون کھڑے کئے، اُس کی برتری کی وجہ سے تمام ادیان کو سرنگوں کیا اور اس کی بلندی کے سامنے سب ملتوں کو پست کیا۔ اس کی عزت کے ذریعے دشمنوں کو ذلیل اور اُس کی مدد سے مخالفوں کو رسوا کیا۔ اس کے ستون سے گمراہی کے کھمبوں کو گرا دیا۔ پیاسوں کو اس کے تالابوں سے سیراب کیا اور پانی اُلچنے والوں کے ذریعے حوضوں کو بھر دیا۔ پھر اسے اس طرح مضبوط کیا کہ نہ اس کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں، نہ اس کی کڑیاں الگ الگ ہوسکتی ہیں، نہ اس کی بنیاد گر سکتی ہے، نہ اس کے ستون اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں، نہ اس کا درخت اکھڑ سکتا ہے، نہ اس کی مدت ختم ہوسکتی ہے، نہ اس کے قوانین ختم ہوسکتے ہیں، نہ اس کی شاخیں کٹ سکتی ہیں، نہ اس کی راہیں تنگ نہ اس کی آسانیاں دشوار ہیں، نہ اس کے سفید دامن پر سیاہی کا دھبہ، نہ اس کی استقامت میں پیچ و خم، نہ اس کی لکڑی میں کجی، نہ اس کی کشادہ راہ میں کوئی دشواری ہے، نہ اس کے چراغ گل ہوتے ہیں، نہ اس کی خوشگواریوں میں تلخیوں کا گزر ہوتا ہے۔ اسلام ایسے ستونوں پر حاوی ہے جس کے پائے اللہ نے حق کی سرزمین میں قائم کیے ہیں اور اُن کی بنیاد کو استحکام بخشا ہے اور ایسے سرچشمے ہیں جن کے چشمے پانی سے بھرپور اور ایسے چراغ ہیں جن کی لوئیں ضیابار ہیں۔ ایسے مینار ہیں جن کی روشنی میں مسافر قدم بڑھاتے ہیں اور ایسے نشان ہیں جن سے سیدھی راہوں کا قصد کیا جاتا ہے اور ایسے گھاٹ ہیں جن پر اترنے والے اُن سے سیراب ہوتے ہیں۔ اللہ نے اسلام میں اپنی انتہائے رضامندی، بلند ترین ارکان اور اپنی اطاعت کی اونچی سطح کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نزدیک اس کے ستون مضبوط اس کی عمارت سربلند، اس کی دلیلیں روشن اور لوئیں ضیابار ہیں۔ اس کی سلطنت غالب اور مینار بلند ہیں اور اس کی بیخ کنی دشوار ہے۔ پس تم اس کی عزت باقی رکھو اس کے احکام کی پیروی کرو، اس کے حقوق ادا کرو اور اس کے ہر حکم کو اس کی جگہ پر قائم کرو۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۶)

فہرست

دوسرا باب

پہلا دور

دوسرا دور

تیسرا دور

چوتھادور

پانچواں دور

چھٹادور

تیسرا باب

پہلا دور

دوسرا دور

تیسرا دور

چوتھا دور

پانچواں دور

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ضمیمہ (۱)

ضمیمہ (۲)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مقدمہ

عبید بن زُرارہ نے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اِحْتَفِظُوا بِكُتُبِكُمْ فَإِنَّكُمْ سَوْفَ تَحْتَاجُونَ إِلَيْهَا یعنی اپنی کتابوں کی حفاظت کرو کہ عنقریب تمھیں ان کی ضرورت پڑے گی۔[1]

''حدیث شناسی'' اور ''علوم حدیث سے آگہی'' اجتہاد نیز ''دینی حقائق کی پہچان میں مہارت'' کا نہایت موثر ذریعہ ہے لہٰذا اس علم کا سیکھنا اور اس میں مہارت پیدا کرنا تمام اسلامی علوم کے ماہرین کے لیے ضروری ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیتؑ کی جو احادیث و روایات ہم تک پہنچی ہیں اُن میں گوناگوں سیاسی اور سماجی عوامل کی وجہ سے تحریف ہوئی ہے لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود بہت سے ایسے دیانتدار راوی اور محدث گزرے ہیں جنھوں نے کٹھن حالات میں بھی احادیث کے قیمتی ذخیرے کو سینہ بہ سینہ اور صفحہ بہ صفحہ نقل کیا اور انھیں راہزنوں کی دست برد سے بچا کر بحفاظت ہم تک پہنچایا۔

ظاہر ہے کہ احادیث کے طومار میں سے صحیح احادیث کے استخراج اور کلامِ معصوم کے جوہر کی پہچان کے لیے ایسی چابیوں (اصول وقواعد) کی ضرورت ہے جن سے اس خزانے کے بند دروازوں کو کھولا جا سکے۔ انھی اصول وقواعد کو علوم حدیث میں بیان کیا جاتا ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اُكْتُبْ وَبُثَّ عِلْمَكَ فِي إِخْوَانِكَ فَإِنْ مِتَّ فَأَوْرِثْ كُتُبَكَ بَنِيكَ فَإِنَّهُ يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانُ هَرْجٍ لَا يَأْنَسُونَ فِيهِ إِلَّا بِكُتُبِهِمْ (علم کو) لکھو اور (اس ذریعے سے محفوظ کر لو)۔ اپنے علم کو اپنے بھائیوں میں عام کرو۔ اگر تم مر جاؤ تو اپنی اولاد کو اپنی کتابوں کا وارث بنا دو کیونکہ عنقریب لوگوں پر ایسا مشکل زمانہ آنے والا ہے جب وہ اپنی کتابوں کے سوا دوسری کتابوں کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔[2]

۱۔ ۲ کافی ج ۱، ص ۵۲

اسی لیے ''علوم حدیث'' میں تاریخ الحدیث، درایۃ الحدیث، رجال الحدیث اور فقہ الحدیث شامل ہیں اور اسی وجہ سے ''علوم حدیث'' کو حوزۂ علمیہ کے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ''علوم حدیث'' کے مقدمات کی پہچان کے لیے حجۃ الاسلام علی نصیری کی اس کاوش کو نصابی کتاب قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں علوم حدیث کی بہت سی خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔

امید ہے کہ طلباء و طالبات اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور یہ تمام حوزہ جات علمیہ کے وارث حضرت ولیٔ عصر (روحی و ارواح العالمین لہٗ الفداء) کی خوشنودی کا باعث بنے گی۔

دفتر انتشارات مرکز مدیریت حوزہ علمیہ قم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ مؤلف

''سنت'' قرآن کے بعد دین کی پہچان کا دوسرا منبع ہے کیونکہ سنت کلیات قرآن کی تفسیر بیان کرتی ہے۔ اگر حدیثِ رسولؐ اِنَّمَا الْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ آيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ کی بنیاد پر قرآنی تعلیمات کو تقسیم کیا جائے تو علم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) محکم آیات

(۲) عادلانہ واجبات

(۳) قائم ہونے والی سنت

یعنی ہم بنیادی طور پر علم کو ان تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) عقائد

(۲) اَخلاق

(۳) اَحکام[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سنت'' کی اہمیت اور عظمت ثابت ہے کیونکہ سنت میں مذکورہ تینوں اقسام کی تفصیل موجود ہے۔ سنت، قرآن کریم کے پہلو بہ پہلو شناختِ دین کے تمام مراحل میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت کو قرآن کا مثل قرار دیا تھا اور آپ اسے اپنے اوپر قرآن کے بعد خدا کی دوسری عنایت سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: اُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ مجھے خدا کی طرف سے قرآن اور اس جیسی (سنت) عطا کی گئی ہے۔[۲]

''سنت'' کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور

۱۔ کافی ج ۱، ص ۳۲
تفصیل کے لیے دیکھیے: ملا صدرا کی شرح اصول کافی ج ۲، ص ۳۷ اور التعلیقة علی کتاب الکافی ص ۶۶ ۔ ۶۷

۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۱۳۱ ۔ فتح القدیر ج ۲، ص ۱۱۸

ائمہ طاہرینؑ نے احادیث سیکھنے اور انھیں پھیلانے کی تاکید کی ہے۔ نیز عموم صحابہ و تابعین اور ائمہ طاہرینؑ کے شاگردوں نے احادیث جمع کرنے، لکھنے اور پھیلانے کی بھرپور کوششیں کیں باوجودیکہ — اہل سنت کی ''تاریخِ حدیث'' کے مطابق — ایک صدی تک حدیث جمع کرنے اور لکھنے پر پابندی تھی۔

جب تیسری صدی ہجری میں حدیث کی تدوین شروع ہوئی تو ''جوامع'' کی صورت میں ہزاروں روایات جمع کی گئیں جس کی وجہ سے راویانِ حدیث کی پہچان کے لیے ''علم رجال'' اور احادیث کی تقسیم بندی اور اصطلاحات کو بیان کرنے کے لیے ''علم درایۃ'' سامنے آیا۔ علاوہ ازیں ان موضوعات پر ہزاروں ضخیم کتابیں منظرعام پر آگئیں۔ اس وقت ہمارے پاس حدیث کے جوامع، مصطلح الحدیث کے منابع، علم رجال اور شرحِ حدیث کے جو خزانے موجود ہیں یہ حدیث کی تدوین و تشہیر کے لیے کی گئی کوششوں کا ثمر ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ ہم اس علم کی پہچان کا پھر سے جائزہ لیں، اس میں سوچ بچار کریں اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کی سعی کریں۔

اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ حدیث شناسی کے موضوع پر دو جلدوں میں لکھی گئی کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب میں علم حدیث کو حسب ذیل چار بنیادی اَقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

تاریخ الحدیث، درایۃ الحدیث یا مصطلحات الحدیث، رجال الحدیث اور فقہ الحدیث۔

چونکہ حدیث کی حجیت اور اس کی کچھ تعریفات کو جاننا بہت ضروری ہے، اس لیے کتاب کے پہلے باب میں ''کلیاتِ علم حدیث کی پہچان'' کے عنوان سے گفتگو کی گئی ہے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کی تاریخِ حدیث میں بہت زیادہ فرق ہے، اس لیے تاریخِ حدیث کو ہم نے ''اہل سنت کی تاریخِ حدیث'' اور ''اہل تشیع کی تاریخِ حدیث'' کے دو علاحدہ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور مباحث کتاب کے لیے چھ ابواب قائم کئے ہیں۔

اس کام کی توفیق ملنے پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور جن احباب نے اس کتاب کی اشاعت میں مجھ سے تعاون کیا ہے میں اُن کی دل سے قدر کرتے ہوئے اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ''علم حدیث'' کو وسعت دینے، اس میں سوچ بچار کرنے اور حدیث کے طلباء و طالبات کے علاوہ حدیث کا مطالعہ کرنے والے تمام احباب کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

قم المقدسہ / ۲۵ ربیع الاول / ۱۴۲۳ھ

علی نصیری

کلیاتِ علم حدیث کی پہچان

تعریفات اور اصطلاحات

اس کتاب کے اکثر مباحث میں حدیث، روایت اور سنت جیسی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اس لیے ابتدا میں ان اصطلاحات کی لغوی اور اصطلاحی تعریف بیان کرنا ضروری ہے۔
(چوتھے باب میں ان اصطلاحات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے)۔

حدیث

ہر نئی اور تر و تازہ چیز کو لغت میں ''حدیث'' کہا جاتا ہے[1] چنانچہ کم سن بچے کو لغت میں ''حدیث السن'' اور نوجوان کو ''شابٌ حدث'' کہتے ہیں۔[2]

حسب ذیل روایت میں لفظ ''حدث'' اسی معانی میں استعمال ہوا ہے:

إِنَّمَا قَلْبُ الْحَدَثِ كَالْأَرْضِ الْخَالِيَةِ مَا أُلْقِيَ فِيهَا مِنْ شَيْءٍ قَبِلَتْهُ کم سن بچے کا دل خالی زمین کی طرح ہوتا ہے، اس میں جو بیج بھی بویا جائے وہ اسے قبول کر لیتی ہے۔[3]

اسی وجہ سے تر و تازہ کھجور کو بھی ''حدیث'' کہتے ہیں۔[4]

لغت میں لفظ حدیث اپنے معنی کے عنصر (تر و تازگی) کو محفوظ رکھتے ہوئے دو اور معانی میں استعمال ہوتا ہے: بات اور واقعہ۔[5]

۱۔ کتاب العین ج ۳، ص ۱۱۷

۲۔ مفردات راغب ص ۱۱۰

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱

۴۔ مفردات راغب ص ۱۱۰

۵۔ المصباح المنیر ج ۱، ص ۱۲۴

بات کو بھی اسی لیے حدیث کہا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ صادر ہونے کی وجہ سے اس کا ہر لفظ اور حصہ پہلی بات سے زیادہ تر وتازہ ہوتا ہے۔[1]

درج ذیل آیات میں لفظ ''حدیث'' اسی معانی میں آیا ہے:

...وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا جب نبی نے اپنی ایک بیوی سے راز کی بات کہی۔ (سورۂ تحریم: آیت ۳)

...فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ان آدمیوں کو کیا ہوا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ (سورۂ نساء: آیت ۷۸)

(۲) فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام پیش کریں۔ (سورۂ طور: آیت ۳۴) یہاں ''حدیث'' سے مراد قرآن کریم ہے۔

(۳) أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ کیا یہی وہ بات جس پر تم اظہارِ تعجب کرتے ہو۔ (سورۂ نجم: آیت ۵۹)

قرآن کریم کو ''حدیث'' کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم جہاں کلامِ الٰہی ہے وہاں (ہر دور میں) تر وتازہ بھی ہے۔[2]

نئے واقعات کو بھی حدیث کہا جاتا ہے کیونکہ جب ان کا موازنہ پرانے واقعات سے کیا جاتا ہے تو وہ تر وتازہ دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے مشہور دنوں کو بھی اسی لیے ''حدیث'' کہا جاتا تھا۔[3]

خبر اور داستان کو بھی ''حدیث'' کہا جاتا ہے جیسا کہ حسب ذیل آیات میں بیان ہوا ہے:

(۱) هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ○ کیا تم تک غاشیہ کی خبر پہنچی ہے؟ (سورۂ غاشیہ: آیت ۱)[4]

(۲) ...فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ہم نے اُن کو بھولی بسری داستان بنا دیا۔ (سورۂ سبا: آیت ۱۹)

لفظ ''حدث'' اگرچہ احادیث میں بکثرت استعمال ہوا ہے مگر اپنے وسیع تر معانی کی وجہ سے

۱۔ مجمع البحرین ج ۱ ص ۳۷۱

۲۔ علم الحدیث و درایۃ الحدیث ص ۹

۳۔ فتوح البلدان ص ۳۹

۴۔ مفردات راغب ص ۱۱۰

اس کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ''حدیث'' کی چند تعریفات درج ذیل ہیں:

(۱) ابن حجر کہتے ہیں:

جو چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ہو اسے اصطلاحِ شرع میں حدیث کہا جاتا ہے۔[۱]

(۲) سیوطی نے علماء و محدثین سے حدیث کی یہ تعریف نقل کی ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے قول، فعل اور سکوت کو حدیث کہا جاتا ہے۔[۲]

(۳) مامقانی لکھتے ہیں:

علماء کے ایک گروہ کے مطابق اصطلاح میں معصوم کا قول، فعل اور سکوت حدیث ہے۔[۳]

(۴) محقق قمی کہتے ہیں:

معصوم کے قول، فعل اور سکوت کو حدیث کہا جاتا ہے۔[۴]

(۵) محمد ابو زھو لکھتے ہیں:

محدثین کی نظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال، سکوت، اَخلاقی فضائل، جسمانی شمائل سیرت، غزوات اور ماقبل بعثت کے واقعات مثلاً بت پرستی سے منہ موڑ کر غار حرا میں خدا کی عبادت کرنے کو حدیث کہا جاتا ہے۔[۵]

مذکورہ تعریفوں میں حسب ذیل بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) سنی عام طور پر صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل اور سکوت یا تقریر کو حدیث کہتے ہیں اور بعض اوقات اس میں صحابہ و تابعین کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں جبکہ شیعہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بجائے لفظ ''معصوم'' استعمال کرتے ہیں تاکہ آنحضرتؐ کے ساتھ ائمہ طاہرینؑ کے اقوال، افعال اور تقریرات بھی اس میں شامل ہو سکیں۔

(۲) کچھ تعریفوں میں معصوم کے قول و فعل کو حدیث کہا گیا ہے جبکہ کچھ دیگر تعریفوں میں ان کے بیان اور روایت کرنے کو حدیث کہا گیا ہے۔

۱۔ فتح الباری فی شرح صحیح البخاری ج ۱، ص ۱۷۳

۲۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۲۳

۳۔ مقباس الھدایہ ج ۱، ص ۵۷

۴۔ قوانین الاصول ص ۴۰۹

۵۔ الحدیث والمحدثون ص ۹ ـ ۱۹

راقم کی نظر میں حدیث کی جامع ترین تعریف یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا غیر قرآنی کلام، چودہ معصوم اور صحابہ وتابعین کا قول، فعل اور تقریر حدیث ہے۔

اس تعریف میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

(۱) ہم قول، فعل اور تقریر میں فرق کے قائل ہیں کیونکہ بنیادی طور پر قول کو ہی حدیث کہا جاتا ہے جبکہ فعل اور تقریر کے بیان کو بھی حدیث کہا جاتا ہے۔

(۲) حدیث کا دائرہ اللہ تعالیٰ کے غیر قرآنی کلام یعنی حدیث قدسی تک پھیلا ہوا ہے۔

(۳) صحابہ وتابعین کے اقوال کو اصطلاحی طور پر حدیث کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اصطلاحاتِ حدیث کے باب میں آپ پڑھیں گے کہ اقوال صحابہ کو ''حدیث موقوف'' اور اقوال تابعین کو ''حدیث مقطوع'' کہا جاتا ہے ہرچند کہ ان کے اقوال کی حجیت محل نظر ہے۔

سنت

حدیث کے ساتھ ساتھ ''سنت'' کی اصطلاح بھی بہت زیادہ رائج ہے۔ لغت میں روش اور طریقے کو سنت[۱] کہا جاتا ہے خواہ وہ طریقہ اچھا ہو یا برا۔

ابن منظور کہتے ہیں: **السنة: السيرة حسنة كانت او قبيحة...** یعنی سیرت اور روش کو سنت کہا جاتا ہے چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔[۲]

فقہاء اور محدثین کی اصطلاح میں سنت کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔[۳]

فقہاء کی نظر میں ہر وہ چیز سنت ہے جو رسول اکرم ﷺ سے منقول ہو مگر اس کا تعلق واجبات سے نہ ہو یعنی وہ مستحبات کا جزو ہو[۴] جبکہ محدثین کے ہاں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ وہ آنحضرتؐ کے قول، فعل اور تقریر کے علاوہ آپ کے شمائل و خصائل کو سنت قرار دیتے ہیں چاہے ان کا تعلق اعلانِ نبوت سے پہلے کے زمانے سے ہو یا بعد کے زمانے سے۔[۵]

۱۔ القاموس المحیط ج ۴، ص ۵۴۔ مختار الصحاح ص ۱۶۹

۲۔ لسان العرب ج ۱۳، ص ۲۲۵

۳۔ المختصر الوجیز فی علوم الحدیث ص ۱۵ ـ ۱۸

۴۔ المختصر الوجیز فی علوم الحدیث ص ۱۶۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۴۳۱

۵۔ علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۱۹

حدیث اور سنت میں فرق یہ ہے کہ معصومین علیہم السلام کی "بات" حدیث ہے جبکہ سنت میں اُن کے شمائل و خصائل اور طور اطوار شامل ہوتے ہیں اسی لیے سنت کا دائرہ، حدیث سے بڑا ہے۔[1]

(المختصر ہر حدیث، سنت میں شامل ہے مگر ہر سنت، حدیث میں شامل نہیں ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ ادلۂ استنباط میں قرآن کے بعد سنت کا نام لیا جاتا ہے، حدیث کا نہیں اور یہ کہ ساختہ پرداختہ روایات کی شناخت کے لیے حدیث کی طرف نہیں سنت کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاہم اس امر کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ آج معصوم کے فعل اور تقریر کو بیان کرنے اور اس بیان کی نسبت کو اعتبار بخشنے کے لیے لفظ حدیث بولا جاتا ہے۔

روایت

لغت میں روایت کا مطلب ہے نقل وحمل۔ اسی لیے پانی ڈھونے والے انسان اور جانور کو عربی میں "راویہ" کہا جاتا ہے۔[2]

آٹھ ذی الحجہ کے دن کو "یوم ترویہ" کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس دن حجاج عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ پانی بھر کرلے جاتے ہیں۔ گویا یوم ترویہ کے معنی ہیں "پانی بھرنے کا دن"۔[3]

اصطلاحی طور پر لفظ روایت، لفظ حدیث کے مترادف ہے البتہ یہ الگ بات ہے کہ لفظ حدیث کے مقابلے میں لفظ روایت کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

خبر

لغت میں ہر بیان کی جانے والی چھوٹی اور بڑی نیز اہم وغیر اہم بات کو "خبر" کہا جاتا ہے۔ "خبر" کا لفظ "نباء" کے لفظ سے عام ہے کیونکہ کسی بڑے واقعہ کی خبر کو "نباء" کہا جاتا ہے۔[4]

تاج العروس میں مرقوم ہے:

ان الخبر عرفا و لغعا ما ینقل عن الغیر و زاد فیه اهل العربیة و احتمل الصدق

۱۔ راقم کا نظریہ ڈاکٹر صبحی صالح کے برعکس ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ لفظ حدیث، سنت سے عام ہے اور سنت صرف رسول اکرمؐ کے افعال اور سیرت کے ساتھ مخصوص ہے۔ (علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۱۱۶)

۲ و ۳۔ الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ ج ۶، ص ۲۳۶۴۔ لسان العرب ج ۱۴، ص ۳۴۷

۴۔ لسان العرب ج ۴، ص ۲۲۶۔ مجمع البحرین ج ۳، ص ۲۸۱۔ النہایۃ فی غریب الاثر ج ۲، ص ۶

والکذب لذاتہ والمحدثون استعملوہ بمعنی الحدیث یعنی عرف اور لغت میں اُس بات کو "خبر" کہتے ہیں جو دوسرے سے نقل کی جائے۔ عرب زبان دانوں نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اس بات میں ذاتی طور پر سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ محدثین اسے حدیث کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔[1]

"مصباح المنیر" میں خبر کو علم و آگاہی کے معنی میں لیا گیا ہے۔[2]

"خبر" کے متعلق دو اصطلاحات رائج ہیں: منطقیوں کی اصطلاح اور محدثوں کی اصطلاح۔

(۱) منطقیوں کی اصطلاح میں "مرکب تام" کی دو بنیادی اقسام میں سے ایک کو "خبر" اور دوسری کو "انشاء" کہتے ہیں[3] وہ بات "خبر" ہے جو ذاتی طور پر کسی واقعہ کے "مطابق ہو" یا "مطابق نہ ہو"۔ اگر خبر مطابق واقعہ ہو تو صادق کہلائے گی اور اگر خلافِ واقعہ ہو تو کاذب کہلائے گی۔[4]

علم معانی و بیان میں بھی "خبر" کا یہی مطلب لیا جاتا ہے۔[5]

(۲) محدثوں کے ہاں حدیث کی اصطلاحی تعریف میں اختلاف ہے اور اس حوالے سے اُن کے درمیان مجموعی طور پر تین نظریات پائے جاتے ہیں:

(۱) عام محدثین خبر کو حدیث کا مترادف جانتے ہیں۔ وہ جو تعریف حدیث کی کرتے ہیں وہی تعریف "خبر" کی بھی کرتے ہیں۔[6]

(۲) بعض محدثین حدیث کو "خبر" سے عام قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی گفتگو کو "خبر" کہہ سکتے ہیں لیکن جو گفتگو صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل بیتؑ اور صحابہ میں منحصر ہو وہ حدیث ہے۔[7]

(۳) بعض محدثین، حدیث اور خبر کے مفہوم میں "فرق" کے قائل ہیں۔ وہ تاریخی

۱۔ تاج العروس ج ۳، ص ۱۶۶

۲۔ المصباح المنیر ج ۱، ص ۱۲۲

۳۔ المنطق ص ۵۲

۴۔ ایضاً ص ۵۳

۵۔ مجمع البحرین ج ۲، ص ۲۶۶۔ المختصر الوجیز فی علوم الحدیث ص ۱۹ - ۲۰۔ الرعایۃ فی علم الدرایۃ ص ۵۸

۶۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۴۲۔ مختصر مقباس الہدایہ ص ۱۱۔ علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۱۳۱

۷۔ المختصر الوجیز فی علوم الحدیث ص ۱۹۔ مختصر مقباس الہدایہ ص ۱۲

واقعات کو خبر کہتے ہیں چاہے ان کا تعلق گزشتہ امتوں سے ہو یا امت مسلمہ سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص تاریخی واقعات کی چھان پھٹک اور تحقیق کرتا ہے اسے ''اخباری'' کہا جاتا ہے جبکہ صرف معصومین اور صحابہ و تابعین سے نقل ہونے والے اقوال کو حدیث کہا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے سنت نبوی ﷺ پر تحقیق کرنے والے کو ''محدث'' کہتے ہیں۔[۱]

اس نظریے کی رو سے حدیث پر ''خبر'' کے لفظ کا اطلاق درست نہیں ہے۔

ان سب میں سے پہلا نظریہ درست ہے کیونکہ محدثین اور راویوں کی اصطلاح میں حدیث کا لفظ خبر کی جگہ اور اس کے برعکس استعمال ہوتا ہے اور اصطلاحی مفہوم سے مراد رائج اور متداول معنی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مورخین واقعات نگاری کو خبر نگاری کہتے ہیں (اخبار و جرائد میں جو شخص واقعات رپورٹ کرتا ہے اسے بھی خبر نگار کہا جاتا ہے) مگر یہ بات محدثین کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی کہ وہ ''خبر'' کو حدیث یا اس کے مترادف کے طور پر استعمال ہی نہ کریں۔

اثر

ایک اور لفظ ''اثر'' ہے جو اصطلاح میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لغت میں کسی چیز کے اپنے مقام پر رہنے کو ''اثر'' کہا جاتا ہے۔[۲]

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے: ...نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ جو کچھ لوگ آگے بھیجتے ہیں ہم اسے اُس کے آثار سمیت لکھتے جاتے ہیں۔ (سورۂ یٰسٓ: آیت ۱۲)

اسماعیل بن حماد جوہری لکھتے ہیں: اثرت الحدیث اذا ذکرته غیرك و منه قیل حدیث مأثور ای ینقله خلف عن سلف جب آپ کسی کے متعلق بات کرتے ہیں تو اسے عربی میں ''اثرت الحدیث'' کہا جاتا ہے۔ ''حدیث مأثور'' اسی سے ہے یعنی جسے بعد والی نسلیں اپنے پرکھوں سے نقل کرتی ہیں۔[۳] لفظ ''اثر'' کی اصطلاح کے متعلق دو نظریات پائے جاتے ہیں:

(۱) لفظ ''اثر'' حدیث کا مترادف ہے اسی لیے محدث کو ''اثری'' بھی کہا جاتا ہے۔[۴]

۱۔ تاج العروس ج ۱۰، ص ۱۳

۲۔ الصحاح تاج اللغہ وصحاح العربیہ ج ۲، ص ۵۷۵۔ تاج العروس ج ۳، ص ۵

۳۔ الصحاح تاج اللغہ وصحاح العربیہ ج ۲، ص ۵۷۵

۴۔ الرعایۃ فی علم [illegible]

(۲) ایسی احادیث کو جو صحابہ سے منقول ہوں (موقوف) یا جو تابعین سے منقول ہوں (مقطوع) اثر کہا جاتا ہے جبکہ حدیث کا لفظ صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے لیے مخصوص ہے۔[۱]

دوسرا نظریہ ناقابل دفاع ہے کیونکہ لفظ "اثر" کے متعلق اس نظریے کے اثبات کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں جبکہ علم الحدیث کے محققین جانتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کے لیے لفظ "اثر" کے علاوہ روایت اور حدیث کی اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔[۲]

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

"حدیث، روایت، خبر اور اثر" چاروں اصطلاحات ایک دوسرے کی مترادف ہیں اگرچہ محدثین کے ہاں "خبر اور اثر" کی بجائے "حدیث اور روایت" کے الفاظ زیادہ رائج ہیں اور "سنت" کی اصطلاح ان چاروں اصطلاحات سے الگ استعمال ہوتی ہے۔

حدیث قدسی

ذخیرۂ احادیث میں ہمیں کچھ ایسی روایات ملتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی زبان سے نقل ہوئی ہیں۔ "سلسلۃ الذہب" کی مشہور حدیث اس کا واضح نمونہ ہے جسے امام علی رضاؑ نے اپنے آبائے طاہرینؑ کی سند سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور انھوں نے جبریل امینؑ سے اور جبریل امینؑ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِي فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اَمِنَ مِنْ عَذَابِيْ کلمہ (لا الہ الا اللہ) میرا قلعہ ہے، جو میرے قلعے میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔[۳]

ایسی حدیث کو اصطلاحی طور پر "حدیث قدسی" کہا جاتا ہے۔ مذکورہ اصطلاحات کی رو سے حدیث قدسی کا حدیث، سنت اور روایت سے فرق پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کیونکہ یہ اصطلاحات معصوم کے قول، فعل اور سکوت سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ حدیث قدسی کا اطلاق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام پر ہوتا ہے۔

۱۔ علوم الحدیث ومصطلحہ ص ۱۲۲۔ اصول الحدیث، علومہ ومصطلحہ ص ۲۸

۲۔ دیکھیے: مناقب امیرالمومنین ج ۱، ص ۱۳۲ اور ۲۶۶۔ الآحاد والمثانی ج ۱، ص ۳۶۔ تنویر الحوالک ص ۱۳۷۔ فتح الباری ج ۶، ص ۳۵۵۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸۲

۳۔ الجواہر السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ ص ۱۷۵

قرآن مجید اور حدیث قدسی میں عام طور پر یہ فرق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جبکہ حدیث قدسی کے معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہیں۔[۱]

بعض حضرات یہ مانتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث قدسی میں یہ فرق ہے کہ حدیث قدسی کا مفہوم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خواب میں یا الہام کی صورت میں نازل ہوتا تھا جبکہ قرآن مجید کی آیات بیداری کی حالت میں براہ راست یا فرشتے کے توسط سے نازل ہوتی تھیں۔[۲]

قرآن مجید اور حدیث قدسی میں اور بھی کئی فرق بیان کئے گئے ہیں۔[۳]

یوں لگتا ہے کہ مذکورہ فرق نامکمل ہیں کیونکہ اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم حدیث قدسی کے الفاظ کی اللہ سے نسبت کی نفی کریں جبکہ حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ قال اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قال اللہ تعالیٰ فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

ممکن ہے کہ حدیث قدسی کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی کے الفاظ و معانی کو معجزہ قرار نہیں دیا اور کسی سے اس کی نظیر پیش کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جبکہ قرآن مجید کو معجزہ قرار دے کر کافروں کو اس کی مثل لانے کا چیلنج دیا ہے۔[۴]

اس وضاحت کے بعد حدیث قدسی کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

”یہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو بطور معجزہ نہیں اتارا گیا اور مخالفین کو اس جیسا کلام پیش کرنے کا چیلنج کئے بغیر یہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے نقل ہوا ہے۔“

جناب شیخ حر عاملی نے حدیث قدسی کو ”الجواہر السنیہ فی الاحادیث القدسیہ“ کے نام سے کتابی صورت میں جمع کیا ہے۔

۱۔ درایۃ الحدیث ص ۱۳۔ معجم لغۃ الفقہاء ص ۱۷۷۔ فیض القدیر ج ۴، ص ۶۱۵

۲۔ الرواشح السماویہ ص ۲۰۵۔ فیض القدیر ج ۴، ص ۶۱۵

۳۔ درایۃ الحدیث ص ۱۳ ۔ ۱۴

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: قوانین الاصول ص ۴۰۹۔ دراسات فی علم الدرایہ ص ۱۳۔ معجم الفاظ الفقہ الجعفری ص ۱۵۵۔ اصطلاحات الاصول ص ۱۴۱۔ علم حدیث ص ۲۳

سنت کی حجیت

علمائے شیعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے قول، فعل اور تقریر کو سنت سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی حجیت کو ثابت کرنے کے لیے علاحدہ علاحدہ استدلال کی ضرورت ہے۔ بحث کی ابتدا میں ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے حجت ہونے پر دلائل پیش کریں گے، اس کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام کی سنت کی حجیت پر بحث کریں گے۔

سنتِ رسولؐ حجت ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو عقلی اور نقلی دونوں طرح کی دلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ عقلی دلیل کے لیے رسالت و نبوت کے فلسفے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور نقلی دلیل کو قرآن کریم، اجماع اور مسلمانوں کی عملی سیرت میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

عقلی دلیل

فلسفہ اور کلام کے اصولوں کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کرنے سماجی عدل برپا کرنے اور لوگوں کے درمیان فکری و سماجی اختلافات کو ختم کرنے کے لیے برگزیدہ انسانوں کو نبی بنا کر مبعوث کیا۔ نبیوں کا مبعوث کرنا قاعدۂ لطف کا عملی نمونہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعے سے لوگوں پر اپنی حجت تمام کی ہے۔[۱]

اور اس بھاری ذمے داری کو نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ انبیاء ہر طرح کی لغزش اور خطا سے پاک ہوں، اُن کی کتابِ زندگی کا ہر صفحہ خوبیوں سے آراستہ ہو۔ وہ حق نما اور ارادۂ الٰہی کو اس طرح منعکس کرنے والے ہوں کہ لوگ اُن سے صراط مستقیم کی ہدایت حاصل کر سکیں اور اُن کے ذریعے دنیا میں شریعت نافذ ہو، اجتماعی عدل کا الٰہی نظام قائم ہو اور لوگوں کے درمیان اختلافات کا خاتمہ ہو۔[۲] اگر خدانخواستہ نبوت کے دعویدار کا دامن گناہوں سے آلودہ ہو اور وہ شیطانی وسوسوں کی پیروی کرتا ہو اور الٰہی تقاضوں کی بجائے خواہشات نفسانی پر عمل پیرا ہو تو ایسے انسان سے کیونکر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف المراد ص ۳۴۸۔ الشفاء ص ۴۴۱۔ ۴۴۳

۲۔ عصمت انبیاءؑ کے مزید دلائل کے لیے دیکھیے: کشف المراد ص ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ الالٰہیات ج ۲، ص ۱۴۴۔ ۱۸۸

لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے گا؟!

اسی دلیل کے ذریعے متکلمین نے آغاز سے ہی عصمت انبیاء کو ثابت کیا ہے۔ اگر قرآن کریم کی کچھ آیات ظاہراً اُن کی عصمت کے خلاف دکھائی دیتی ہیں تو مفسرین نے ان کی مناسب تاویل کی ہے۔

پس بعثتِ انبیاء کا فلسفہ عصمت انبیاء کو ضروری قرار دیتا ہے۔ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ اپنے قول و فعل اور سوچ میں لغزشوں سے پاک ہوتے ہیں اور اُن کی پوری زندگی کا محور اللہ کی رضا جوئی ہوتا ہے اور سنت کی حجیت سے مراد ہے کہ انبیاء اپنے قول و فعل اور سوچ کے لحاظ سے ارادۂ الٰہی کے مظہر ہوتے ہیں اسی لیے اُن کی پیروی کرنا ہم پر واجب ہے۔ جہاں ہم تمام انبیائے کرام کی عصمت کے قائل ہیں وہاں حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی عصمت کے بدرجہ اولیٰ قائل ہیں کیونکہ آپ انسانِ کامل اور قربِ الٰہی کی بلند ترین منزل پر فائز تھے۔ آپ اللہ کے اسماء و صفات کا آئینہ تھے اور آپ کی ذات میں ارادۂ الٰہی کی جھلک کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آپ کا قول و فعل اور سوچ نیز آپ کا معنوی مقام حق و صداقت کا بے داغ آئینہ تھا۔

نقلی دلائل

سنت کی حجیت قرآن کریم، اِجماع اور مسلمانوں کی سیرت کو شامل ہے۔ ذیل میں ہم اس کے کچھ دلائل پیش کرتے ہیں:

قرآن کریم

قرآن کریم کی بہت سی آیات سنت رسولؐ کو معتبر قرار دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں آنحضرتؐ کے متعلق دیئے گئے احکام کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) نبی کا فیصلہ حجت ہے

جیسا کہ فلسفۂ نبوت و رسالت کے ضمن میں اوپر بیان ہوا ہے کہ انبیاء کی ایک ذمے داری لوگوں کے درمیان اختلافات اور تنازعات کا فیصلہ کرنا بھی ہے۔ قرآن کریم اس سلسلے میں فرماتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر اللہ نے نبیوں کو خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور اُن کے ساتھ برحق کتابیں اتاریں تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اُن امور کا فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۱۳)

ظاہر ہے کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنا آنحضرتؐ کی ذمے داری بھی تھی لیکن یہ فلسفہ اس وقت اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے جب آپ کا فیصلہ لوگوں کے لیے حجت ہو۔ اسی لیے قرآن کریم نے آپ کے فیصلے کے حجت اور قابلِ نفاذ ہونے پر زور دیا ہے۔

جب مومنین کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہتے ہوئے دل و جان سے اُن کے فیصلے کو قبول کرتے ہیں۔ ایسے مومنین کی تعریف کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ جب مومنوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔
(سورۂ نور: آیت ۵۱)

دوسری جگہ قرآن کریم نے مومنین کو خبردار کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے بعد کسی کو اس فیصلے پر تنقید کرنے یا اسے بدلنے کا اختیار نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ کسی مومن اور مومنہ کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کردیں تو انھیں بھی اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۶)

قرآن کریم نے ایک اور جگہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایمان کی تین شرائط بیان کی ہیں:

(۱) مومن وہ ہیں جو اپنے تمام اختلافات کا فیصلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرائیں۔
(۲) آپ جو فیصلہ کردیں اُس سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی محسوس نہ کریں۔
(۳) آپ کے فیصلے کے سامنے سراپا تسلیم ہوجائیں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (اے رسولؐ!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اُس وقت تک مومن

نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں۔ پھر آپ کے فیصلے پر دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے بخوشی تسلیم کر لیں۔ (سورۂ نساء: آیت ٦۵) کیا بلا شرط تسلیم ہو جانے کا تعلق رسول اکرم ﷺ کے فیصلے سے — جو سنت کا ایک حصہ ہے — نہیں ہے؟

اجماع

(۲) اطاعتِ رسولؐ، اطاعتِ الٰہی ہے

قرآن کریم کی کچھ آیات میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے برابر قرار دیا گیا ہے جیسا کہ فرمان اقدس الٰہی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔ (سورۂ نساء: آیت ۸۰)

بعض آیات میں اطاعت الٰہی کے بعد اطاعت رسولؐ کا واضح حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ (سورۂ نساء: آیت ۵۹)

اسی طرح کچھ آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کو اللہ کی مخالفت کہا گیا ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

... وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی کا شکار ہو گیا۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳٦)

قرآن کریم میں رسول اکرم ﷺ پر سبقت کو خدا پر سبقت کے برابر بتایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھ جانے کی کوشش نہ کرو۔ (سورۂ حجرات: آیت ۱)

یہاں پر قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی علی الاطلاق اطاعت کا حکم دیا ہے اور غیر مشروط طور پر اُس کی نافرمانی سے روکا ہے۔ جس طرح سے اللہ نے بغیر کسی شرط و قید کے اپنی

اطاعت مطلقہ کا حکم دیا ہے اسی طرح اپنے رسول کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا ہے۔ اس غیر مشروط اطاعت کے حکم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ ہر حوالے سے معصوم ہیں اور آپ کا ہر قول اور فعل اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (ہمارا رسول) اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتا۔ وہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۳۔ ۴)

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنی خواہش سے بولنے کی نفی کی گئی ہے۔

حتیٰ کہ اللہ نے اتباع رسولؐ کو اپنی حجیت کی شرط قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ اللہ تم سے محبت رکھے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۳۱)

بادی النظر میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ "اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو اللہ کی پیروی کرو" کیونکہ سچی دوستی، پیروی کا دوسرا نام ہے مگر ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو یا اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میرے رسول کی پیروی کرو۔ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ یہ آیت اس بات پر بہترین گواہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کی پیروی کو عین اپنی پیروی قرار دیا ہے اور یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو سیدھا راستہ بتاتے ہیں اور وہی اللہ کا راستہ ہے جیسا کہ ارشاد اقدس الٰہی ہے:

...اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ صِرَاطِ اللّٰهِ ... بے شک آپ بخوبی سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں جو خدا کا راستہ ہے۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۵۲۔ ۵۳)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسوۂ حسنہ ہیں

قابل تقلید اخلاقی نمونہ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں کسی خطا اور لغزش کا گزر نہ ہو اور وہ استقامت اور سچائی کی منزل معراج پر فائز ہو۔ لوگوں میں خرابی دور کرنے کے لیے اس کی ذات میزان کا درجہ رکھتی ہو اور اسے دیکھ کر انسانِ کامل کا سراپا ذہن میں آتا ہو۔ وہ لوگوں کو انسانی کمال کی حد تک پہنچانے اور اپنی اس میزان کے قریب لانے کے لیے کھڑا ہو اور اُن کو اپنے نزدیک لائے۔ چنانچہ انہی مقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بہترین نمونۂ عمل یعنی اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد اقدس الٰہی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ○ یقیناً اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۲۱)

آنحضرتؐ کو تمام انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات انسانِ کامل کی مکمل آئینہ دار ہے اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو پوری انسانیت کے لیے درسِ زندگی ہے۔ دل چسپ پہلو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا استثنا اور بغیر کسی شرط وقید کے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے جبکہ حضرت ابراہیمؑ کو اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دینے کے بعد اس امر کا استثنا کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے چچا آذر کے لیے جو استغفار کیا تھا وہ اسوہ نہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ... إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے... مگر حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ (چچا) سے یہ کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ میں آپ کے لیے ضرور مغفرت طلب کروں گا کیونکہ قرآن نے دوسری جگہ مومنین کو مشرکین کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع کیا ہے۔[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس حضرت ابراہیمؑ سے بھی بڑھ کر نمونۂ عمل ہے اس لیے ضروری ہے آپ کی مکمل پیروی کی جائے۔ اس طرح بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی ہر بات اور زندگی کا ہر عمل اہمیت اور حجیت کے لحاظ سے ''سنت'' ہے۔

(۴) تمام تعلیماتِ رسولؐ سے وابستگی ضروری ہے

سنت کے حجت ہونے پر دلالت کرنے والی مذکورہ بالا آیات سے اگر اغماض کر لیا جائے تب بھی سنت نبوی کے حجت ہونے پر سب سے بڑی دلیل یہ آیت ہے:

...مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

۱۔ سورۂ توبہ کی چودھویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے آذر کے لیے بخشش طلب کی تھی مگر جب انھوں نے دیکھ لیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اُس سے لاتعلقی اختیار کر لی۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر صافی ج ۵، ص ۱۶۲ اور تفسیر تبیان ج ۹، ص ۵۸۰

جو کچھ رسول تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اُس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (سورۂ حشر: آیت ۷)

یہ آیت مختلف حوالوں سے سنت کے حجت ہونے لی دلیل ہے:

(۱) مَآ اٰتٰىكُم کا جملہ اپنی عمومیت کے لحاظ سے ہر اُس قول وفعل کو شامل کرتا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوجائے چاہے وہ برتاؤ ہو، تقریر ہو یا تحریر ہو۔

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر حکم پر عمل کرنے کے ساتھ آپ کی منع کردہ تمام چیزوں سے پرہیز کی تاکید کی گئی ہے یعنی آپ کے احکامات پر عمل کرنے اور منع کردہ چیزوں سے رکنے کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔

(۳) آیت میں لفظ رسول کا استعمال **تعلیق الحکم بالوصف مشعر بعلیته** کے قاعدے کے تحت کیا گیا ہے یعنی جب حکم کسی صفت کے ساتھ مذکور ہو تو وہ اُس کی علیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں لفظ رسول کا اشارہ بتاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اطاعت اس لیے کی جائے کہ وہ منصب رسالت پر فائز ہیں اور اُن کے ہر قول وفعل کی نسبت خدا کی طرف ہے۔

(۴) آخر میں تقویٰ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا سخت عذاب دینے والا ہے یعنی سنت سے وابستگی تقویٰ کا لازمہ ہے اور سنت سے انحراف عذاب الٰہی کا موجب ہے۔

اِجماع

اجماع کے مفہوم اور اُس کی حجیت کے معیار پر شیعہ اور سنی علماء کے درمیان شدید اختلاف ہے سنی علماء اجماع کو اصالتاً حجت سمجھتے ہیں[۱] جبکہ شیعہ علماء معصوم کی رائے کا کاشف ہونے کی بنا پر اجماع کو حجت سمجھتے ہیں[۲] البتہ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ سارے مسلمان اور سب اسلامی فرقوں کے علماء اپنے مسلکی اختلافات اور گوناگوں آراء کے باوجود کسی معاملے پر متفق الرائے ہوں تو ایسا اجماع قطعی طور پر حجت ہے۔ مثال کے طور پر تمام مسلمان اصلِ توحید اور نماز کے وجوب پر متفق ہیں۔ اُن کا اتفاق ان

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: الاحکام ج ۳، ص ۵۵۳۔ ۵۶۳۔ المستصفیٰ ج ۱، ص ۲۰۳

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: فرائد الاصول ج ۱، ص ۷۵۔ ۱۰۱۔ کفایۃ الاصول ج ۲، ص ۶۸۔ ۷۷

مسائل کے قطعی ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح کا اجماع معصومین کی روایات میں بھی معتبر جانا گیا ہے۔ اس کی مثال امام علی رضاؑ اور ابو قرہ کے درمیان مکالمہ ہے۔ ابو قرہ نے رؤیتِ باری کے متعلق اپنے بزرگوں کی روایت بیان کی تو امام نے اسے نہیں مانا کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی جسمانی رؤیت سے انکار کیا تھا۔ ابو قرہ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا آپ ان روایات کو جھٹلاتے ہیں؟ امام نے فرمایا: اِذَا کَانَتِ الرِّوَایَاتُ مُخَالِفَةً لِلْقُرْآنِ کَذَّبْتُهَا وَ مَا اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَیْهِ جب روایات قرآن اور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہوں تو میں ان کو جھٹلاؤں گا (یعنی میں انھیں حدیثِ رسولؐ نہیں مانوں گا)۔[1]

یہ عالمِ اسلام کی خوش نصیبی ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کے علماء اپنے مسلکی اختلافات کے باوجود سنت کو دین میں حجت مانتے ہیں اور اسے قرآن کے بعد دین کی شناخت کا دوسرا منبع قرار دیتے ہیں۔

سیرت مسلمین

تمام مسلمان علماء کے ہاں سنت حجت ہے۔ مسلمان آغازِ اسلام سے لے کر آج تک سنت کو دین کا مصدر قرار دیتے آئے ہیں اور ہر وقت اس کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں۔ صحابۂ کرام نے آنحضرتؐ سے سنا: صَلُّوا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِی اُصَلِّی ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔[2] اسی طرح انھوں نے آنحضرتؐ سے یہ بھی سنا: خُذُوْا عَنِّی مَنَاسِکَکُمْ اپنے مناسک مجھ سے لو۔[3] چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے ان فرامین پر عمل کیا اور نماز اور حج کے مناسک آپ کے طریقے کے مطابق ادا کیے۔ نیز عقائد، اَخلاق یا احکام کے متعلق جب بھی انھیں کوئی مشکل پیش آئی تو انھوں نے سنت رسولؐ میں ہی اس کا حل تلاش کیا کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کو اپنے لیے حجت مطلقہ اور آخری فیصلہ سمجھتے تھے۔

رحلت رسولؐ کے بعد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سنتِ رسولؐ کی پیروی کرتے تھے اور اسے اپنے لیے مشعل راہ قرار دیتے تھے۔ جب فقہی اور کلامی مسالک سامنے آئے تو ہر مسلک نے اپنے عقائد

۱۔ کافی ج ۱، ص ۹۶

۲۔ بحار الانوار ج ۸۲، ص ۲۷۹۔ السنن الکبریٰ ج ۲، ص ۳۴۵

۳۔ فتح الباری ج ۱، ص ۱۹۳۔ فیض القدیر ج ۱، ص ۱۰۰

کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے سنت رسولؐ میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پھر تدوین حدیث کا دَور آیا تو حدیث کے ہزاروں چھوٹے بڑے مجموعے منظرِ عام پر آئے اور اُن میں بھی سنتِ رسولؐ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ الغرض مسلمان علماء و مفکرین کی عملی سیرت بتاتی ہے کہ انھوں نے مختلف اسلامی علوم جیسے تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، اَخلاق، عرفان اور تاریخ وغیرہ میں سنت رسولؐ کی پیروی کی اور قدرتی طور پر اسے معتبر جانا۔

سنتِ ائمہ کی حجیت

ائمہ اہل بیتؑ سے منقول سنت کی حجیت کو ثابت کرنے کے لیے ہم ایک عقلی اور ایک نقلی دلیل پیش کرتے ہیں:

عقلی دلیل

"فلسفۂ رسالت" جس طرح سنت رسولؐ کی حجیت کو ثابت کرتا ہے اسی طرح یہ فلسفہ سنتِ ائمہ کی حجیت کو بھی ثابت کرتا ہے۔ شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق امام، رسول کا جانشین ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ امت کی ہدایت کے علاوہ عادلانہ سماجی نظام قائم کرنے، اسلامی حکومت تشکیل دینے اور لوگوں کے باہمی اختلافات دور کرنے میں بھی رسول کا نائب ہوتا ہے۔[1]

مذکورہ بالا ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے رسول کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تاکہ اُس کا ہر قول و فعل قدرتی طور پر لوگوں کے لیے نمونہ اور حجت قرار پائے اور امام چونکہ نائبِ رسول ہوتا ہے اس لیے اسے بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہیے تاکہ اُس کا ہر قول و فعل بھی قدرتی طور پر نمونہ اور حجت قرار پائے۔ امام اور نبی میں صرف یہ فرق ہے کہ امام، مقامِ نبوت کا حامل نہیں ہوتا اور اُس پر وحی نازل نہیں ہوتی۔[2]

یہ حقیقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے بہت خوب صورت طریقے سے واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ

۱۔ دیکھیے: کافی، کتاب الحجۃ، ابواب معرفۃ الامام والرد الیہ۔ فرض طاعۃ الائمۃ، ان الائمۃ ولاۃ امر اللہ وخزنۃ علمہ

۲۔ دیکھیے: کشف المراد ص ۳۶۴

تم کو مجھ سے وہی تعلق ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھا مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔[۱] لہٰذا قولِ رسولؐ کے مطابق امامِ معصوم کے افکار نیز کردار، گفتار، تقریر اور تحریر وغیرہ حجت ہیں اور امامِ معصوم کا ہر قول وفعل ہر طرح کی غلطی سے پاک اور منشائے پروردگار کے عین مطابق ہوتا ہے۔

نقلی دلائل

قرآن وسنت سے ائمہ اہل بیتؑ کی سنت کا حجت ہونا ثابت ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

قرآن کریم

آیۂ ولایت إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ ... (سورۂ مائدہ: آیت ۵۵) اور آیۂ ابلاغ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷) حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ معصومینؑ کی امامت پر دلیل ہیں۔ سابقہ عقلی دلیل اور ضرورتِ معصوم کے فلسفے سے سنت ائمہ کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔ کچھ آیات میں ان کی اطاعت کو اطاعتِ رسولؐ کے برابر قرار دیا گیا ہے اور اُن کی پیروی کی تاکید کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو نیز رسول کی اور جو تم میں سے صاحبان امر ہیں، اُن کی اطاعت کرو۔ (سورۂ نساء: آیت ۵۹)

بہت سی روایات اور شیعہ مفسرین کے مطابق ''اولی الامر'' سے مراد ائمہ اہل بیتؑ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے اطاعتِ رسولؐ کے بعد ''اولی الامر'' کی اطاعت کا بلا فاصلہ حکم دیا ہے اور لفظ رسول کے بعد اولی الامر کے لیے لفظ أَطِيعُوا کی تکرار بھی نہیں فرمائی ہے بلکہ اولی الامر کو لفظ رسول پر عطف کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت، عین رسول اللہ کی اطاعت ہے۔[۲] اگر اولی الامر سے ائمہ معصومینؑ کے علاوہ کوئی اور مراد ہوتا — سنی مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے علماء، حکمران اور فوجی سربراہان مراد ہیں —[۳] تو نبی کی طرح اُن کی غیر مشروط اطاعت کا حکم قرآنی منطق کے منافی ہے کیونکہ یہ لوگ دانستہ یا نادانستہ گناہ اور غلطیاں کرتے ہیں اور یہ بات طے ہے کہ قرآن

۱۔ کافی ج ۸، ص ۱۰۷۔ معانی الاخبار ص ۷۴

۲۔ تفسیر تبیان ج ۳، ص ۲۳۶۔ تفسیر مجمع البیان ج ۳، ص ۱۱۴۔ تفسیر المیزان ج ۴، ص ۳۹۱۔ ۳۹۳

۳۔ تفسیر جامع البیان ج ۵، ص ۲۰۲۔ الجامع لاحکام القرآن الکریم ج ۵، ص ۲۵۹۔ ۲۶۰

سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یہ کبھی ظالموں کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا۔[۱] امام جعفر صادقؑ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اوصیاء کی اطاعت کو واجب بتایا ہے۔[۲]

آپ نے سنت ائمہ کی حجیت کے لیے ... لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۳) کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن گواہی دیں گے کہ ائمہ نے اللہ کی طرف سے لوگوں پر عائد فرائض کی تبلیغ کی اور یہ کہ ائمہ لوگوں پر بھی گواہ ہوں گے۔[۳]

اہل بیتؑ کی عصمت پر ایک دلیل آیت تطہیر بھی ہے۔ تمام شیعہ اور بیشتر انصاف پسند سنی علماء مانتے ہیں کہ یہ آیت اہل بیتؑ کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور یہ ائمہ اہل بیتؑ کے پیدائشی معصوم ہونے پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کا لازمہ ہے کہ اُن کے تمام اقوال اور افعال قدرتی طور پر حجت ہیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝ اے اہل بیت! اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ وہ تم کو ہر طرح کی پلیدی سے دور رکھے اور تم کو ایسا پاک رکھے جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)[۴]

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادۂ تکوینی کے ذریعے اہل بیتؑ کو پاک بنایا ہے اور اُن کو ہر طرح کی پلیدی سے دور رکھ کر اُن کی عصمت کو بتایا ہے۔

اس آیت میں اللہ کے ارادۂ تکوینی — جو کہ حصر (انما) کی صورت میں بیان ہوا ہے — سے اہل بیتؑ کی عصمت پر دلالت، اُن کی ہر پلیدی سے دُوری اور اُن کی پاکیزگی پر تاکید مزید، اہل فکر و نظر پر واضح ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اُن کی سنت کی حجیت اور بنیاد عصمت کے ثابت ہونے پر ہے جو کہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔[۵]

۱۔ تفسیر المیزان ج ۴، ص ۳۹۴ ۔ ۴۰۰

۲۔ کافی ج ۱، ص ۱۸۷

۳۔ کافی ج ۱، ص ۱۹۰

۴۔ کافی ج ۱، ص ۲۸۶

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر المیزان ج ۱۶، ص ۳۰۹ ۔ ۳۱۳ اور تفسیر مجمع البیان ج ۸، ص ۱۵۶ ۔ ۱۵۸

سنتِ رسولؐ

سنت رسولؐ کی حجیت کے اثبات کے لیے ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے ''دور'' لازم آتا ہے البتہ سنتِ ائمہؑ کی حجیت کو ثابت کرنے کے لیے سنتِ رسولؐ سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ سنت رسولؐ کی حجیت عقل اور قرآن دونوں سے ثابت ہے۔ سنتِ رسولؐ میں دو طریقوں سے سنتِ ائمہؑ کی حجیت بیان کی گئی ہے، ایک مرتبہ بطور خاص حضرت علیؑ کی عصمت اور پھر دیگر ائمہ معصومینؑ کی سنت کی حجیت۔

احادیث رسولؐ میں جو کچھ حضرت علیؑ کے لیے کہا گیا ہے وہ اگرچہ ظاہری طور پر آپ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن ''معیار'' کے لحاظ سے اس کا اطلاق باقی ائمہ پر بھی ہوتا ہے مثلاً ''حدیث منزلت'' جو منطوق کے لحاظ سے حضرت علیؑ کی شان میں ہے اور انھیں مثیل ہارونؑ قرار دیتی ہے لیکن ''معیار'' کے اعتبار سے یہ حدیث باقی ائمہ معصومینؑ کو بھی شامل کرتی ہے۔[1]

اسی طرح آنحضرتؐ سے بہت سی احادیث منقول ہیں جن میں باقی ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور بیان کردہ عقلی دلیل بھی ائمہ کی سنت کو حجت قرار دیتی ہے۔[2]

ان روایات کے ساتھ ''حدیث ثقلین'' ہمارے دعوے پر بہترین دلیل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں یہ ارشاد فرمایا تھا: **إنی تارك فیکم الثقلین ما إن تمسکتم بهما لن**

۱۔ کافی ج ۸، ص ۱۰۵۔ معانی الاخبار ص ۷۴

۲۔ اسی مضمون کی یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں:

عن جابر بن سمرة قال: سمعت النبی یقول: لا یزال الاسلام عزیزاً الی اثنی عشر خلیفة، ثم قال کلمة لم افهمها فقلت لابی ما قال؟ فقال: کلهم من قریش۔ جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: اسلام بارہ خلفاء تک سرفراز رہے گا۔ پھر آنحضرتؐ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ آنحضرتؐ نے کیا فرمایا؟ میرے باپ نے بتایا کہ آنحضرتؐ فرمارہے تھے کہ وہ سب قریش سے ہوں گے۔

یہ حدیث اہل سنت کے بہت سے منابع حدیث میں موجود ہے اور ہر انصاف پسند محقق دیکھ سکتا ہے کہ یہ حدیث ائمہ اثنا عشر کے علاوہ اور کسی پر چسپاں نہیں ہوتی۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری ج ۸، ص ۱۲۷۔ صحیح مسلم ج ۶، ص ۳۰۳۔ مسلم نیشاپوری نے چھ مختلف طرق سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵، ص ۸۷ ـ ۱۰۸۔ امام احمد نے بھی مختلف طرق سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

علمائے اہل سنت کی تشریح کے لیے دیکھیے: فتح الباری ج ۱۳، ص ۱۸۱ ـ ۱۸۶۔ شرح مسلم ج ۱۲، ص ۲۰۱ ـ ۲۰۳

تضلوا کتاب اللہ و عترتی أھل بیتی و انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض... میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت میرے اہل بیت اور وہ ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں۔[۱]

شیعہ محدثین کی طرح سنی محدثین نے بھی اس حدیث کو مذکورہ صورت میں نقل کیا ہے۔[۲]

''حدیث'' حیاتِ رسولؐ میں

مفہوم ''حدیث'' کے عناصر پر جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر سے عبارت ہے غور کرنے سے قدرتی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حدیث کا آغاز اعلانِ نبوت کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں دشوار حالات اور مشرکین کی طرف سے پابندیوں کی وجہ سے حدیث کی حفاظت اور کتابت کے بارے میں معلومات کم ہی ملتی ہیں کیونکہ اُن دنوں مسلمانوں کی تمام تر توجہ اصل رسالت نیز اسلامی اصولوں کی پہچان اور مشرکین کی اذیتوں سے بچنے پر مرکوز تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ ہجرت اور یہاں اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد مسلمانوں کو قرآن کے ساتھ حدیث پر بھی بھرپور توجہ دینے کے لیے سازگار ماحول میسر آیا چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف سے حدیث کی کتابت اور اشاعت کا اہتمام اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس تاریخی دور کی اہمیت علمی حوالے سے بہت زیادہ ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حدیث کے متعلق بہت زیادہ بے توجہی برتی گئی بلکہ اس کی مخالفت کی گئی اور مسلمانوں کی اس علمی میراث کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔

دوسری طرف بہت سے اہل سنت محققین اس بے التفاتی اور خلفائے ثلاثہ کی طرف سے کتابتِ حدیث پر پابندی کی توجیہ کے لیے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور فرمودات سے استدلال کرتے

۱۔ دیکھیے: شیخ مفید کی کتاب الارشاد ج ۱، ص ۲۳۳۔ علامہ عسکری نجم الدین کی کتاب حدیث الثقلین اور محمد محمدی ری شہری کی کتاب اہل البیت فی الکتاب والسنۃ

۲۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۳۶۔ ۳۷۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۴ و ۱۷۔ سنن دارمی ج ۲، ص ۴۳۲۔ المستدرک علی الصحیحین ج ۳، ص ۱۴۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اہل البیت فی الکتاب والسنۃ ص ۱۲۶

ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود خلفاء سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اُن کی احادیث پر پابندی لگائیں اور ''حسبنا کتاب اللہ'' کا نعرہ بلند کریں جبکہ سچ یہ ہے کہ ان خود غرضانہ افکار کے برعکس آنحضرتؐ نے اپنی حدیث کی اشاعت اور حفاظت کی طرف پوری توجہ دلائی تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے ان عملی اقدامات کی موجودگی میں ہم ایسی کسی توجیہ کو قبول نہیں کر سکتے۔

''نقلِ حدیث'' کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہتمام

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کی اشاعت کا جو اہتمام فرمایا تھا اُس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اسلام میں تعلیم و تعلم کی اہمیت

دوست اور دشمن سب مانتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم و تعلم پر جتنا زور دیا گیا ہے، دنیا کے کسی دین میں اتنا زور نہیں دیا گیا۔ اسلام دنیا کا وہ واحد دین ہے جس کی ''کتاب مقدس'' کا آغاز لفظ ''اقرأ'' سے ہوا اور یہ کتاب اُس کے رسول کا زندہ معجزہ ہے۔ پہلی وحی یعنی سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات میں تخلیق انسان کے متعلق اللہ کی قدرت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو قلم کے ذریعے اُن باتوں کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ ارشاد اقدس الٰہی ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے خون کے لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا۔ پڑھ کہ تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

اسلام میں علم حاصل کرنے کے لیے جغرافیائی سرحدوں کی کوئی حیثیت نہیں [۱] اور عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرو [۲] اور یہ بھی کہتا ہے کہ والدین پر اپنی اولاد کو

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین ہی جانا پڑے۔
(شرح اصول کافی ج ۱، ص ۱۵۷۔ وسائل الشیعہ ج ۲۷، ص ۲۷)

استاد ہاشم معروف حسنی کہتے ہیں کہ عصر رسولؐ میں چین جانا ہمارے زمانے میں چاند پر جانے سے زیادہ سخت تھا۔
(دراسات فی الحدیث والمحدثین ص ۱۹)

۲۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ فِيْ كُلِّ حَالٍ علم حاصل کرنا ہر حال میں فرض ہے۔ (وسائل ج ۲۷، ص ۲۷)

تعلیم دلانا فرض ہے۔[۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درخشاں کارناموں میں سے ایک کارنامہ جو علم و دانش کی تاریخ کے لیے درس کی حیثیت رکھتا ہے جنگ بدر کے مشرک قیدیوں کے ساتھ آپ کا سلوک ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بدر کے جنگی قیدیوں کو فی کس چار ہزار درہم یا کچھ کم فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا اور جن کے پاس زرِ فدیہ نہ تھا اُن کی آزادی کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔[۲]

اسلام نے لوگوں کو یہ تاکید کی کہ ہر علاقے سے کچھ لوگ مدینہ چلے آئیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین کا علم سیکھیں اور جب وہ دین کا علم یعنی اسلامی فقہ سیکھ لیں تو اپنے علاقوں میں لوٹ جائیں اور لوگوں کو دین کے احکام بتائیں اور برائیوں کے انجام سے ڈرائیں جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ...فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ○ ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اُن کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت اپنے علاقے سے نکل کر جایا کرے تاکہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرے اور واپس آ کر اپنے علاقے کے لوگوں کو ڈرائے تاکہ وہ نافرمانی کے برے انجام سے ڈریں۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۲۲)[۳]

(۲) "نشرِ حدیث" کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہتمام

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو اگر مکانی اور زمانی حوالے سے دیکھا جائے تو وہ آپ کی ذاتِ اقدس میں منحصر ہے مگر اسلام اپنی ابتدا سے کسی ایک علاقے تک محدود نہ تھا بلکہ اسلام کا سورج حجاز سے طلوع ہوا اور پوری دنیا کو جگمگا گیا۔ چونکہ اسلام ایک عالم گیر دین ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روم، ایران، مصر اور حبشہ کے فرمانرواؤں کو خطوط لکھ کر اور سفیر بھیج کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔[۴]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اعلان کیا ہے کہ وہ اسلام کو تمام باطل ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا

۱۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اولاد کا حق ہے کہ والدین انھیں لکھنا اور قرآن پڑھنا سکھائیں۔ (کافی ج ۶، ص ۴۹)

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۲۲

۳۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے: جامع البیان ج ۱۱، ص ۸۹۔ التبیان ج ۳، ص ۳۲۱۔ ۳۲۳

۴۔ تاریخ ابن خلدون ج ۲، ص ۲۲۲۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۹۳۔ ۲۹۵

چنانچہ ارشاد اقدس الٰہی ہے: هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرکین ناخوش ہوں۔ (سورۂ صف: آیت ۹)

اور قرآن مجید میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ اُس کے رسول کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے مثال کے طور پر

(۱) ...وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۂ نساء: آیت ۷۹)

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۷) [1]

جب اسلام عالمی اور دائمی دین ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری انسانیت کے رسول ہیں تو کیا

۱۔ قرآن کریم میں اس طرح کی دیگر آیات بھی ہیں جیسے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۂ سبا: آیت ۲۸) اور

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (سورۂ اعراف: ۱۵۸)

ان آیات میں یہ نکتہ موجود ہے کہ اسلام کی تعلیمات پوری دنیا کے لیے ہیں۔ قرآن کریم میں کئی ایسی آیات ہیں جن سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ اللہ نے عربوں سے ایک طرح کی بے نیازی اور بے اعتنائی کا اظہار کیا ہے۔ ان آیات کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام تم عربوں کا محتاج نہیں ہے۔ اگر بالفرض تم نے اسلام قبول نہ کیا تو دنیا کی دوسری قومیں دل و جان سے اسے قبول کریں گی۔ اس طرح کی آیات کے مجموعے سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم نے غیر عرب اقوام کو اسلام کی قبولیت کے لیے زیادہ مناسب اور زیادہ آمادہ بتایا ہے۔ ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہے

...فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ○ اگر یہ (عرب) قرآن کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ (سورۂ انعام: آیت ۸۹)

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ○ اگر اللہ چاہے تو اے لوگو تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ اللہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (سورۂ نساء: ۱۳۳)

...وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ○ اگر تم (اعراب) قرآن کریم کو پشت دکھاؤ گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (سورۂ محمدؐ: آیت ۳۸)

(استاد شہید مرتضیٰ مطہری، تاریخ اسلام جلد ۱، صفحہ ۶۴، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

یہ بات قرین عقل ہے کہ آپ نے اپنی احادیث صرف اپنی زندگی میں موجود لوگوں کو بتائی ہوں اور بعد میں آنے والی نسلوں تک اُن کو پہنچانے سے غفلت برتی ہو؟

یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔

خوش قسمتی سے ہمیں آنحضرتؐ کی قولی اور عملی سیرت میں نشر حدیث کے اہتمام کو ثابت کرنے والے شواہد بہت زیادہ ملتے ہیں جن میں سے ایک آپ کی وہ مشہور حدیث ہے جو کچھ محدثین کے بقول حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے[۱] یعنی مَنْ حَفِظَ مِنْ اُمَّتِی اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا مِمَّا یَحْتَاجُوْنَ اِلَیْهِ مِنْ اَمْرِ دِیْنِهِمْ بَعَثَهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَقِیْهًا عَالِمًا میری امت میں سے جو شخص ایسی چالیس احادیث یاد کرے جن کی دینی امور میں لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے دین کو سمجھنے اور جاننے والے کے زمرے میں محشور کرے گا۔[۲] اس حدیث کا اہم ترین پیغام اشاعت حدیث کی اہمیت کا بیان ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ اگر اس حدیث کے مطابق ہر مسلمان چالیس احادیث یاد کرے تو مسلمانوں کے ہاں احادیث کے کتنے مجموعے سامنے آئیں گے!![۳]

تاریخ حدیث گواہ ہے کہ بہت سے مسلمان علماء نے اس روایت پر عمل کرتے ہوئے چالیس احادیث — اکثر اُن کی تشریح کے ساتھ — لکھ کر پھیلائیں جو تاریخ حدیث میں ''اربعینیات'' کے نام سے مشہور ہیں اور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ حدیث کی برکتوں میں سے ہیں کہ اس طرح میراث حدیث ضائع ہونے سے بچ گئی اور حدیث کی اہمیت بھی واضح ہوگئی۔[۴]

تمام محدثین اور مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اہم ترین

۱۔ علامہ مجلسی نے اس مضمون کی مختلف روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ مضمون سنی اور شیعہ دونوں میں مشہور اور مستفیض ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ متواتر ہے۔ (بحار الانوار ج ۲، ص ۱۵۶)
شیخ بہائی نے بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ (الاربعین ص ۵۰۶)

۲۔ شیخ صدوق، الخصال ص ۵۴۱ - ۵۴۳
علامہ مجلسی نے اس مضمون کی دس روایات نقل کی ہیں۔ (بحار الانوار ج ۲، ص ۱۵۳ - ۱۵۶)

۳۔ مفہوم حدیث سے بیشتر آگہی کے لیے دیکھئے: شیخ بہائی کی کتاب الاربعین ص ۵۰۳ - ۵۰۷

۴۔ آغا بزرگ تہرانی نے — علامہ مجلسی کا یہ قول لکھنے کے بعد کہ حفظ کا بہترین مصداق کتابت ہے — فرمایا ہے کہ بہت سے بزرگ علماء نے اس سیرت کی پیروی کرتے ہوئے ''چہل حدیث'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور میں نے اس نام کی ۹۰ کتابوں کا سراغ لگایا ہے۔ (الذریعہ ج ۱، ص ۴۰۹ - ۴۳۳)

دینی اور اَخلاقی تعلیمات کو بیان کیا اور آخر میں فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنكُمُ الْغَائِبَ جو یہاں حاضر ہے وہ میرا پیغام غیر حاضر افراد تک پہنچائے۔[1] نیز مسجد خیف میں اپنے خطبے میں آپ نے ارشاد فرمایا: ''خدا اُس شخص کو شاد رکھے جو میری باتوں کو سنے، انھیں یاد رکھے اور ان لوگوں تک پہنچائے جنھوں نے انھیں نہیں سنا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے شخص تک علم کو پہنچاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی جاہل کے سامنے علم کو پیش کرتا ہے۔[2] غیر حاضر لوگوں تک اپنی حدیث پہنچانے کا یہ حکم قرآن کی آیت لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (سورۂ انعام: آیت ۱۹) کی طرح آنحضرتؐ کی رسالت کے کسی خاص زمانے تک محدود نہ ہونے کو واضح کرتا ہے۔

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کتابتِ حدیث کا اہتمام

ممکن ہے کہ کوئی شخص مذکورہ بالا دلائل و شواہد کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبانی طور پر تو حدیث کی حفاظت اور اشاعت کا حکم دیا تھا مگر اسے لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس بات کو اصطلاحی طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے زبان سے حدیث بیان کرنے کا کہا تھا، حدیث لکھنے کا نہیں کہا تھا۔ اس صورت میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد خلفائے ثلاثہ نے کتابتِ حدیث پر جو پابندی لگائی تھی وہ دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کی پیروی تھی تو کیا غلط ہے؟

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ دعویٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی طرف توجہ نہیں دی تھی صحیح نہیں ہے۔ اگر بفرض محال اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے تب بھی خلفاء کو حدیث کی زبانی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے تھا جبکہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ انھوں نے حدیث لکھنے اور بیان کرنے پر مطلق پابندی لگا دی تھی۔ یہ حقیقت شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کا پورا اہتمام فرمایا تھا۔ آپ کے اس اہتمام کے بعد خلفاء ثلاثہ کی طرف سے لگائی گئی پابندی کی توجیہ کرنا مشکل ہے۔

۱۔ کافی ج ۱، ص ۲۹۱۔ تحف العقول ص ۳۴

۲۔ بحار الانوار ج ۴۷، ص ۱۳۶۔ مسند احمد ج ۵، ص ۱۸۳

کتابتِ حدیث کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقدامات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کے لیے جو کوششیں کی تھیں انھیں حسب ذیل اقدامات میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

(۱) کتابتِ حدیث کی تاکید

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ علمی میراث کی حفاظت کے لیے صرف حافظے پر بھروسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ حافظہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو واردات ذہنی کی وسعت کی وجہ سے اشتباہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ وقت گزرنے، بڑھاپے اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کی کمزوری کی وجہ سے حافظہ ہر بات کو پوری طرح محفوظ رکھنے میں مکمل طور پر مددگار نہیں ہوتا اسی لیے دین کے خدمت گزاروں نے ہر زمانے میں "حدیث کو لکھا۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کے حکم (اُکتبوا ھذا العلم) [۱] کو "علم کو قید" کرنا سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ علم کو "کتابت" کے ذریعے قید کر لو۔[۲]

لفظ "قید" زنجیر کے معنی میں ہے اور "تقیید" زنجیر باندھنے کو کہا جاتا ہے۔ یہ تعبیر اس بات کا کنایہ ہے کہ علم انسان کے ہاتھ لگنے والے قیدی کی طرح ہوتا ہے کہ ہر وقت اس کے بھاگ جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ علم کو کتابت کی زنجیریں پہنا کر محفوظ کر لو ورنہ وہ تمہارے حافظے سے نکل جائے گا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعبیر کتابت کے ذریعے علم کی حفاظت کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت اور کتابت کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور آپ کے اس حوالے سے اٹھائے گئے اقدام کو بیان کرتی ہے کیونکہ میراثِ حدیث کی اگر صرف زبانی حفاظت پر تکیہ کیا جائے تو وہ منہ زور اور کھلے قیدی کی سی ہے جو بالآخر وقت گزرنے اور نئی نسل کی آمد کے ساتھ لوگوں کے حافظے اور صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گی لیکن کتابت اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دے گی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے اس حکم کا راز ہم جان سکتے ہیں کہ آپ کی رحلت کے صدیوں بعد بھی احادیث کا ورثہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ میراث "کتابت" کی مرہون منت ہے۔

۱۔ کتاب تقیید العلم ص ۲۷

۲۔ بحار الانوار ج ۷۷، ص ۱۴۱۔ مستدرک حاکم ج ۱، ۱۰۶

روایت ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس دوران یمن کا رہنے والا ایک آدمی "ابوشاۃ" کھڑا ہوا اور بولا: یا رسول اللہؐ! آپ یہ خطبہ مجھے لکھ کر عنایت فرمائیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے کاتب سے کہا: **اُکتبوا لابی شاۃ** یعنی ابوشاۃ کو میرا یہ خطبہ "لکھ کر" دے دو۔[1]

علمائے اہل سنت نے اس حدیث سے آنحضرتؐ کے کتابتِ حدیث کے اہتمام اور اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے بجا طور پر استدلال کیا ہے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ کتابتِ حدیث کے متعلق اس سے زیادہ صحیح اور محکم روایت موجود نہیں۔[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علیؑ کی طرف سے اگرچہ اپنے ارشادات کے فراموش ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا اس کے باوجود آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ آپ کے "ارشادات کو لکھ لیں" تاکہ آپ کی نسل سے آنے والے ائمہ کے لیے مددگار ثابت ہوں۔[3] حضرت علیؑ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا آپ کو میرے متعلق بھول جانے کا خوف ہے؟ فرمایا: نہیں۔ مجھے تمہارے بھول جانے کا کوئی خوف نہیں کیونکہ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ تمھیں نہ بھولنے والا حافظہ عطا فرمائے، تم اپنے شریکوں کے لیے لکھو۔ حضرت علیؑ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! میرے شریک کون ہیں؟ فرمایا:

تمہاری نسل سے آنے والے ائمہ ...[4]

کتابتِ حدیث کے اہتمام اور حکم سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تاریخی، مسلم اور ناقابل توجیہ شواہد میں سے ایک آپ کا بستر رحلت پر دیا گیا حکم ہے۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کا وقت قریب آیا تو آپ کے حجرے میں بہت سے صحابہ موجود تھے۔ آپ نے اس حالت میں فرمایا کہ مجھے قلم دوات لا دو تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ کر جاؤں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو سکو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے، ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔[5]

۱۔ صحیح بخاری ج ۳، ص ۹۵۔ ج ۸، ص ۳۸۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۱۰

۲۔ بحوالہ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۸۸

۳۔ امام محمد باقرؑ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: میں جو کچھ تمھیں املاء کراؤں اسے لکھ لو۔

۴۔ امالی صدوق ص ۳۲۷۔ بصائر الدرجات ص ۱۶۷

۵۔ صحیح بخاری ج ۱، ص ۳۷ و ج ۷، ص ۹۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۳۳۶

چونکہ آنحضرتؐ نے زندگی کے آخری لمحات میں یہ حکم دیا تھا اس لیے اہل سنت محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ حدیث ان روایات کی ناسخ ہے جس میں کتابتِ حدیث سے منع کیا گیا ہے جیسے ابوسعید خدری کی روایت ...[1]

(۲) مخطوطاتِ حدیث کی جمع آوری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تمام مسلمانوں یا بعض صحابہ کو حدیث کی کتابت کی متعدد مرتبہ ترغیب کے بعد تاریخ کئی ایسے صحابہ کی نشاندہی کرتی ہے جنھوں نے آنحضرتؐ کی زندگی میں آپ کے املاء یا کتابت کے حکم پر آپ کی احادیث لکھی تھیں۔

''شیعہ حدیث کی تاریخ'' کے ابتدائی ادوار کی اولین تحقیق ''کتابِ علیؑ'' یا ''جامعہ'' ہے جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

اس کے علاوہ تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہی ''صحیفۃ النبی'' اور ''الصحیفۃ الصادقہ'' نامی احادیث کے دو مجموعے بھی جمع کئے گئے تھے۔

صحیفۃ النبی چند احادیث پر مشتمل مختصر سا مجموعہ تھا جسے آنحضرتؐ نے خود املاء کرایا تھا اور آپ کی حیاتِ مبارکہ میں وہ مجموعہ آپ کی تلوار کے قبضے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔ کچھ روایات میں ہے کہ حضرت علیؑ کو یہ مجموعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کے قبضے سے ملا تھا۔[2] پھر آپ اس مجموعہ کو حفاظت کی غرض سے اپنی تلوار کے قبضے کے ساتھ باندھ کر رکھتے تھے۔[3]

الصحیفۃ الصادقہ میں وہ احادیث تحریر تھیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو املاء کرائی تھیں۔ تاریخی اعتبار سے کسی صحابی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجموعۂ احادیث کا عصر رسولؐ میں موجود ہونا ایک مسلمہ اور قطعی تاریخی حقیقت ہے جسے تمام محدثین اہل سنت تسلیم کرتے ہیں۔[4]

۱۔ الحدیث والمحدثون ص ۱۲۴

۲۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کے قبضے سے ایک تحریر ملی تھی۔ (کافی ج ۷، ص ۲۷۴)

۳۔ بحار الانوار ج ۴۰، ص ۱۳۳

۴۔ فواد سزگین کہتے ہیں کہ یہ عصر رسولؐ میں لکھا ہوا مجموعہ احادیث تھا۔ (تاریخ نگارش ہای عربی ص ۱۲۳)

کچھ علماء نے لکھا ہے کہ یہ عصر رسولؐ میں صحابہ کی طرف سے لکھا جانے والا مشہور ترین مجموعہ ہے۔[۱]
کچھ محدثین کا بیان ہے کہ اس مجموعے میں ایک ہزار احادیث تھیں۔[۲]
امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس مجموعے سے کچھ روایات نقل کی ہیں۔[۳]
عبداللہ بن عمرو بن العاص ہمیشہ اس مجموعے کا ذکر کیا کرتے تھے، اس پر ناز کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس مجموعے کی تمام احادیث آنحضرتؐ نے لکھوائی تھیں۔[۴]

۱۔ التشریع والفقہ فی الاسلام تاریخاً ومنہجاً ص ۲۷۵ بحوالہ مقالہ تدوین حدیث ۳، فصل نامہ علوم حدیث ش ۳، ص ۳۱

۲۔ معرفۃ النسخ والصحف الحدیثیہ ص ۱۷۹ بحوالہ مقالہ تدوین حدیث ۳

۳۔ مسند احمد بن حنبل ج ۲، ص ۱۵۸ اور بعد کے صفحات

۴۔ کتاب تقیید العلم ص ۸۴۔ المحدث الفاصل ص ۳۶۶

دوسرا باب

شیعہ حدیث کی تاریخ

شیعہ حدیث کے تاریخی ادوار کی تحقیق

''شیعہ حدیث کی تاریخ'' کے ادوار تین طرح سے ''سنی حدیث کی تاریخ'' کے ادوار سے مختلف ہیں جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱) اہل سنت کا پہلا دورِ حدیث، تدوینِ حدیث پر پابندی کا دور ہے جس میں رسول اکرم ﷺ اور اُن کے اہل بیتؑ کی حدیث لوگوں کے سامنے بیان کرنے پر پابندی تھی اور شیعہ محدثین کو سزا بھی دی جاتی تھی۔ شیعہ محققین کہتے ہیں کہ خلفاء کی طرف سے اس پابندی کی وجہ اہل بیتؑ کی مخالفت اور سیاسی مقاصد کا حصول تھا۔ اس طرح اہل سنت کا پہلا دورِ حدیث ''تدوینِ حدیث پر پابندی'' سے شروع ہوتا ہے جبکہ شیعہ حدیث کی تاریخ میں تدوین حدیث پر پابندی کا کوئی دور نہیں گزرا۔

اس بات کو زیادہ واضح الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ شیعہ حدیث کی تاریخ عصر رسالت و امامت سے مکمل طور پر متصل ہے اور اس سلسلے کی کوئی کڑی ایک دوسرے سے جدا نہیں، اسی لیے شیعہ حدیث کے ابتدائی دور کو تدوین حدیث کا پہلا دَور کہا جا سکتا ہے۔

(۲) جن اہل سنت محدثین نے سب سے پہلے ''جوامع احادیث'' کو مرتب کیا انھوں نے زبانی بیان ہونے والی احادیث پر ان کی بنیاد رکھی۔ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اپنے اساتذہ کے طرق سے جو احادیث زبانی سنی تھیں انھی کی بنیاد پر ''صحیحین'' کی تدوین کی ہے۔ اس کے برعکس اولین شیعہ محدثین نے جو احادیث کی کتابیں مرتب کی ہیں انھوں نے اُن کی بنیاد زبانی روایات پر نہیں رکھی بلکہ احادیث کے قلمی نسخے اُن کے سامنے تھے جنھیں ہم ''اصول اربعمأۃ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ چنانچہ ''اصول اربعمأۃ'' کے دور کو شیعی میراثِ حدیث کی تاریخ کا دوسرا دور کہا جاتا ہے۔

یہ دور شیعہ حدیث کی تاریخ کے امتیازات میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) شیعہ حدیث کی تاریخ کی ہر کڑی ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے نیز شیعہ حدیث خطی مواد پر تکیہ کرتی ہے اور حدیثی مخطوطات زیادہ تر ائمہ اہل بیتؑ کی زیرنگرانی معرض وجود میں آئے تھے اس لیے شیعہ حدیث میں اہل سنت کی نسبت گھڑی ہوئی جھوٹی احادیث بہت کم ملتی ہیں اور یہ چیز اہل سنت کی حدیث سے شیعہ حدیث کو ممتاز کرتی ہے۔

اس بنیاد پر شیعہ حدیث کی تاریخ کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) اولین مخطوطات حدیث کی فراہمی کا دور

(۲) شیعہ حدیث کی تشکیل بصورت ''اصول اربعمأۃ''

(۳) شیعہ حدیث کے ابتدائی جوامع کی تدوین کا دور

(۴) شیعہ جوامع حدیث کی تکمیل و تنظیم کا دور

(۵) شیعہ علوم حدیث میں جمود کا دور

(۶) شیعہ علم حدیث کی نشاۃ ثانیہ کا دور

اولین مخطوطات حدیث کی فراہمی کا دور

شیعہ حدیث کا پہلا دور رسالت و امامت سے شروع ہو کر امام زین العابدینؑ تک یعنی ۹۵ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح حدیث کا یہ دور پہلی صدی ہجری پر محیط ہے اور یہ وہی دور ہے جب خلفاء کی طرف سے احادیث لکھنے اور جمع کرنے پر پابندی عائد تھی۔ اولین دور کی شیعہ حدیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

تاریخ میں مذکور شیعی نگارشات

حدیث اور تاریخ کے منابع میں سے کچھ نگارشات ایسی بھی ہیں جو اب موجود نہیں ہیں، یہ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب سلمان فارسیؓ: رحلت رسولؐ کے بعد جاثلیق رومی کو بادشاہ روم نے اسلام کے حقائق معلوم کرنے کے لیے مدینہ بھیجا تھا۔ اس کی اسلام کے متعلق حضرت علیؑ سے جو گفتگو ہوئی تھی حضرت سلمانؓ نے اپنی کتاب میں اس گفتگو کو جمع کیا تھا۔ ابن شہر آشوب لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے بعد حضرت سلمانؓ کتاب تالیف کرنے والے پہلے شخص تھے۔

(۲) کتاب الخطبہ: یہ کتاب حضرت ابوذرؓ کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے رسول اکرمؐ کے بعد کے حالات اور واقعات کو قلمبند کیا تھا۔

(۳) ابن عباسؓ کے مجموعے: انھوں نے ان میں حضرت علیؑ کے فیصلے جمع کیے تھے۔

(۴) کتاب جابر بن عبداللہ انصاریؓ: یہ کتاب ''صحیفہ جابر'' کے نام سے مشہور ہے۔[1] کچھ علماء

۱۔ فواد سزگین نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی کتاب کو اموی دور کی اور پہلی صدی کی تحریر شمار کیا ہے۔ (تاریخ نگارش ہای عربی ص ۱۲۳)

کہتے ہیں کہ یہ کتاب مناسکِ حج کے بیان پر مشتمل تھی جبکہ کچھ علماء کہتے ہیں کہ اس کتاب میں جابرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع تحریر کیا تھا۔

(۵) کتاب علی بن ابی رافع : یہ حضرت علیؑ کے کاتب اور خاص صحابی تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں وضو اور نماز جیسے فقہی احکام بیان کئے تھے۔ ائمہ اہل بیتؑ اس کتاب کی بڑی قدر کرتے تھے اور لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا حکم دیا کرتے تھے۔

(۶) کتاب اصبغ بن نباتہ مجاشعی : انھوں نے اس کتاب میں حضرت علیؑ کا مالک اشترؒ کے نام لکھا گیا خط اور حضرت علیؑ کا اپنے بیٹے جناب محمد بن حنفیہ کے نام لکھا گیا وصیت نامہ نقل کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے آپ کے کچھ فیصلے بھی تحریر کئے تھے۔

(۷) کتاب میثم تمار : حضرت میثم نے ایک تفسیر کی کتاب لکھی تھی جس میں روایات اور حضرت علیؑ سے منقول تفسیری نکات جمع کئے تھے۔ ان کی اور بھی کچھ کتابیں تھیں جو ان کی اولاد کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان کتابوں کے مضامین اور خود ان کے متعلق ہمارے پاس کوئی تفصیل موجود نہیں۔

(۸) کتاب زید بن وہب جہنی : اس کتاب میں انھوں نے حضرت علیؑ کے وہ خطبات جمع کئے تھے. جو آپ نے عیدین اور دیگر مواقع پر دیئے تھے۔

(۹) کتاب حارث بن عبداللہ اعور ہمدانی : شیخ طوسی کے مطابق انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں حضرت علیؑ کی ایک یہودی سے گفتگو کو نقل کیا تھا۔

(۱۰) نسخہ عبیداللہ بن حر جعفی : انھوں نے اس کتاب میں حضرت علیؑ کے کچھ خطبات نقل کئے تھے۔[۱]

حدیث کے محفوظ مجموعے

ابتدائی دور کے کچھ حدیثی مجموعے ایسے بھی ہیں جو زمانے کے دست برد سے محفوظ رہے اور ہم تک پہنچے یا "کتاب علیؑ" کی طرح ائمہ طاہرینؑ کے پاس رہے۔ جو کتب ہم تک پہنچیں ان میں نہج البلاغہ اور صحیفہ سجادیہ جیسی کتابیں یا کم از کم اُن میں سے کچھ حصے شامل ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے :

۱۔ دیکھئے : مقدمہ معجم بحار الانوار ج ۱، ص ۳۱ ۔ مقدمہ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۶ ۔ ۸ ۔ تاسیس علوم الشیعہ ص ۲۸۰ ۔ ۲۸۵

(۱) کتابِ علیؑ

تاریخی منابع اور روایات میں اس کتاب کو جامعہ، جفر جامعہ، صحیفہ علیؑ اور صحیفۃ الفرائض جیسے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے املاء کرائی تھی اور حضرت علیؑ نے اسے اپنے دست مبارک سے تحریر کیا تھا۔ اس کی لمبائی ستر ہاتھ (تقریباً پینتیس میٹر) تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب طومار کی صورت میں تھی۔

ایک روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کتاب ائمہ طاہرینؑ کے لیے علمی میراث کے طور پر املاء کرائی تھی۔ چنانچہ بصائر الدرجات میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: میں تمھیں جو کچھ لکھواتا جاؤں اسے تم لکھتے رہو۔ حضرت علیؑ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا آپ کو میرے بھول جانے کا خوف ہے؟ فرمایا: نہیں کیونکہ میں نے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ وہ تمھیں سہو ونسیان سے محفوظ رکھے۔ تم اپنے شریکوں کے لیے لکھتے رہو۔ حضرت علیؑ نے پوچھا: میرے شریک کون ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تمہاری نسل سے آنے والے ائمہ۔[۱]

ائمہ طاہرینؑ فرماتے تھے:

ہم اپنے علم کا کچھ حصہ روح القدس کے القاء سے اور کچھ کتاب علیؑ سے اخذ کرتے ہیں۔[۲]

ائمہ طاہرینؑ اکثر کتاب علیؑ سے رجوع کرتے تھے اور کبھی کبھار اپنے شاگردوں اور مخالفین کو بھی کتاب علیؑ کی زیارت کراتے تھے اور اس کتاب کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار قرار دیتے تھے۔

بطور نمونہ اس کی چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ابو بصیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے میراث کا ایک مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: کیا یہی مسئلہ میں تمھیں کتاب علیؑ سے نہ دکھاؤں؟

۱۔ بصائر الدرجات ص ۱۸۷

۲۔ اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ آپ کے فیصلوں کی بنیاد کس چیز پر ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہمارے فیصلوں کی بنیاد حکم خدا، حکم داؤدؑ اور حکم محمدؐ پر ہوتی ہے اور اگر ہمیں کسی ایسی چیز سے واسطہ پڑے کہ جس کا حکم "کتاب علیؑ" میں موجود نہ ہو تو روح القدس ہم پر القاء کرتا ہے اور خداوند عالم الہام فرماتا ہے۔
(بحار الانوار ج ۲۵، ص ۵۶)

میں نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! کیا کتاب علیؑ معدوم نہیں ہوگئی؟

آپ نے فرمایا: اے ابو محمد! کتاب علیؑ معدوم نہیں ہوسکتی۔

پھر (آپ اٹھے) اور ایک کتاب کو ساتھ لیے ہوئے باہر آئے۔ وہ ایک بڑی کتاب تھی اور اس میں لکھا تھا کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور پسماندگان میں صرف چچا اور ماموں کو چھوڑ جائے تو چچا کو دو تہائی اور ماموں کو ایک تہائی میراث ملے گی۔[۱]

(۲) فضیل کہتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے مجھ سے فرمایا: اے فضیل! ہمارے پاس کتاب علیؑ موجود ہے جو کہ ستر ہاتھ لمبی ہے۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا ذکر اس کتاب میں نہ ہو یہاں تک کہ خراش کی دیت بھی اس میں بیان کی گئی ہے۔[۲]

نجاشی نے محمد بن عذافر بن عیسیٰ صیرفی کے حالات میں لکھا ہے کہ عذافر نے بیان کیا کہ میں (اہل سنت کے ایک مشہور فقیہ) حکم بن عتیبہ کے ساتھ امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے امام سے بہت سے سوالات پوچھے۔ امام نے بڑے احترام کے ساتھ جوابات دیئے۔ ایک مسئلے میں اُن کے درمیان اختلاف ہوگیا تو امام نے اپنے بیٹے سے فرمایا: بیٹا! جاؤ! گھر سے کتاب علیؑ لے آؤ۔ آپ کا بیٹا گیا اور ایک بڑی کتاب جو کہ طومار کی طرح لپیٹی ہوئی تھی، اٹھا کر لایا۔ امام نے اسے کھول کر دیکھا اور اس میں سے مذکورہ مسئلہ نکالا اور فرمایا کہ یہ کتاب، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے املاء کرائی تھی اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائی تھی۔[۳]

بہت سی روایات میں ائمہ طاہرینؑ کی زبان سے یہ جملہ بیان ہوا ہے کہ "کتاب علیؑ میں یوں لکھا ہے" یا یہ کہ "ہم نے کتاب علیؑ میں یوں پایا ہے" یا یہ کہ ہم نے کتاب علیؑ میں اس طرح پڑھا ہے" اور ...[۴]

ائمہ اہل بیتؑ نے کتاب علیؑ کے متعلق متعدد مرتبہ بیان کیا ہے کہ قیامت تک امت کو جو مسائل درپیش ہوں گے اُن سب کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ یہ بات اس کتاب کی جامعیت کو واضح کرتی ہے۔ اگرچہ مختلف مسائل کے جوابات کی کیفیت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو کلیات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب علیؑ کے حوالے سے جب روایات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا

۱۔ مختلف الشیعہ ج ۹، ص ۲۹ ۲۔ بحار الانوار ج ۲۶، ص ۳۴ ۳۔ بحوالہ دروس فی فقہ الامامیہ ص ۱۹۰

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: الخلاف ج ۱، ص ۱۳۲۔ المہذب ج ۲، ص ۳۱۔ السرائر ج ۳، ص ۵۶۰۔ المعتبر ج ۱، ص ۵۰

ہے کہ اس کتاب میں احکام کے علاوہ اخلاقی مباحث، تفسیر قرآن اور مستقبل میں امت کو پیش آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں بھی موجود تھیں۔[۱]

ائمہ اہل بیتؑ کے کچھ دوستوں اور کچھ مخالفین نے اس کتاب کو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔[۲]

ائمہ اہل بیتؑ نے اس کتاب کو عام طور پر پوشیدہ ہی رکھا اور روایات بیان کرتی ہیں کہ یہ کتاب اس وقت امام زمانؑ کے پاس موجود ہے۔

(۲) مصحف فاطمہؑ

''مصحفِ فاطمہؑ'' کو ''کتاب فاطمہؑ'' یا ''صحف فاطمہؑ'' کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

روایات میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوئی تو حضرت فاطمہؑ اپنے والد ماجد کی جدائی میں بہت رویا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلی دینے کے لیے حضرت جبرئیلؑ یا کسی دوسرے فرشتے کو بھیجا۔ وہ فرشتہ آپ کو تسلی دیتا تھا اور قیامت تک آپ کی اولاد سے متعلق واقعات کی خبر دیتا تھا۔ اس گفتگو کو حضرت علیؑ لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا مصحف فاطمہؑ، حضرت فاطمہؑ اور فرشتے کی گفتگو کا وہ مجموعہ ہے جسے حضرت علیؑ نے مرتب کیا تھا۔

ابو عبیدہ بیان کرتے ہیں ... میں نے امام جعفر صادقؑ سے مصحف فاطمہؑ کے متعلق پوچھا تو آپ کافی دیر تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ حضرت فاطمہؑ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ۷۵ دن زندہ رہیں۔ آپ دن رات اپنے والد ماجد کے غم میں ڈوبی رہتی تھیں۔ حضرت جبرئیلؑ بی بی کے پاس آکر انھیں تسلی دیتے تھے اور وہ بی بی کو ان کے والد ماجد اور ان کے شوہر اور ان کی اولاد کے مقام و مرتبے سے آگاہ کرتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی خبر دیتے تھے اور حضرت علیؑ ان کو لکھتے جاتے تھے، یہ ہے ''مصحف فاطمہؑ''۔[۳]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مصحف فاطمہؑ'' کا نام اہل سنت کے ہاں بھی مشہور تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ شیعہ موجودہ قرآن کو محرف جانتے ہیں اور وہ اہل بیتؑ کی تعلیمات کے مطابق یہ

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مجمع الفائدہ ج ۱۲، ص ۵۱۳۔ زبدۃ البیان ص ۴۸۵۔ کافی ج ۱، ص ۴۱ وغیرہ

۲۔ رجال نجاشی ص ۳۰۶

۳۔ بصائر الدرجات ص ۱۷۳

عقیدہ رکھتے ہیں کہ تحریف شدہ اور حذف شدہ آیات میں سے کچھ ''مصحف فاطمہؑ'' میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے ائمہ طاہرینؑ پوری شدت سے اس الزام کی تردید کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود اُن کی طرف سے ائمہ طاہرینؑ کی زندگی میں اور آج بھی الزام تراشی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ علامہ سید ہاشم معروف حسنی لکھتے ہیں: کچھ اہل سنت محدثین و مؤلفین عوام کے ذہنوں کو خراب کرنے اور شیعوں کو متہم کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ مصحف فاطمہؑ موجودہ قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن ہے۔[۱]

علامہ سید مرتضیٰ عسکری لکھتے ہیں کہ کچھ اہل سنت مؤلفین نے مکتب اہل بیتؑ کا دفاع کرنے والوں پر ایک اور تہمت لگائی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ شیعوں کے ہاں ''مصحف فاطمہؑ'' کے نام سے کوئی دوسرا قرآن موجود ہے کیونکہ ''کتاب فاطمہؑ'' کو شیعہ ''مصحف'' کہتے ہیں جبکہ صدر اسلام میں کچھ مسلمان بھی قرآن کریم کو ''مصحف'' کہا کرتے تھے[۲] حالانکہ ائمہ اہل بیتؑ نے جب بھی اس مصحف فاطمہؑ کا تذکرہ کیا تو اس الزام کو رد کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لوگوں کو بتایا کہ یہ قرآن نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ ''مصحف فاطمہؑ'' کی توصیف میں فرماتے ہیں: خدا کی قسم! ہمارے پاس مصحف فاطمہؑ ہے۔ اس میں قرآن کی ایک آیت بھی موجود نہیں ہے۔[۳]

ایک اور روایت میں امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا کہ میرے پاس مصحف فاطمہؑ موجود ہے۔ اس میں قرآن کی کوئی آیت نہیں ہے۔[۴]

عمومی روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مصحف فاطمہؑ میں امت مسلمہ کو پیش آنے والے واقعات[۵] یا حکمرانوں[۶] کے حالات یا اولاد فاطمہؑ سے روا رکھے جانے والے سلوک کی پیشین گوئیاں درج تھیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اولاد امام حسنؑ میں سے محمد اور ابراہیم نے عباسی خلیفہ منصور دوانیقی کے خلاف شورش کی تو امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تھا کہ ''مصحف فاطمہؑ'' میں مجھے ان کا نام مسلمان حکمرانوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔[۷]

۱۔ دراسات فی الحدیث والمحدثین ص ۳۰۲

۲۔ معالم المدرستین ج ۲، ص ۳۲

۳ و ۴۔ بصائر الدرجات ص ۱۷۳

۵ و ۶۔ معالم المدرستین ج ۲، ص ۳۱۲ اور ۳۶۳

۷۔ مناقب آل ابی طالب ج ۳، ص ۳۷۴۔ بصائر الدرجات ص ۱۸۱

(۳) مصحف علیؑ

''مصحف علیؑ'' سے قرآن کریم کا وہ نسخہ مراد ہے جو حضرت علیؑ نے رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد تحریر کیا تھا۔ جب آپ نے قرآن کا وہ نسخہ لوگوں کو دکھایا تو اس کے ساتھ بے توجہی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا اور وہ قرآن علمی میراث کی حیثیت سے ائمہ طاہرینؑ کے ہاتھوں میں منتقل ہوتا رہا۔ روایات کے مطابق وہ نسخہ اس وقت امام زمانہؑ کے پاس موجود ہے۔ ابن ندیم چوتھی صدی ہجری کے مشہور مصنف گزرے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی ردا اس وقت تک دوش پر نہ ڈالیں گے (یعنی گھر سے باہر نہ نکلیں گے) جب تک قرآن مجید کو جمع نہ کرلیں۔ اس لیے آپ خانہ نشین ہو گئے اور قرآن جمع کیا اور یہ قرآن کا پہلا تدوین شدہ نسخہ ہے اور یہ ''مصحف'' آلِ جعفر کے پاس موجود ہے۔[۱]

ابن سیرین نے عکرمہ سے نقل کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی دنوں میں حضرت علیؑ اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور قرآن کریم جمع کیا۔[۲]

ابن جزی کلبی کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں قرآن کریم مختلف نسخوں اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علیؑ نے اسے ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا، اگر وہ مصحف مل جاتا تو اس میں بہت کچھ علم ہوتا۔[۳]

شیخ مفید کہتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے پورے قرآن کو ترتیبِ نزول کے مطابق جمع کیا تھا۔ آپ نے پہلے مکی پھر مدنی سورتیں لکھیں اور منسوخ آیات کو پہلے لکھا اور اُن کی ناسخ آیات کو بعد میں لکھا اور ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر لکھا۔[۴] بعض روایات بتاتی ہیں کہ آپ نے یہ کام رسول اکرم ﷺ کے حکم سے انجام دیا تھا۔[۵]

جو لوگ شیعوں پر تحریف قرآن کا الزام لگاتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مصحف علیؑ سے کسی

۱۔ بحار الانوار ج ۲۸، ص ۲۶۶۔ الفہرست ص ۳۰۔ یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے کہ الفہرست کے مولف ابن ندیم نے یہاں اضافہ کیا ہے کہ ''اس مصحف میں سورتوں کی ترتیب یہ ہے'' لیکن کتاب سے اس حصے کو حذف کردیا گیا ہے!!!

۲۔ الاتقان فی علوم القرآن ج ۱، ص ۵۷

۳۔ التمہید فی علوم القرآن ج ۱، ص ۲۹۰ بحوالہ التسہیل فی علوم التنزیل ج ۱، ص ۴

۴۔ المسائل السرویہ ص ۷۹

۵۔ مناقب آل ابی طالب ج ۱، ص ۳۱۹۔ بحار الانوار ج ۴۰، ص ۱۵۵

بھی صورت میں تحریفِ قرآن کا الزام ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مصحف علیؑ کی تدوین تین وجوہات کی بنا پر ہوئی تھی :

(۱) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن کریم منتشر صورت میں اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا اس لیے ضروری تھا کہ اسے ترتیب دیا جائے اور ایک مصحف میں جمع کیا جائے چنانچہ حضرت علیؑ نے ایک مصحف کی شکل میں مدون کیا۔

(۲) حضرت علیؑ چاہتے تھے قرآن کے معانی و مفاہیم کے ذریعے امت مسلمہ کی رہنمائی کی جائے اس لیے آپ نے اسے ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا تھا اور مکی سورتوں کو مدنی سورتوں سے پہلے رکھا تاکہ لوگوں کو نزول کی ترتیب معلوم ہو۔

(۳) حضرت علیؑ کے پیش نظر صرف آیاتِ قرآن کو ہی جمع کرنا نہیں تھا بلکہ آپ کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیات قرآن کی جو تفسیر کی تھی اس تفسیر کو اور تاویل، سبب نزول اور شانِ نزول کے متعلق آنحضرتؐ کی تمام روایات کو بھی جمع کیا جائے۔ آپ چاہتے تھے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن کریم کا نسخہ پہنچے تو وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اور تاویل سے بھی آگاہ ہو جائیں۔ یہ کام آپ ہی صحیح طور پر کر سکتے تھے کیونکہ آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو قرآن کی تفسیر، تاویل اور قرآن کریم سے متعلق تمام معلومات چاہے وہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں ہوں، محکم و متشابہ کے بارے میں ہوں یا عام و خاص کے متعلق ہوں سے آگاہ فرمایا تھا۔[1]

اس وضاحت کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کا تدوین کردہ نسخہ "قرآن مفسر" تھا۔ اس طرح کی تدوین سے نہ موجودہ قرآن کی کوئی توہین ہوتی ہے اور نہ یہ موجودہ قرآن میں کوئی تحریف ہے کیونکہ یہ نسخہ آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد مرتب کیا تھا۔ اس وقت تک کوئی دوسرا نسخہ منظر عام پر نہیں آیا تھا اس لئے تحریف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب پہلے سے کوئی محرف نسخہ موجود ہی نہیں تھا تو حضرت علیؑ کو تحریف کا تدارک کرنے کے لئے ایک نسخہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟!

مصحف علیؑ کو اپنے حجم کے لحاظ سے حدیث کا ابتدائی نسخہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے کیونکہ اس نسخے میں وہ تفسیری روایات بھی تحریر تھیں جو آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھیں۔ آپ نے تفسیری روایات کو تفسیر کے حاشیے میں اور آیات کے تہہ در تہہ درج کیا تھا اور یہ علمی کام (رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ تفسیر عیاشی ج ۱، ص ۱۴۔ تفسیر صافی ج ۱، ص ۱۹

کی وصیت کے عین مطابق) آپ کے دست مبارک سے انجام پایا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد آپ کا یہ کام اہل بیتؑ کی طرف سے ''میراث حدیث'' کی کتابت کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کی دلیل ہے۔

(۴) نہج البلاغہ

علمائے اسلام نہج البلاغہ کو ''تحت کلام الخالق وفوق کلام المخلوق'' یعنی کلام خدا سے فروتر اور کلام مخلوق سے برتر سمجھتے ہیں۔ نہج البلاغہ کو ''اخو القرآن'' یعنی قرآن کا بھائی بھی کہا جاتا ہے۔

سید رضی متوفی ۴۰۶ھ نے حضرت علیؑ کے خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کے انتخاب سے اس علمی گلدستے کو ترتیب دیا تھا۔ سید رضی نے اس انتخاب کی ایک وجہ امام علیؑ کی فصاحت اور بلاغت[۱] بتائی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جو شخص حضرت علیؑ کے فرمودات سے آگاہی حاصل کرے گا وہ بہترین اندازِ گفتگو سے آشنا ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے اس گلدستے کا نام نہج البلاغہ رکھا تھا۔

سید رضی نے چوتھی صدی ہجری میں حضرت علیؑ کے کلام کو مختلف کتابوں سے منتخب کر کے نہج البلاغہ مدون کی تھی۔ سید رضی کے بقول انھوں نے اس کتاب میں حضرت کے موجود کلام میں سے صرف ایک تہائی حصے کا انتخاب کیا تھا۔[۲] یہ کتاب اپنی تدوین کے دن سے لے کر آج تک تمام شیعہ سنی علماء کی نظر میں نہایت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ نہج البلاغہ کو امت مسلمہ میں اتنی پذیرائی ملی کہ اس ایک کتاب کی شرح، تعلیقات، بیان اسناد اور ترجمے کے حوالے سے ہزاروں کتابیں چھپ چکی ہیں کیونکہ نہج البلاغہ اہم ترین شیعی میراثِ حدیث میں شمار ہوتی ہے۔ موجودہ نہج البلاغہ ۲۴۱ خطبات، ۷۹ مکتوبات اور ۴۸۰ کلمات قصار پر مشتمل ہے۔

یاد رہے کہ امام علیؑ کے کلام کا بڑا حصہ نہج البلاغہ کی تدوین سے پہلے کی کتابوں میں موجود تھا۔ چنانچہ نصر بن مزاحم (متوفی ۲۱۲ھ)، علی بن محمد مائنی (متوفی ۲۲۵ھ)، سید عبدالعظیم حسنی (متوفی ۲۲۴ھ)

۱۔ فصاحت: زبان کا رواں شستہ اور موثر استعمال۔ طلاقت لسانی۔ فصیح یعنی خوش گفتار اور خوش تقریر۔ (دیکھو قصص: آیت ۳۴)
بلاغت: یہ لفظ دو طرح بولا جاتا ہے۔ یا کلام خود بلیغ ہو مطلب کہ لغوی اعتبار سے درست ہو، معنیٰ مقصود کے مطابق ہو اور بات بھی سچی ہو۔ یا یہ کہ کلام متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اتنی خوبی سے اپنی بات کہے کہ مخاطب کو اُس کا قائل ہونا پڑے۔ (دیکھو سورۂ نساء: آیت ۶۳ بحوالہ مفردات، راغب اصفہانی) (رضوانی)

۲۔ دیکھیے: نہج البلاغہ پر سید رضی کا مقدمہ۔

ابراہیم بن محمد ثقفی (متوفی ۲۸۳ھ)، ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ) اور شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ) کے علاوہ کئی بزرگوں نے حضرت علیؑ کے خطبات، مکتوبات اور حکمت آمیز کلمات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ امیرالمومنینؑ کے محفوظ شدہ اور تحریری شکل میں موجود اکثر خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کا تعلق آپ کی پانچ سالہ حکومت کے زمانے سے ہے اور سید رضی کے مطابق مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے آپ کے کلام کا صرف ایک تہائی حصہ جو امام کی حمایت اور آگاہی سے تحریری صورت میں جمع ہوا تھا نہج البلاغہ میں مدون کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سابقہ خلفاء کی طرح نہ صرف حدیث کی کتابت سے منع نہیں فرماتے تھے بلکہ حدیث کی نشر و اشاعت کا خصوصی اہتمام کیا کرتے تھے۔

(۵) صحیفہ سجادیہ

صحیفہ سجادیہ کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ اسے "زبور آل محمدؐ"، "انجیل اہل بیتؑ" اور "اخت القرآن" (قرآن کی بہن) کہا جاتا ہے۔[2]

دعا چونکہ سنت کا ایک حصہ ہے اس لیے صحیفہ سجادیہ کی دعاؤں کو احادیث کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے البتہ امام زین العابدینؑ نے اس میں بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کے قالب میں ضروری عقائد و معارف اور سبق آموز باتیں بڑے دل نشیں انداز میں بیان فرمائی ہیں۔ اگرچہ صحیفہ سجادیہ کی سند کو متصل طور پر بیان نہیں کیا گیا مگر اس کے باوجود امام زین العابدینؑ سے اس کا صدور قطعی ہے کیونکہ دعاؤں کے بلند پایہ مفاہیم اور خوبصورت الفاظ و اسلوب اور بارگاہ الٰہی میں مناجات کا یہ انداز حجت الٰہی کے سوا کسی دوسرے سے ادا ہونا ممکن ہی نہیں۔ معصوم کے علاوہ معرفت الٰہی کی یہ منزل اور حق تعالیٰ سے راز و نیاز کا یہ انداز کسی اور کو میسر کہاں؟

چنانچہ علامہ سید محسن عاملی مرحوم لکھتے ہیں کہ صحیفہ سجادیہ کی فصاحت و بلاغت، اس کے مضامین

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عبدالزہراء حسینی، مصادر نہج البلاغہ و اسانیدہ۔ محمد مہدی جعفری، پژوہشی در اسناد و مدارک نہج البلاغہ۔ دانش نامہ امام علیؑ ج ۱۲۔ مقالہ، نہج البلاغہ ص ۹۳ ۔ ۱۱۷

۲۔ الذریعہ ج ۱۳، ص ۳۴۵ اور ج ۱۵، ص ۱۸۔ الصحیفہ السجادیہ، تحقیق محمد علی ابطحی ص ۶۵۷ ۔ فتح الابواب ص ۷۶

کی بلندی، اس کے مطالب کی گہرائی، بارگاہ الٰہی میں بے مثال عاجزی و فروتنی اور طلب مغفرت و رحمت کے لیے اچھوتا اندازِ بیان جو اس میں جابجا دکھائی دیتا ہے وہ اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ یہ دعائیں امام زین العابدینؑ کی دعائیں ہیں۔[۱]

موجودہ صحیفہ سجادیہ میں ۵۴ دعائیں ہیں۔ کچھ محققین نے مختلف کتابوں سے امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کے کئی دوسرے مجموعے مرتب کئے ہیں چنانچہ شیخ حر عاملی نے **الصحیفة السجادیة الثانیة** میرزا عبداللہ آفندی نے **الصحیفة السجادیة الثالثة**، محدث نوری نے **الصحیفة السجادیة الرابعة** اور سید محسن عاملی نے **الصحیفة السجادیة الخامسة** مرتب کیا ہے۔[۲]

مرحوم شیخ آغا بزرگ تہرانی نے صحیفہ سجادیہ کی تقریباً پچاس شروح کی نشاندہی کی ہے۔[۳]

۱۔ اعیان الشیعہ ج ۱، ص ۶۳۸ ۔ فتح الابواب ص ۷۶

۲۔ الرسائل الرجالیہ ص ۵۶۱ ۔ ۶۲۰ ۔

محمد علی ابطحی نے صحیفہ سجادیہ کے آخر میں اس کی اسناد اور اجازات پر مفصل بحث کی ہے۔

۳۔ الذریعہ ج ۱۳، ص ۳۴۶ ۔ ۳۵۹

شیعہ حدیث کی تشکیل بصورت ''اصول اربعمائۃ''

''اصول اربعمائۃ'' یا چار سو اصول کے نام کا اطلاق مخطوطات حدیث کے اس مجموعے پر ہوتا ہے جس کی تدوین ائمہ طاہرینؑ بالخصوص امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے عہد امامت میں ہوئی تھی اور یہی مجموعہ بعد میں شیعوں کی جوامع حدیث کا بنیادی ماخذ ثابت ہوا۔

ابتدائی جوامع احادیث کا انحصار انہی ''اصول اربعمائۃ'' پر تھا اس لیے انھیں جوامع حدیث کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

لفظ ''اصل'' اور ''کتاب'' کے مفہوم میں فرق

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ لفظ ''اصل'' کے مفہوم کے متعلق اہل دانش متفق القول نہیں ہیں۔ شاید پانچویں صدی اور اس کے بعد کی یہ بحث بہت سے ابہام کے جنم لینے کا باعث بنی۔ اس لیے اس کے مفہوم کے متعلق دو بنیادی نظریات سامنے آئے:

(۱) علماء کا ایک گروہ لفظ ''اصل'' کو کتاب کا مترادف قرار دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ لفظ ''اصل'' کے اور ''تصنیف'' کا مفہوم مساوی ہے۔

اس نظریے کے دفاع میں علامہ شوستری لکھتے ہیں:

متقدمین لفظ ''اصل'' اور ''کتاب'' کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا کرتے تھے مثلاً شیخ طوسی، احمد بن میثم کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے حمید بن زید سے کتاب ملاحم، کتاب دلالت اور دوسرے اصول کو نقل کیا ہے۔

اسی طرح احمد بن سلمہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ حمید بن زیاد نے ان سے بہت سے اصول منجملہ کتاب زیاد بن مروان قندی کو روایت کیا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ طوسی نے اپنی گفتگو میں کبھی ''اصل'' کی جگہ ''کتاب'' اور کہیں ''کتاب'' کی جگہ ''اصل'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔[1]

(۲) پہلے نظریے کے برعکس بہت سے علماء کہتے ہیں کہ لفظ اصل اور کتاب میں عام و خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے اس بنیاد پر ''اصل'' وہ کتاب ہے جو

(الف) معصوم کی عبارتوں پر مشتمل ہو جبکہ کتاب وہ مجموعہ ہے جس میں مؤلف کا استدلال بھی شامل ہو۔

(ب) ''اصل'' دوسری کتاب سے ماخوذ نہیں ہوتی جبکہ کتاب کسی ''اصل'' سے ماخوذ ہو سکتی ہے۔[2]

اس نظریے کے مطابق ''اصل'' درحقیقت ''کتاب'' کی ایک مخصوص قسم ہے۔ اس تناظر میں ''اصل'' کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔ اصل اُس اولین اور نادر نسخے کو کہا جاتا ہے کہ جس میں روایاتِ معصومینؑ کو بغیر کسی کمی بیشی اور تصرف کے تحریر کیا گیا ہو۔ اس طرح کے اصول کی موجودگی سے یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ اور ان کے اصحاب، حدیث کی حفاظت اور کتابت کا کتنا اہتمام کیا کرتے تھے۔

شیخ بہائی نے کسی بھی روایت کے ''اصول اربعمأۃ'' میں موجود ہونے کو اس کی صحت کے جملہ قرائن میں سے ایک قرینہ قرار دینے کے بعد اس اصول کی اصالت کے دفاع میں لکھا ہے کہ ہم سے مشائخ حدیث نے بیان کیا ہے کہ صاحبان اصول کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ ائمہ اہل بیتؑ سے کوئی حدیث سنتے تو فوراً اسے اپنے اصول میں لکھ لیتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ سے اس کا کچھ حصہ یا مکمل حدیث فراموش ہو جائے۔[3]

کچھ روایات میں ہے کہ جب اصحاب ائمہ طاہرینؑ کی احادیث کو اصول میں لکھ لیتے تھے تو ائمہ خود اصول کے کچھ حصوں پر نظرِ ثانی کیا کرتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں اصلاح کرا دیتے تھے۔ یہ بات بذاتِ خود ان اصول کی صحت و اعتبار کو بڑھاوا دیتی ہے۔[4]

''اصول اربعمأۃ'' کی تالیف اور جمع آوری کب ہوئی اور کن ائمہ طاہرینؑ کی احادیث ان

۱۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۴۷ بحوالہ قاموس الرجال ج ۱، ص ۶۵

۲۔ ایضاً ۴۶۔ ۴۷

۳۔ الذریعہ ج ۲، ص ۱۲۶

۴۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸، صفحات ۵۹، ۶۰، ۷۱، ۷۳۔۔۔

اصول میں موجود ہیں اس بارے میں اہل نظر میں اختلاف ہے۔ کچھ علمائے شیعہ جیسے شہید اول، محقق حلی، (شیخ بہائی کے والد) شیخ حسین عبدالصمد اور محقق داماد وغیرہ کہتے ہیں کہ اس مجموعے کو امام جعفر صادقؑ کے چار سو اصحاب نے آپ کی احادیث سے مرتب کیا تھا یا حضرت نے مختلف سوالوں کے جو جوابات دیئے تھے یہ مجموعہ ان جوابات پر مشتمل تھا۔

شہید اول لکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے جوابات سے چار سو مؤلفین نے چار سو رسائل مرتب کئے تھے۔[1]

محقق حلی کہتے ہیں کہ صرف امام جعفر صادقؑ کے جوابات سے چار سو اصحاب نے چار سو کتابیں تالیف کی تھیں اور انہی کتابوں کو ''اصول اربعمأة'' کہا جاتا ہے۔[2]

امین الاسلام طبرسی فرماتے ہیں کہ ان چار سو کتابوں میں امام جعفر صادقؑ کے علاوہ امام موسیٰ کاظمؑ کے جوابات بھی شامل تھے۔[3]

اس کے مقابلے میں کچھ اور علماء یہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ رسائل میں حضرت علیؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک گیارہ ائمہ طاہرینؑ کی احادیث شامل تھیں۔ البتہ اصول اربعمأة کا زیادہ تر حصہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی تعلیمات اور روایات پر مشتمل ہے۔

فاضل دربندی رقم طراز ہیں کہ علمائے امامیہ نے حضرت علیؑ کے دَور سے لے کر امام حسن عسکریؑ کے زمانے تک احادیث کی چار سو کتابیں لکھیں جو ''اصول اربعمأة'' کے نام سے مشہور ہیں۔[4]

''اصول اربعمأة'' کی تاریخ

تاریخی بیانات سے پتا چلتا ہے کہ اصول اربعمأة شیعوں کی ابتدائی جوامع کے مؤلفین یعنی ''محمدون ثلاثہ'' (وہ تین علماء جن کے نام محمد[5] تھے) تک موجود تھی اور انھوں نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ ان میں سے کچھ رسائل محمد بن ادریس حلی (متوفی ۵۹۸ھ)، سید ابن طاؤوس (متوفی ۶۷۳ھ)،

---

۱ تا ۳۔ الذریعہ ج ۲، ص ۱۲۹

۴۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۴۸ بحوالہ القوامیس ص ۴۷

۵۔ یعنی ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی، شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی

شہید ثانی (متوفی ۹۶۶ھ)، شیخ کفعمی (متوفی ۱۱۰۴ھ) اور میرزا حسین نوری (متوفی ۱۳۲۰ھ) کے زمانے تک باقی تھے اور مذکورہ علماء نے ان رسائل سے براہ راست استفادہ بھی کیا تھا۔[۱]

شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب ''الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ'' میں تاریخ اور رجال کے منابع جیسے رجال نجاشی، فہرست شیخ طوسی، معالم العلماء ابن اشہر آشوب اور فہرست کی دیگر کتابوں سے اصول اربعمأۃ کے ۱۲۲ اصول کی فہرست نقل کی ہے۔[۲]

اس وقت ان چار سو رسائل میں سے سولہ رسالے باقی ہیں۔ چنانچہ مرحوم حسن مصطفوی نے ان کے مجموعے کو ''الاصول الستۃ عشر'' کے نام سے شائع کرایا ہے۔

آغا بزرگ تہرانی کہتے ہیں کہ ''اصول اربعمأۃ'' کے ناپید ہونے کی دو اہم وجوہات یہ ہیں:

(۱) جب حدیث کی ابتدائی جوامع منظر عام پر آئیں تو علماء کی توجہ اصول اربعمأۃ سے ہٹ گئی کیونکہ اصول اربعمأۃ کی روایات ان جوامع میں نقل کی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں تنظیم وتبویب کے فقدان کی وجہ سے اصول اربعمأۃ سے براہ راست رجوع کرنا مشکل تھا اس لیے علماء نے جوامع کو ہی ترجیح دی۔

(۲) ۴۴۸ھ میں کچھ متعصب اہل سنت نے بغداد میں شیخ طوسی کے کتب خانے کو نذر آتش کر دیا جس کی وجہ سے ''اصول'' میں شمار کی جانے والی بہت سی کتابیں جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔[۳]

۱۔ الذریعہ ج ۲، ص ۱۳۴ - ۱۳۵

۲۔ ایضاً ۱۳۵ - ۱۶۷

۳۔ پژوہشی در تاریخ حدیث شیعہ ص ۱۹۵

شیعہ حدیث کے ابتدائی جوامع کی تدوین کا دور

حدیثِ شیعہ کی تاریخ کے دوسرے دور میں ائمہ طاہرینؑ کے اصحاب نے امام حسن عسکریؑ تک کے ائمہ کی میراثِ حدیث کو اصول حدیث کے قالب میں ڈھالا محفوظ کرلیا۔

ائمہ اہل بیتؑ کے اصحاب میں سے ہر صحابی نے اپنی قابلیت اور ائمہ طاہرینؑ کی محفلوں میں حاضری کے حساب سے روایات ائمہ کو جمع کیا۔ اگر بعض محدثین مثلاً حمید بن زیاد، یونس بن عبدالرحمان، محمد بن یحییٰ وغیرہ نے ان اصول کو منظم کر کے جامع اور ان اصول کے بعض حصوں کو مرتب کیا لیکن تمام روائی اصول تک دسترس نہ ہونے اور ائمہ سے بعض روایات کے صدور کا زمانہ معلوم نہ ہونے نیز بعض مخصوص روایات مثلاً احکام کی روایات پر ان کی زیادہ توجہ مرکوز ہونے کی وجہ سے جوامع مرتب کرنے میں انھیں چنداں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

دوسری طرف امام زمانہ کی غیبت صغریٰ کے دوران اور غیبت کبریٰ کے ابتدائی ایام میں شیعی معاشرے کی وسعت اور ترقی کی وجہ سے شیعہ علماء و فقہاء اور متکلمین و مفسرین کو میراثِ حدیث کی تدوین کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا کیونکہ بکھری ہوئی میراثِ حدیث کی وجہ سے فقہی اور کلامی نگارشات میں اختلافات سامنے آرہے تھے لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ حدیث شیعہ کے جوامع مرتب کئے جائیں۔

اس ضرورت کو ثقۃ الاسلام کلینی (متوفی ۳۲۹ھ)، شیخ صدوق (متوفی ۳۸۱ھ) اور شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے ابتدائی جوامع کی تدوین کے ذریعے پورا کیا اور ''کافی''، ''من لایحضرہ الفقیہ''، ''مدینۃ العلم''، اور ''تہذیب'' و ''استبصار'' جیسی کتابیں لکھی گئیں۔

البتہ ان بزرگوں سے پہلے احمد بن محمد بن خالد برقی (متوفی ۲۷۴ھ)، محمد بن صفار (متوفی ۲۹۰ھ)، حمیدی قمی (متوفی ۳۰۰ھ) نے بالترتیب، المحاسن، بصائر الدرجات اور قرب الاسناد جیسی کتابیں تحریر کی تھیں۔

علاوہ ازیں "محمدون ثلاثہ" کے دور میں ان بزرگوں اور دیگر محدثین کی کاوش سے عیون اخبار الرضا، الخصال اور الامالی جیسی کتابیں شیخ صدوق کے قلم سے منظرِ عام پر آئیں اور "الغیبۃ" اور "الاقتصاد" نامی کتابیں شیخ طوسی کے ذریعے منصۂ شہود پر آئیں۔ مذکورہ پانچ کتابیں اپنی جامعیت، اتقانِ سند اور متن روایات کی وجہ سے اگلی صدیوں کے شیعہ علماء کی توجہ کا مرکز قرار پائیں اور آہستہ آہستہ انھیں حدیث شیعہ میں "کتب خمسہ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ پھر جب کتاب "مدینۃ العلم" مفقود ہوئی تو شیعہ احادیث کے مجموعے کو "کتب اربعہ" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

کتب اربعہ کا تعارف

پہلی کتاب: کافی

ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ) کو ثقۃ الاسلام اور رئیس المحدثین کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ "رے" کے ایک گاؤں "کلین" میں پیدا ہوئے۔[۱] آپ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر آپ کی پیدائش کا سال معلوم نہیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ امام زمانہؑ کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے یا کچھ عرصہ بعد میں پیدا ہوئے۔ امام زمانہؑ کی ولادت باسعادت ۲۵۵ھ میں ہوئی تھی۔

شیخ کلینی نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے کوفہ، بغداد، دمشق اور بعلبک کا سفر کیا لیکن آپ کے زمانۂ طالب علمی کے حالات معلوم نہیں مگر تحصیل علم کے بعد آپ کو "رے" میں شیخ شیعہ اور شیعیت کا نامور چہرہ کہا جانے لگا۔[۲] "کافی" کی تالیف کے بعد اپنی شہرت کے زمانے میں وفات سے ایک یا دو سال قبل یعنی ۳۲۷ھ میں آپ بغداد تشریف لے گئے اور وہاں حدیث کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے بیس سال کے عرصے میں "کافی" مرتب کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے "کافی" کی تدوین رے اور قم میں کی تھی۔[۳]

۱۔ یہ گاؤں رے شہر کے جنوب مغرب میں ۳۸ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔
دیکھیے: معجم البلدان ج ۴، ص ۳۰۳ بحوالہ مقدمہ کافی ج ۱، ص ۹

۲۔ رجال نجاشی ص ۲۶۶

۳۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۶۳

آپ نے اپنے دَور کے مشہور محدثین سے کسب فیض کیا تھا۔ حدیث میں آپ کے اساتذہ میں علی بن ابراہیم قمی، محمد بن یحییٰ عطار، ابو علی اشعری، حسین بن محمد، احمد بن ادریس، ابن فروخ صفاری اور ابن عقدہ سرفہرست ہیں لیکن آپ کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے اساتذہ میں سے علی بن ابراہیم (صاحب تفسیر قمی) اور محمد بن یحییٰ سے زیادہ متاثر تھے۔ شیخ کلینی کے شاگردوں میں ابو القاسم جعفر بن قُولَوَیہ (متوفی ۳۶۷)، ابو محمد ہارون بن موسیٰ تَلعُکبری (متوفی ۳۸۵ھ)، ابو غالب احمد بن محمد زراری (متوفی ۳۶۸) بہت مشہور ہیں۔ آپ کے یہ شاگرد علم حدیث، علم رجال اور علم فقہ میں اپنی مثال آپ تھے۔[1]

مرحوم کلینی نے ''کافی'' کے علاوہ درج ذیل کتابیں بھی لکھی تھیں:

(۱) تعبیر الرؤیا (۲) الرد علی القرامطۃ (۳) رسائل الائمہ (۴) کتاب الرجال[2]

مرحوم کلینی نے کافی کو جس منظم انداز میں مرتب کیا ہے یہ روایات میں ان کے حسن انتخاب، ابواب کے عناوین کے چناؤ اور روایات کے ساتھ ان کے علم کلام پر مبنی نظریات نیز ان کی علم حدیث، علم فقہ اور علم کلام پر صاحب نظر ہونے کا بین ثبوت ہے۔

علم حدیث کا یہ روشن چراغ ۳۲۸ھ یا ۳۲۹ھ میں گل ہوگیا اور انھیں بغداد میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات کے برسوں بعد ان کی قبر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی لیکن لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا جسد خاکی بدستور تر و تازہ تھا اور ان کا کفن بھی بوسیدہ نہیں ہوا تھا۔ اس واقعہ سے بغداد کا ایک متعصب حاکم خاصا متاثر ہوا اور اس نے آپ کی قبر پر گنبد تعمیر کرایا۔[3]

کافی، شیعہ حدیث کی اہم ترین کتاب ہے۔ بہت سے علماء کا بیان ہے کہ دنیائے اسلام میں آج تک اس کی ہم پایہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ کافی کی اصول پر دو اور فروع پر چار جلدیں ہیں۔ روضۂ کافی ایک جلد پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۰ کتابیں اور ۳۲۶ ابواب ہیں۔ اس میں کل ۱۶۱۹۹ احادیث ہیں۔[4]

۱۔ الکلینی والکافی ص ۵۲۔ علم حدیث ص ۲۶۱ ـ ۲۶۳

۲۔ الفہرست ص ۲۱۰۔ الکنٰی والالقاب ج ۳، ص ۱۲۱

۳۔ الکلینی والکافی ص ۱۶۳

۴۔ کافی کی روایات کی تعداد ۱۵۱۷۶، یا ۱۶۰۰۰ یا ۱۶۱۲۱ بھی بیان کی گئی ہے مگر بیشتر اہل نظر کہتے ہیں کہ کافی میں کل ۱۶۱۹۹ روایات ہیں۔ دیکھئے: مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۶۵

علمائے متاخرین کی تحقیق کے مطابق کافی میں ۵۰۷۲ صحیح، ۱۴۴ حسن، ۱۱۱۸ مؤثق اور (60%) یعنی ۹۴۸۵ احادیث ضعیف ہیں۔[1]

لگتا ہے کہ شیخ کلینی نے اپنی کتاب کا نام کافی نہیں رکھا تھا کیونکہ انھوں نے مقدمہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا البتہ یہ جملہ ضرور لکھا ہے: **وقلت انك تحب ان يكون عندك كتاب كاف يجمع فيه من جميع فنون علم الدين ما يكتفي به المتعلم ويرجع اليه المسترشد** تم نے کہا ہے تم چاہتے ہو کہ تمہارے پاس کفایت کرنے والی ایسی کتاب ہو جس میں علم دین کے جملہ فنون جمع ہوں جو طالب علم کے لیے کافی ہوں اور ہدایت کا طلبگار اس کی طرف رجوع کر سکے۔ (مقدمہ کافی ج ۱، ص ۹)

مذکورہ بالا عبارت میں مؤلف نے یہ بتایا ہے کہ ان کا مقصد ایک ایسی کتاب کی تدوین ہے جو مومنین کی دینی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو۔ (پژوہشی در تاریخ حدیث شیعہ ص ۴۷۰)

بہت سے محققین کا بیان ہے کہ کافی کی تدوین میں شیخ کلینی کو بیس سال لگے۔ تدوین میں اتنا طویل عرصہ لگنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے روایات کے انتخاب اور احادیث کی تنظیم وتبویب اور ابواب وفصول قائم کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ (مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۹۳)

مرحوم کلینی نے کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب ایک دینی بھائی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس شخص کا نام سو فیصد معلوم نہیں البتہ ایک احتمال یہ ہے کہ وہ محمد بن احمد بن عبداللہ بن قضاعہ صفوانی یا پھر محمد بن نعمانی تھے۔ (پژوہشی در تاریخ حدیث شیعہ ص ۴۷۰)

۱۔ ایضاً بحوالہ لؤلؤۃ البحرین ص ۳۹۴۔ مرآۃ العقول ج ۲، ص ۳۴۷۔ گزیدہ کافی ج ۱، ص ۲۱۔ الذریعہ ج ۱۷، ص ۲۴۵

حضرت آیت اللہ ابو القاسم موسوی خوئی نے معجم رجال الحدیث جلد اول میں لکھا ہے کہ شیخ صدوق کے نزدیک اصول کافی میں صحیح اور غیر صحیح روایات کے علاوہ کذابوں اور جعل سازوں کی روایات بھی موجود ہیں۔

الشافی ترجمہ اصول کافی جلد اول مترجمہ جناب مولانا سید ظفر حسن نقوی امروہوی، مطبوعہ جنوری ۱۹۷۷ء کے ''مقدمہ'' میں علامہ محمد حسین صاحب پرنسپل دار العلوم محمدیہ، سرگودھا لکھتے ہیں کہ ہر وہ خبر جو **عند المتاخرین** صحیح ہے وہ **عند المتقدمین** بھی صحیح ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو خبر **عند المتقدمین** صحیح ہو وہ **عند المتاخرین** بھی صحیح ہو۔ بنابریں کافی کی تمام احادیث **عند المتقدمین** صحیح ہیں مگر متاخرین کے نزدیک کچھ احادیث صحیح ہیں، کچھ حسن، کچھ مؤثق اور کچھ ضعیف ہیں۔

معاصر دانش مند شیخ محمد باقر بہبودی نے الکافی میں سے ضعیف احادیث کی تخریج کی ہے۔ یہ کتاب صحیح الکافی کے نام سے پہلی بار ۱۹۸۱ء میں دار الاسلامیہ، بیروت سے تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۴۴۲۸ احادیث ہیں۔

علامہ ہاشم معروف حسنی نے بھی اپنی کتاب **دراسات الکافی للکلینی والصحیح للبخاری** میں لکھا ہے کہ ''علمائے شیعہ اصول کافی کی نصف روایتوں پر اعتماد نہیں کرتے۔'' (رضوانی)

کلینی نے فرمائش کرنے والے اُس دینی بھائی کی درخواست کو یوں بیان کیا ہے:

برادر! آپ نے اہل زمانہ کی جو شکایت کی ہے میں اس سے آگاہ ہوا کہ ان لوگوں نے جہالت پر ایکا کر لیا ہے اور جہالت کے راستے کو آباد رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دست تعاون بڑھا دیئے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ علم ان سے رخصت ہونے کے قریب ہے...آپ نے یہ کہا ہے کہ دین کے مطالب آپ کے لیے مشکل ہو چکے ہیں اور روایات میں اتنا اختلاف پیدا ہو چکا ہے کہ آپ ان کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور آپ نے یہ جان لیا ہے کہ روایت کے اختلاف کا تعلق اس کے علل واسباب کے اختلاف سے ہے اور اس سلسلے کے ماہر کسی با اعتماد آدمی تک آپ کی رسائی نہیں ہے جس سے آپ بحث وگفتگو کر سکیں اور آپ نے کہا ہے کہ میری خواہش ہے کہ میرے پاس ایک ایسی کتاب ہو جس میں علم دین کی پوری معلومات موجود ہوں اور وہ طالب علم کو بے نیاز کر دے اور ہدایت طلب کرنے والے کے لیے مرجع ہو اور جو شخص سچے ائمہ کی صحیح احادیث اور قابل عمل سنت کو سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو وہ اس کتاب سے رہنمائی حاصل کر سکے اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے واجبات اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے میں معاون ثابت ہو۔[1]

اس خط سے ثقۃ الاسلام شیخ کلینی کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ اس کتاب کی تدوین سے منتشر شیعی روایات ایک کتاب میں جمع ہوں تا کہ دینی اختلافات کو مزید پھیلنے سے روکا جا سکے۔

کافی کی خصوصیات

(۱) جامعیت

کافی کی پہلی خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ اگر اس کتاب کا کسی بھی کتاب حدیث حتیٰ کہ ابتدائی جوامع حدیث مثلاً من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب اور استبصار سے موازنہ کیا جائے تب بھی کافی ان کتابوں سے زیادہ جامع دکھائی دے گی کیونکہ اس کتاب میں شیخ کلینی نے صرف احکام اور فروع سے متعلق احادیث جمع نہیں کی ہیں بلکہ ابتدائی دو جلدوں میں اصول اور عقائد سے متعلق روایات بھی جمع کی ہیں جو دین شناسی پر مشتمل ہیں۔ یہ درست ہے کہ شیخ صدوق اور شیخ طوسی نے فروع کے ساتھ ساتھ

۱۔ مقدمہ کافی ج ۱، ص ۹

اصول پر مشتمل روایات جمع کی تھیں مگر شیخ کلینی نے جس وسیع پیمانے پر اس کا اہتمام کیا اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اسی لیے مرحوم فیض کاشانی نے دوسرے جوامع احادیث پر یہ کہہ کر تنقید کی ہے کہ ان کے مؤلفین نے اصول دین کے بیان میں غفلت برتی ہے جبکہ شیخ کلینی نے اصول سے متعلق احادیث کی تدوین پر خصوصی توجہ دی ہے۔[۱]

(۲) قابل تحسین انتخاب

یہ بات نہایت ہی قابل توجہ ہے کہ شیخ کلینی وہ پہلے محدث ہیں جنھوں نے جامع احادیث کی تدوین و تنظیم کی تھی۔ ان سے پہلے ایسا کوئی نمونہ دکھائی نہیں دیتا جو قابل استفادہ ہو۔ ایسے میں جب ہم کافی کے ابواب و فصول پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کی منطقی ترتیب دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے اس میں اصول کو فروع پر مقدم رکھ کر اور آخر میں ''روضہ'' کا الحاق کر کے اپنے حسن سلیقہ اور حسن انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔ اصول کافی میں انھوں نے سب سے پہلے کتاب العقل والجہل کو رکھا، اس کے بعد کتاب فضل العلم کو رکھا، پھر کتاب التوحید کو رکھا اور اس میں توحید سے متعلق روایات کو جمع کیا۔ اس کے بعد کتاب الحجۃ کو رکھا۔ اس طرح تبویب میں انھوں نے ترتیب کا پورا پورا خیال رکھا کیونکہ اصول اور فروع کی تمام روایات کی بنیاد عقل پر ہے جو انسان کو حیوانات، نباتات اور جمادات سے ممتاز کرتی ہے اور عقل کو علم سے تقویت اور راہ ملتی ہے۔

عقل اور علم کے بعد خدا شناسی کی نوبت آتی ہے۔ شیخ کلینی نے نبوت اور امامت کی روایات کو کتاب الحجۃ کے ایک ہی نام سے جمع کیا کیونکہ خدا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرینؑ کو اپنی حجت بنا کر لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

کتاب کے باقی ابواب اور فصول میں بھی اسی طرح کی مناسب ترتیب دکھائی دیتی ہے۔ کافی کی بہت زیادہ شروح لکھی گئی ہیں لیکن ان میں علامہ مجلسی کی مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسول اور ملا صدرا کی شرح اور ملا صالح مازندرانی کی شرح کو اہم ترین شروح شمار کیا جاتا ہے۔

۱۔ وافی ج ۱، ص ۵

''روضہ'' کے کلینی کی طرف انتساب کی تحقیق

کافی کی تمام مجلدات کلینی کی تالیف کردہ ہیں۔ آج تک کسی نے اس پر شک کا اظہار نہیں کیا البتہ ملا خلیل قزوینی کا کہنا ہے کہ ''روضہ'' شیخ کلینی کی بجائے ابن ادریس حلی کی تالیف ہے اور اسے غلط طور پر شیخ کلینی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حدیث شناس علماء اُن کے اس نظریے کی تردید کرتے ہیں اور اس کے لیے حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

(۱) کافی کی روایات میں جو اسناد بیان کی گئی ہیں وہی اسناد روضہ کی روایات میں بیان کی گئی ہیں۔ شیخ کلینی نے براہ راست جن شیوخ سے روایات نقل کی ہیں اُن کا تعلق محدثین کے آٹھویں یا نویں طبقے سے ہے اور خود شیخ کلینی کا تعلق نویں طبقے سے ہے جبکہ ابن ادریس حلی کا تعلق محدثین کے پندرہویں طبقے سے ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پندرہویں طبقے سے تعلق رکھنے والے ابن ادریس حلی کسی واسطے کے بغیر براہ راست آٹھویں طبقے سے روایت کریں؟

(۲) روضہ کی روایات کی اسناد بعینہٖ وہی ہیں جو اصول کافی اور فروع کافی کی روایات کی اسناد ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روضہ کا مؤلف بھی وہی ہے جو اصول کافی اور فروع کافی کا مؤلف ہے۔

(۳) نجاشی اور شیخ طوسی، ابن ادریس حلی سے کئی برس پہلے گزرے ہیں اور وہ ''روضہ'' کو کلینی کی تالیف قرار دیتے تھے۔ اگر ''روضہ'' ابن ادریس حلی (متوفی ۵۹۸ھ) کی تالیف ہوتی تو نجاشی اور شیخ طوسی اس کتاب کی تالیف سے پہلے اس سے کیسے آگاہ ہو گئے تھے؟[۱]

دوسری کتاب: من لا یحضرہ الفقیہ

ابو جعفر محمد بن علی بن بابویہ قمی المعروف شیخ صدوق (متوفی ۳۸۱) کا شمار چوتھی صدی ہجری کے چوٹی کے محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش کا سال حتمی طور پر معلوم نہیں البتہ عام طور پر خیال ہے کہ آپ ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔[۲] شیخ صدوق کے والد محترم مذہب امامیہ کے مشہور محدث تھے۔ نجاشی کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں حوزۂ علمیہ قم کے بہت بڑے عالم اور محدثین کے سرخیل تھے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: الکلینی والکافی ص ۴۰۸۔ ۴۱۵۔ الذریعہ ج ۱۱ ص ۳۰۲

۲۔ مقدمہ معانی الاخبار ص ۷۲۔ ۷۳

امام زمانہ کی طرف سے ان کے نام جو توقیع مبارک جاری ہوئی تھی اس میں امام علیہ السلام نے انھیں یاشیخی و معتمدی و فقیھی... کے القابات سے یاد کیا ہے۔ اس سے اُن کے علمی اور معنوی مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[1] انھوں نے اپنے بیٹے شیخ صدوق کو خود ابتدائی تعلیم دی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد شیخ صدوق ۳۲۹ھ میں محمد بن حسن احمد بن ولید کی مجلس درس میں شریک ہوئے اور پندرہ سال تک اُن سے کسب فیض کرتے رہے۔ شیخ صدوق اپنے والد کا بے حد احترام کرتے تھے اس کے باوجود بارہا انھوں نے اپنے شیخ کی رائے کو اپنے والد کی رائے پر ترجیح دی۔ مذکورہ دو محدثین کے علاوہ شیخ صدوق نے محمد بن علی بن ماجیلویہ، محمد بن موسیٰ بن متوکل اور احمد بن محمد بن یحییٰ عطار جیسے مشاہیر علماء سے کسب فیض کیا۔[2]

شیخ صدوق کے زمانے میں آلِ زیاد اور آلِ بُویہ کی حکومت تھی جو شیعہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شیخ صدوق کا چرچا ہوا تو ان حکمرانوں نے اُن کی سرپرستی کی اور آپ نے آل بُویہ کے دانش مند وزیر صاحب بن عبّاد کی درخواست پر ''عیون اخبار الرضا'' تحریر فرمائی۔[3]

آپ کے شاگردوں میں سے حسین بن عبیداللہ غضائری، (نجاشی کے والد) علی بن احمد بن عباس نجاشی، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، شیخ مفید اور ہارون بن موسیٰ تلعکبری بہت مشہور ہیں۔[4] اس سے آپ کی علمی عظمت کا پتا چلتا ہے کہ شیخ مفید اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ جیسے نامور شیعہ علماء آپ کے شاگرد تھے۔

شیخ صدوق کی کتابوں کی تعداد دو سو پچاس تک بیان کی جاتی ہے۔[5] ان کتابوں کے متنوع مضامین اور موضوعات سے شیخ صدوق کے تبحر علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ شیخ صدوق کی اکثر کتابیں مرور زمانہ اور مختلف حادثات کی نذر ہو چکی ہیں۔

۳۸۱ھ میں علم و دانش کا یہ سورج شہر ''رَے'' میں غروب ہوگیا اور آپ کو یہیں دفن کیا گیا۔ پھر ۱۲۳۸ھ میں فتح علی شاہ کی حکومت کے زمانے میں جب آپ کی قبر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تو لوگوں

۱۔ الکنیٰ والالقاب ج ۱، ص ۲۲۲

۲۔ مقدمہ معانی الاخبار ص ۳۶

۳۔ پژوہشی در تاریخ حدیث شیعہ ص ۴۹۹۔۵۰۰

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مقدمہ معانی الاخبار ص ۶۸۔۷۲۔ وہاں شیخ صدوق کے ۲۷ نامور شاگردوں اور ان سے روایت کرنے والے راویوں کے نام درج ہیں۔

۵۔ مقدمہ معانی الاخبار ص ۸۲

نے دیکھا کہ آپ کا جسم تر و تازہ تھا نیز آپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور نہ آپ کے ناخنوں پر لگی مہندی اتری تھی۔ اس سے لوگوں کی نظر میں آپ کے معنوی اور علمی مقام میں مزید اضافہ ہوا۔[۱]

آپ کی کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' جسے ''من لا یحضر'' یا ''فقیہ'' بھی کہا جاتا ہے، شیعوں کی معتبر ترین جامع حدیث شمار ہوتی ہے اور اسے ''کافی'' کے بعد حدیث کی جامع ترین کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں احکام سے متعلق روایات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں مجموعی طور پر ۵۹۹۸ احادیث ہیں اور اس کے ابواب کی تعداد ۶۶۶ ہے۔ اس میں ۳۹۴۳ روایات مسند (یعنی سند کے ساتھ) اور ۲۰۵۵ روایات مرسل (یعنی بے سند) بیان ہوئی ہیں۔[۲] اس کتاب میں روایات کو فقہی ابواب کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے مثلاً پہلے باب میں پانی کے احکام کے متعلق طہارت و نجاست پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد بیت الخلاء کے احکام پھر بالترتیب غسل، تیمم اور مُردوں کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد احکام نماز کے ابواب ... وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔ من لا یحضرہ الفقیہ کی باقی جلدوں میں بھی اسی ترتیب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

شیخ صدوق نے اس کتاب کی غرض تالیف بیان کرتے ہوئے آغاز میں لکھا ہے:

جب دست قضا مجھے شہر بلخ کے گاؤں ''ایلاق'' لے گیا تو وہاں امام موسیٰ کاظمؑ کی اولاد سے تعلق رکھنے والے سید شریف الدین ابو عبداللہ جو نعمت کے نام سے مشہور ہیں، تشریف لائے۔ اُن کی ہم نشینی سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور اُن کی باتوں سے میرے سینے میں کشادگی پیدا ہوئی اور میں اُن کی محبت اور دوستی سے بہرہ مند ہوا... انھوں نے مجھے بتایا کہ مشہور طبیب محمد بن زکریا رازی نے طب کے موضوع پر ''من لا یحضرہ الطبیب'' نامی کتاب لکھی ہے اور وہ ایک کتاب انتہائی اچھی اور جامع کتاب ہے۔

انھوں نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی حلال و حرام اور شرائع و احکام پر ایک ایسی جامع کتاب لکھوں جو لوگوں کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر سکے اور انھوں نے اس کتاب مستطاب کا نام ''من لا یحضرہ الفقیہ'' (یعنی یہ کتاب اُس شخص کے لیے ہے جو فقیہ کے حضور میں نہ ہو) تجویز کیا۔[۳]

۱۔ مقدمہ معانی الاخبار ص ۷۵

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ کی طبع جدید میں استاد علی اکبر غفاری کی تحقیق کے مطابق روایات کی تعداد ۵۹۲۰ ہے۔
مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۶۸

۳۔ من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱، ص ۲

اس مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صدوق نے یہ کتاب نعمت نامی اپنے مہربان دوست کی فرمائش پر لکھی تھی جن کے اخلاق سے وہ متاثر تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں صرف ایسی روایات نقل کی ہیں جو ان کے فتاویٰ کے مطابق ہیں جیسا کہ انھوں نے مقدمے میں ہی اس کی وضاحت یوں کی ہے:

میری یہ عادت نہیں کہ دوسرے مصنفین کی طرح ہر قسم کی روایات نقل کروں۔ میں صرف ان روایات کو نقل کرتا ہوں جو میرے فتوے کے مطابق ہیں اور جنھیں میں صحیح سمجھتا ہوں۔[۱]

شیخ صدوق نے "فقیہ" میں آخری راوی کے علاوہ باقی اسناد روایات کو حذف کر دیا ہے اور ان راویوں تک اپنی سند کو کتاب کے آخر میں "مشیخہ" کے عنوان سے بیان کر کے اس کی تلافی کی ہے۔

ملا محمد تقی مجلسی (مجلسی دوم) نے عربی اور فارسی میں اس کتاب کی دو شرحیں لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) **روضۃ المتقین فی شرح اخبار الائمۃ المعصومین**

(۲) **لوامع صاحبقرانی**

تیسری کتاب: تہذیب الاحکام

شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی جنھیں "شیخ الطائفہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، ۳۸۵ھ میں خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوئے۔[۲] تیئیس برس کی عمر تک آپ نے ایران میں کہاں کہاں تعلیم حاصل کی تاریخ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا البتہ یہ بات طے ہے کہ اس وقت ایران پر آل بُویہ کی حکومت تھی اور ان کی سرپرستی میں خراسان، قم، رَے اور دیگر شہروں میں درس گاہیں قائم تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ طوسی نے کچھ تعلیم اپنے شہر میں یا ایران کے دوسرے حوزات علمیہ سے حاصل کی ہوگی۔ پھر آپ ۴۰۸ھ میں بغداد تشریف لے گئے۔[۳]

بغداد، عباسی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ جس وقت شیخ طوسی بغداد پہنچے اس وقت بغداد علم و دانش کا مرکز تھا اور اس کے کتب خانے نادر کتابوں سے بھرے پڑے تھے۔ نیز ہر مذہب و مسلک کے دانشوروں کی موجودگی نے اس شہر کی اہمیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ شیخ طوسی نے بغداد کے شیعہ محلے

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱، ص ۵

۲۔ شیخ آغا بزرگ تہرانی، مقدمہ النہایہ ص ۶

۳۔ خلاصۃ الاقوال ص ۱۴۸۔ مقدمہ النہایہ ص ۶

''کرخ'' میں چالیس سال گزارے۔ بغداد میں آپ نے شیخ مفید سے کسب فیض کیا اور یہیں اپنی کئی مشہور کتابیں لکھیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب شیخ کے لیے بغداد میں رہنا دشوار ہوگیا۔ ۴۴۸ھ یا ۴۴۹ھ میں متعصب سنیوں نے اس وقت کے عباسی خلیفہ ''القائم باللہ'' سے آپ کی شکایت کی مگر خلیفہ نے شیخ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ پھر متعصب سنیوں اور شیعوں کے درمیان فسادات شروع ہوئے اور متعصب سنیوں نے شیخ طوسی کے گھر پر دھاوا بول دیا اور ان کے گھر اور کتب خانے کو نذر آتش کر دیا۔ اس دردناک واقعے سے مجبور ہو کر شیخ طوسی نے بغداد چھوڑ دیا اور نجف اشرف چلے آئے۔ اس وقت نجف ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ آپ نے نجف اشرف میں مستقل سکونت اختیار کی۔[1] شیخ طوسی نے اپنی عمر کے آخری گیارہ برس نجف اشرف میں گزارے۔ آپ کی وجہ سے شیعہ علماء اور طلباء نجف اشرف کا رخ کرنے لگے۔ آپ کی آمد وہاں ہزار سالہ حوزۂ شیعہ کی بنیاد کا باعث بنی اور یہ حوزہ بحمد اللہ آج تک قائم و دائم ہے۔

۴۶۰ھ میں شیخ طوسی نجف اشرف میں انتقال کر گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق انھیں ان کے گھر میں دفن کیا گیا۔[2]

شیخ طوسی کے اساتذہ میں دو عظیم القدر شیعہ علماء یعنی شیخ مفید اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ شامل ہیں جنھیں ''ارکانِ شیعہ'' کہا جاتا ہے۔ ان دونوں علماء کی بلند علمی منزلت ان کی کتابوں کی کثرت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس تناظر میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ طوسی کی علمیت انہی اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ شیخ طوسی، پانچ برس یعنی شیخ مفید کی وفات (۴۱۳ھ) تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ طوسی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے مدرسے میں چلے گئے اور سید مرتضیٰ کے انتقال (۴۳۶ھ) تک ان سے کسب فیض کرتے رہے۔

شیخ طوسی نے بڑی گراں قدر اور جامع کتابیں لکھی ہیں۔ وہ وسیع علمی موضوعات پر دسترس رکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ نجاشی نے جو شیخ طوسی کے معاصر تھے شیخ کی تمیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جبکہ خود شیخ طوسی نے اپنے حالات میں اکتالیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے منابع میں ان کی پچاس سے زائد کتابوں کے نام بیان ہوئے ہیں اور احتمال ہے کہ شیخ کے کچھ آثار ''فہرست'' اور ''تدوین شرح حال''

۱۔ مقدمہ الخلاف ج ۱، ص ۸ ۔ ۹

۲۔ الکنٰی والالقاب ج ۲، ص ۳۹۵

کے بعد منظر عام پر آئے ہوں۔ ''تہذیب'' اور ''استبصار'' جیسی کتابوں کے علاوہ شیخ طوسی نے علم کلام میں ''تلخیص الشافی'' اور ''المفصح والغیبة'' نیز تفسیر میں ''تبیان'' لکھی۔ علم فقہ میں ''نہایہ'' ''مبسوط'' اور ''خلاف'' جیسی کتابیں لکھیں اور علم اصول میں ''العدہ'' اور علم رجال میں ''فہرست'' اور ''اختیار معرفة الرجال'' جیسی معرکۃ الآراء کتابیں تحریر فرمائیں۔[1] تہذیب الاحکام ۱۳۹۸۸ روایات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۹۳ ابواب اور ۲۳ کتابیں ہیں۔ یہ کتاب اتنی جامع ہے کہ اس کی دس جلدوں میں طہارت کے مسائل سے لے کر دیات تک کے احکام کی روایات موجود ہیں۔[2]

عنوان کتاب کے متعلق شیخ طوسی نے لکھا ہے کہ ان کے استاد شیخ مفید نے اپنی کتاب ''مقنعہ'' کے آغاز میں اصول عقائد بیان کئے پھر اپنے فقہی فتاوی کو اسناد روایات اور استدلالی بحث کے بغیر لکھا۔ شیخ طوسی جب پچیس برس کی عمر میں بغداد پہنچے تو انھیں مخالفین کا یہ طعنہ سننا پڑا کہ شیعہ روایات میں تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے۔ شیخ نے ان طعنوں کا جواب دینے کی ٹھانی تو اپنے استاد شیخ مفید کی کتاب ''مقنعہ'' کا انتخاب کیا اور (روایات پر اعتراضات کو دور کرنے کے لیے) ''تہذیب الاحکام'' لکھنا شروع کی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵، ۲۶ برس سے زیادہ نہ تھی۔[3] درحقیقت تہذیب الاحکام، مقنعہ کی روائی شرح ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کے تمام فتوؤں کے مستندات احادیث بیان کئے جیسا کہ بعد میں شیخ حر عاملی نے فقہی کتاب شرائع الاسلام کے فتاوی کے منابع روائی بیان کرنے کے لیے ''وسائل الشیعہ'' لکھی اور شرائع الاسلام کے تمام فتاوی کی مستندات احادیث بیان کئے۔

شیخ طوسی ''تہذیب'' کے آغاز میں اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''میرے کچھ دوستوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا کہ ہمارے اصحاب کی احادیث میں اختلاف، تباین اور تضاد پایا جاتا ہے اور ایک روایت بھی ایسی نہیں جس کی متضاد روایت موجود نہ ہو۔ نیز کوئی بھی حدیث ''تعارض'' سے خالی نہیں۔ یہ چیز ہمارے لیے مخالفین کے طعنوں کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ ایسی کتاب لکھوں جس میں روایات کے باہمی اختلاف و تعارض کی تاویل و توجیہ بیان ہو۔

۱۔ الکنی والالقاب ج ۲، ص ۳۹۵۔ ۳۹۶

۲۔ یہ تعداد جدید ایڈیشن کے مطابق ہے جبکہ سید محسن عاملی اور آغا بزرگ تہرانی کی تحقیق کے مطابق تہذیب الاحکام میں موجود روایات کی تعداد ۱۳۵۹۰ ہے۔ دیکھئے: اعیان الشیعہ ج ۹، ص ۱۶۱۔ الذریعہ ج ۴، ص ۵۰۴

۳۔ مقدمہ معجم بحارالانوار ص ۶۹

میری نظر میں یہ اہم ترین دینی فرض اور قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔'' ۱

شیخ طوسی کی اس بات سے لگتا کہ'' تہذیب الاحکام'' لکھنے کا مقصد ان کے پیش نظر یہ تھا کہ روایات کے اختلاف میں ان کو جمع کرنے کے راستے کی نشاندہی کی جائے کیونکہ روایات کا تعارض صرف دشمنوں کے طعنوں کا سبب نہیں بنا بلکہ باعث تشکیک اور بعض شیعوں کے انحراف کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

تہذیب الاحکام کی خصوصیات

(۱) تہذیب الاحکام فروع کی روایات کے دفاع اور صرف روایات کو بیان کرنے پر اکتفا نہ کرنے (شیخ کلینی کی طرح) قبول روایت کے معیارات کی پاسداری کرنے یا (شیخ صدوق کی طرح) فتاویٰ کے مطابق روایات بیان کرنے کے لحاظ سے'' کافی''،'' فقیہ'' اور'' استبصار'' سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

(۲) تہذیب میں شیخ نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی روایات جمع کی ہیں جس کی وجہ سے فقیہ یا محققِ حدیث کے لیے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ ہر حکم کے استنباط کے لیے روایات کے تمام جہات کو سمجھ کر اُس کے معانی جان لے اور قلزم معانی کی گہرائی و گیرائی میں غوطہ زن ہو۔ مزید یہ کہ شیخ نے تقیہ کی روایات کا دفاع کیا ہے اور مخاطب کی علمی سطح کے مطابق اُن کا جواب دیا ہے۔ انھوں نے مباحث کے بیان میں ائمہ کے قبض و بسط (یعنی حد بندی اور پھیلاؤ کے عمل) کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور راویوں کو جہاں جہاں روایات کے معانی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے، اُس کی بھی وضاحت کی ہے۔

(۳) شیخ طوسی نے شیخ مفید اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے روایات کی تاویل اور جمع عرفی کے طریقے سیکھے تھے۔ آپ خود بھی علمی جامعیت کے حامل تھے اس لیے آپ نے تہذیب میں روایات کی تاویل اور جمع عرفی کے متعلق اپنے عملی تجربات کو حدیث کے تمام طالب علموں کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی تمام تاویلات اور جمع کے طریقے قابل قبول نہ ہوں۔

چوتھی کتاب: استبصار

شیخ طوسی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُن کی دو کتابیں'' تہذیب'' اور'' استبصار'' کتب اربعہ میں شامل ہیں۔ استبصار اُن کی احادیث کی دوسری کتاب ہے۔ شیخ طوسی نے استبصار کی تین جلدیں لکھی تھیں۔

۱۔ تہذیب الاحکام ج ۱، ص ۲ ۔ ۳

پہلی اور دوسری جلد عبادات کے متعلق اور تیسری جلد عقود، ایقاعات اور دوسرے فقہی ابواب کے متعلق تھی۔[۱]
آج کل کی طباعت کے مطابق استبصار کی چار جلدیں ہیں۔ شیخ طوسی نے استبصار میں ۹۲۵ ابواب قائم کئے ہیں اور ۵۵۱۱ روایات لکھی ہیں۔[۲] شیخ طوسی نے اپنی اس کتاب کے ''مقدمہ'' میں فرمایا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب تہذیب الاحکام کی تالیف کے بعد کچھ علماء کی فرمائش پر لکھی تھی۔ چنانچہ شیخ طوسی، استبصار کی تالیف کا سبب یوں بیان کرتے ہیں:

جب میں نے دیکھا کہ ہمارے کچھ اصحاب نے ہماری ضخیم کتاب تہذیب الاحکام کا مطالعہ کیا جس میں ہم نے حلال و حرام کے متعلق احادیث جمع کی ہیں تو انھوں نے اس کتاب کو مسائل فقہ اور ابواب احکام کی بہترین کتاب قرار دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ مختلف احادیث پر مشتمل ایک جداگانہ اور مختصر کتاب لکھی جائے۔[۳]

شیخ طوسی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ استبصار درحقیقت تہذیب الاحکام کی تلخیص ہے۔ چنانچہ شیخ اپنی اس بات کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

یہ کام یعنی موافق اور مخالف روایات کی جمع آوری اور اُن کے درمیان تطبیق پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے جس کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔ میں ہر باب میں اپنے فتوے کے مطابق روایات کو بیان کروں گا، اس کے بعد اُس کی مخالف روایات کو بیان کروں گا اور پھر اُن کے جمع کرنے کا طریقہ بیان کروں گا۔ اور جہاں تک جمع کرنا ممکن ہوا روایات کو چھوڑ دینے سے اجتناب کروں گا اور کتاب کے آغاز میں اُن قرائن کو بھی بیان کروں گا جن کے ذریعے ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔[۴]

شیخ روایات کو بنیادی طور پر دو حصوں یعنی متواتر اور غیر متواتر میں تقسیم کرتے ہیں پھر غیر متواتر روایات کو مزید دو دستوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) کچھ روایات ایسی ہیں جن کے ساتھ قرینہ ہوتا ہے۔ شیخ کے نزدیک ایسی روایات متواتر روایات کی طرح مفید علم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد شیخ نے کچھ قرائن جیسے ظاہر قرآن سے موافقت،

۱۔ استبصار ج ۴، ص ۳۵۰

۲۔ ایضاً ص ۳۵۱۔ شیخ طوسی کتاب کے ابواب اور ہر باب کی روایات اور جلد کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے انھیں شمار کیا ہے تاکہ اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو۔

۳ و ۴۔ ایضاً ج ۱، ص ۴۳۔ ۴۴

عقلی دلیل وغیرہ بیان کئے ہیں۔

(۲) کچھ روایات آحاد ہیں اور اُن کے ساتھ قرائن موجود نہیں ہوتے۔ شیخ کے نزدیک اگر اُن کی معارض روایت موجود نہ ہو تو اُن پر عمل کرنا درست ہے اور اگر اُن کی معارض روایات موجود ہوں تو پھر ''تعادل وتراجیح'' کے قوانین پر عمل کرنا چاہیے۔[۱]

شیخ طوسی نے تہذیب کی طرح استبصار میں بھی روایات کے آخری راوی کے سوا تمام راویوں کے نام حذف کر دیئے ہیں اور حسب دستور مشیخہ میں اُن راویوں کے نام تحریر کئے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسب ذیل وجوہات کی بنا پر استبصار بھی تہذیب کی طرح ہی ہے:

(۱) اس کتاب کی ترتیب وتنظیم شیخ مفید کی کتاب مقنعہ کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

(۲) دونوں کتابوں میں راویوں کا سلسلہ نہیں دیا گیا بلکہ مشیخہ میں تحریر کیا گیا ہے۔

(۳) روایات میں موجود تعارض کو دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور موافق ومخالف روایات میں تطبیق اور جمع کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

استبصار اور تہذیب میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ شیخ طوسی نے تہذیب میں ان روایات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے جن سے شیخ مفید کی کتاب مقنعہ کے فتوؤں کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مخالف روایات میں جمع کی کوشش کی جبکہ استبصار میں وہ مقنعہ کی روایات کو باقاعدگی سے نقل نہیں کرتے اور ہر مسئلے میں صرف چند موافق روایات نقل کرتے ہیں مگر مخالف روایات کو تفصیل سے نقل کرتے ہیں اور حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ محکم اور مبسوط طریقے سے اُن کے باہمی تعارض کو دور کیا جائے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ استبصار اصول کی کوئی کتاب لگتی ہے۔ اس میں موجود علمی مباحث کی وجہ سے خواص علماء اسے زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔[۲]

مختلف علماء نے تہذیب الاحکام کی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے علامہ مجلسی کی **ملاذ الاخیار فی فہم تہذیب الاخبار** اور سید نعمت اللہ جزائری کی ''غایۃ المرام'' کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ استبصار کی شروح میں شیخ عبدالرضا طفیلی کی کتاب ''جلاء الابصار فی شرح الاستبصار'' مشہور شرح ہے۔

۱۔ استبصار ج ۱، ص ۴۴۔ ۴۵

۲۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ج ۱، ص ۷۱

اخباری اور اصولی علماء کی نظر میں کتب اربعہ کی روایات

کتب اربعہ کی روایات کی صحت و قطعیت کے متعلق اصولی اور اخباری علماء میں اختلاف ہے۔

اخباری علماء کتب اربعہ کی روایات کی صحت اور قطعیت پر اصرار کرتے ہیں جبکہ اصولی علماء ان کتابوں کی روایات کی صحت و قطعیت کے قائل نہیں ہیں۔ ملا محمد امین استر آبادی (متوفی ۱۶۲۷ء) کو اخباری نظریے کا بانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''الفوائد المدنیہ'' میں کتب اربعہ کی روایات کے صحیح ہونے پر بارہ دلیلیں پیش کی ہیں۔[۱] ملا فیض کاشانی نے بھی ''وافی'' کے مقدمے میں کتب اربعہ کی روایات کی صحت کا دفاع کیا ہے۔[۲] مرحوم شیخ حر عاملی نے وسائل الشیعہ کے آخر میں نویں فائدے کے عنوان سے اپنے مدعا (روایات کتب اربعہ کی صحت) کو ثابت کرنے کے لیے بائیس دلائل دیے ہیں۔[۳] اسی طرح محدث بحرانی نے اپنی فقہی کتاب ''الحدائق الناضرۃ'' کے مقدمے میں کتب اربعہ کی تمام روایات کی صحت پر نو دلائل پیش کیے ہیں۔[۴]

اخباری علماء کے دلائل

اخباری علماء ان دلائل کی روشنی میں کتب اربعہ کی تمام روایات کو صحیح مانتے ہیں:

(۱) ہم جانتے ہیں کہ ائمہ طاہرینؑ کے کئی اصحاب اور راویان حدیث منجملہ اصحاب اجماع کے پاس مذہبی احکام حاصل کرنے اور روایات جمع کرنے کے لیے تقریباً تین سو سال کا عرصہ موجود تھا اور انھوں نے پوری زندگی ائمہ طاہرینؑ سے کسبِ فیض کیا تھا اور اس کا سلسلہ کتب اربعہ کے مؤلفین کے زمانے تک جاری رہا لہٰذا کتب اربعہ کی حیثیت میراثِ احادیث کی تحریری شکل کی سی ہے جو مجالس ائمہ طاہرینؑ میں بیان کی جانے والی روایات پر انحصار کرتی ہیں۔[۵]

(۲) کتب اربعہ کے مؤلفین نے اپنی کتابوں کے مقدمات میں اپنی کتابوں میں موجود روایات کی

۱۔ الفوائد المدنیہ ص ۱۸۱

۲۔ وافی ج ۱، ص ۱۱

۳۔ وسائل الشیعہ ج ۲۰، ص ۹۶ ۔ ۱۰۴

۴۔ الحدائق الناضرۃ ج ۱، ص ۱۵ ۔ ۲۴

۵۔ ہدایۃ الابرار ص ۸۳ ۔ ۸۴۔ الفوائد المدنیہ ص ۱۷۶

صحت کا دفاع کیا ہے مثلاً شیخ کلینی لکھتے ہیں کہ میں نے دین کی تفہیم میں لوگوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ کام صرف صحیح روایات سے ہی ممکن ہے۔

شیخ صدوق نے من لایحضرہ الفقیہ کی روایات کے صحیح ہونے اور اپنے فتوؤں سے اُن کی مطابقت کی تصریح کی ہے۔ شیخ طوسی نے بھی اپنی کتابوں کی تالیف کا یہی مقصد بیان کیا ہے یہاں تک کہ ایسی روایات کے متعلق بھی انہی خیالات کا اظہار کیا جن کی سند بظاہر ضعیف ہے۔[۱]

(۳) کتب رجال اور بزرگوں کے حالات کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کتب اربعہ کے مؤلفین کے زمانوں میں بھی ''اصول'' اور قابل اعتماد کتابیں موجود تھیں چنانچہ کتب اربعہ کے مؤلفین نے انہی ''اصول'' اور باوثوق کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔

اگر ان علماء نے اپنی جوامع میں بالفرض ان کتب اصول سے ایسی روایات نقل کی ہوتیں جن میں شک و شبہ تھا تو وہ اُن کو مخصوص علامات لگا کر ضرور اُن کی نشاندہی کرتے ورنہ انھیں حق کا راہ نما نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ شیخ طوسی نے کتاب ''عدہ'' اور ''استبصار'' کے آغاز میں لکھا ہے: ہر وہ حدیث جس پر عمل ہوتا ہے ایسی کتب اصول سے ماخوذ ہے جن کی صحتِ نقل پر اجماع موجود ہے۔[۲]

اس مکتب فکر کے مقابل اصولیوں کا موقف ہے۔ اصولی علماء اگرچہ کتب اربعہ کی عظمت اور اہمیت کے معترف ہیں اور انھیں شیعہ احادیث کا محکم ترین ماخذ سمجھتے ہیں مگر وہ ان کتابوں کی تمام روایات کو قطعی نہیں جانتے اور اخباریوں کے دلائل کو کافی نہیں سمجھتے۔

اصولی علماء کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ کتب اربعہ کی بنیاد حدیثی مخطوطات پر ہے۔ اس کا مطلب صرف کتب اربعہ کا محکم اور مستحکم ہونا ہے نہ کہ اُن کی تمام روایات کا صحیح ہونا کیونکہ کتب اربعہ کی زیادہ تر روایات کو جو ''اصول اربعمأۃ'' سے ماخوذ ہیں قاطعیت کے ساتھ صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرینؑ کے اصحاب کے بھیس میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو کذاب اور جعل ساز تھے حتیٰ کہ ملحد بھی تھے۔ وہ جعلی روایات کو اپنی کتابوں یا دوسروں کے مخطوطات میں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مغیرہ بن سعید پر لعنت کرے کہ وہ میرے والد پر

۱۔ ہدایۃ الابرار ص ۵۶

۲۔ الفوائد المدنیہ ص ۱۸۳۔ کتب اربعہ کی روایات کی قطعیت پر اخباریوں کے دلائل کے لیے دیکھیے:

مصادر الاستنباط بین الاصولیین و الاخباریین ص ۱۱۱ ۔ ۱۱۹

جھوٹ تراشا تھا۔[1]

امام جعفر صادقؑ نے ایک اور مقام پر فرمایا: مغیرہ بن سعید جان بوجھ کر میرے والد پر جھوٹ باندھا کرتا تھا اور میرے والد کے اصحاب کی کتابوں کو حاصل کر لیتا تھا اور اُس کے کچھ دوست میرے والد کے دوستوں کی آڑ میں چھپے رہتے تھے۔ وہ میرے والد کے اصحاب کی کتابوں کو اُن سے لے کر مغیرہ بن سعید کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ وہ اُن روایات میں اپنی طرف سے کفریہ اور الحادی باتوں کو میرے والد کی طرف منسوب کر کے شامل کر دیتا تھا۔ تحریف کے بعد وہ یہ کتابیں اصل مالکوں کو واپس کر دیتا تھا تاکہ وہ اسے شیعوں میں پھیلائیں۔[2]

ائمہ طاہرینؑ نے اس طرح کے کچھ اور جھوٹے راویوں پر بھی لعنت کی تھی۔[3]

کتب اربعہ کے مؤلفین کی گواہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ صرف شیخ صدوق نے یہ گواہی دی ہے۔ اگر ہم اُن کی گواہی کو مان لیں تو وہ صرف اس حد تک ہوگی کہ انھوں نے عمداً غیر صحیح روایات اپنی کتابوں میں نقل نہیں کی تھیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے سہو و خطا سے بھی ضعیف روایات نقل نہیں کی ہوں گی۔ (ممکن ہے انھوں نے بھولے سے یا غلطی سے ضعیف روایات نقل کر دی ہوں) بالفاظ دیگر روایات کی صحت کا یقین مؤلفین کے اپنے اجتہاد پر مبنی ہے۔ ایسا اجتہاد اُن کے لیے تو حجت ہو سکتا ہے ہمارے لیے حجت نہیں ہو سکتا۔[4] اس سلسلے میں جہاں اخباری علماء کے دلائل ناکمل ہیں وہاں کتب اربعہ کے سلسلۂ اسناد میں ضعیف راویوں بلکہ جعل سازوں کی بھی اچھی خاصی تعداد دکھائی دیتی ہے۔ نیز ان میں کچھ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو قرآن، سنت معتبر، عقل صحیح، تاریخ یا علم... کے معیارات پر پوری نہیں اترتیں اور کتب اربعہ کے مؤلفین کی طرف سے کچھ روایات کی عدم قبولیت اور روایات کے متون کا اختلاف اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ کتب اربعہ کی تمام روایات قطعی نہیں ہیں۔[5]

۱۔ اختیار معرفۃ الرجال ج ۲، ص ۴۹۱۔ بحار الانوار ج ۶۴، ص ۲۰۲

۲۔ بحار الانوار ج ۹۶، ص ۲۶۳

۳۔ دیکھیے: مختصر مقباس الہدایہ ص ۲۶۶ - ۲۶۹۔ اصول الحدیث ص ۱۴۳

۴۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۱۰۳ - ۱۰۴

۵۔ اخباریوں کے دلائل پر تنقید کے لیے دیکھیے: مصادر الاستنباط بین الاصولیین والاخباریین ص ۱۱۹ ب ۱۲۴

شیعہ جوامع حدیث کی تکمیل و تنظیم کا دور

اہم منابع حدیث تکمیل کے دور میں

(۱) بحار الانوار

محمد باقر بن محمد تقی مجلسی جو علامہ مجلسی کے نام سے معروف ہیں گیارہویں صدی ہجری کے عظیم محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ۱۰۳۷ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور ۷۴ برس کی عمر میں ۱۱۱۱ھ میں وفات پا گئے۔

علامہ مجلسی نے اپنی زندگی میں بہت سے علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔ آپ نے دسیوں تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ درس و تدریس کے علاوہ جمعہ و جماعت کی امامت فرماتے تھے اور لوگوں کو شرعی مسائل کے جوابات بھی دیا کرتے تھے۔[1] آپ صفوی دورِ حکومت کے موثر ترین شیعہ عالم دین تھے۔ صفوی حکومت میں آپ شیخ الاسلام اور مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ شیعہ مذہب کے پھیلاؤ اور استحکام کے لیے نیز باطل نظریات کی تردید کے لیے آپ نے اس عہدے کے ذریعے قابل قدر خدمات انجام دیں۔[2] آپ کے اسی اثر و رسوخ کی وجہ سے کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ ہم شیعہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علامہ مجلسی کے افکار و نظریات ہرگز غلط نہیں ہو سکتے۔[3]

علامہ مجلسی نے اپنے دور کے نامور علماء سے علم حاصل کیا جن میں آپ کے والد محمد تقی مجلسی اول (متوفی ۱۰۷۰ھ)، آقا حسین محقق خوانساری (متوفی ۱۰۹۸ھ)، ملا صالح مازندرانی (متوفی ۱۰۸۶ھ) ملا محسن فیض کاشانی (متوفی ۱۰۹۱ھ)، سید نور الدین عاملی (متوفی ۱۰۶۱ھ) سرفہرست ہیں۔ علامہ مجلسی

۱۔ الکنیٰ والالقاب ج ۳، ص ۱۴۸ ۔ ۱۴۹

۲۔ کتاب مفاخر اسلام (علامہ مجلسی بزرگ مرد علم و دین) ص ۱۴ ۔ ۱۵۔ ان صفحات میں علامہ مجلسی کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔

۳۔ مفاخر اسلام (علامہ مجلسی بزرگ مرد علم و دین) ص ۱۵

کے شاگردوں میں سید نعمت اللہ جزائری، میرزا عبداللہ تبریزی اصفہانی اور میر محمد حسین خاتون آبادی جیسے مشاہیر علماء شامل ہیں۔[1]

شیعہ علماء و محدثین میں علامہ مجلسی اپنی تالیفات کی کثرت کے سبب ایک خاص مقام رکھتے ہیں علامہ کی ۱۶۰ تالیفات بیان کی گئی ہیں جن میں ۸۶ فارسی میں اور باقی عربی میں ہیں۔ علامہ کی کتابوں میں بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہارؑ کے بعد مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسول، (اصول کافی، فروع کافی اور روضۂ کافی کی مفصل شرح)، حیات القلوب، عین الحیاۃ اور زاد المعاد کو بڑی شہرت حاصل ہے۔[2]

بحار الانوار حدیث کی جامع ترین اور بڑی مفصل کتاب ہے۔ تاریخ تشیع میں بحار الانوار سے زیادہ ضخیم کتاب موجود نہیں۔ یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے اور علامہ مجلسی نے آل محمدؑ کی روایات کی روشنی میں نور کے سمندر اس کتاب میں بند کر دیئے ہیں۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کو جوامع شیعہ میں بلکہ جوامع اسلام میں دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ حاصل ہے۔ شیعیت اور اسلام پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی محقق اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب اپنی تدوین سے لے کر آج تک علماء اور دانشوروں کی توجہات کا مرکز اور علمی مجلسوں اور مذاکروں کی زینت ہے۔

محدث نوری کہتے ہیں کہ بحار الانوار جیسی جامع کتاب آج تک تالیف نہیں ہوئی۔[3]

بحار الانوار کی ضخامت اور روایات کی کثرت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ علامہ مجلسی نے یہ عظیم کتاب اپنے شاگردوں کی معاونت سے مکمل کی تھی۔ اس عظیم کام کے لیے آپ نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں درج ذیل حضرات شامل تھے:

(۱) آمنہ خاتون، علامہ کی بہن

(۲) امیر محمد صالح خاتون آبادی

(۳) میرزا عبداللہ آفندی

(۴) ملا عبداللہ بحرینی

۱۔ مفاخر اسلام (علامہ مجلسی بزرگ مرد علم و دین) ص ۳۶۰۔ ۴۲۵

۲۔ ایضاً

۳۔ الفیض القدسی، ضمن بحار الانوار ج ۱۰۵، ص ۲۹

(۵) سید نعمت اللہ جزائری [1]

علامہ مجلسی نے اس کتاب کی روایات کے لیے ۴۸۵ کتابوں سے مدد لی تھی جن میں چار سو شیعہ اور باقی سنی کتابیں تھیں لیکن اگر گہری نظر سے بحار الانوار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ نے ۶۲۹ کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ شاید مزید تحقیق کرنے پر اس سے زیادہ تعداد معلوم ہوجائے۔[2]

بحار الانوار کی خصوصیات

(۱) بحار الانوار حدیث کی جامع ترین کتاب ہے۔[3] یہ دین شناسی کے تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں عقائد، اخلاق اور احکام کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے۔ کتب اربعہ کے علاوہ چھ سو شیعہ اور سنی منابع سے استفادہ اس کتاب کی جامعیت کو مزید واضح کرتا ہے۔ اس جیسی جامع کتاب نہ صرف شیعہ بلکہ سنیوں میں بھی ناپید ہے۔

(۲) جوامع احادیث میں بالعموم روایات نقل کی جاتی ہیں مگر بحار میں روایات کی تشریح بھی کی گئی ہے جس کی وجہ سے روایات کے مفاہیم میں ابہام باقی نہیں رہتا اور حدیث شناسی میں مدد ملتی ہے۔

(۳) بحار الانوار میں جن کتابوں کے حوالوں سے روایت نقل کی گئی ہے اُس کے اسناد بھی نقل کیے گئے ہیں۔ محققین کے لیے ان حوالوں سے اُن کتابوں کی طرف رجوع کرنا آسان تھا مگر اس کے باوجود علامہ نے ہر کتاب کے حوالے کے ساتھ روایت کے اسناد کو بھی بیان کیا ہے۔ اس طرح آپ نے روایات کی اسناد کی تحقیق مزید آسان بنا دی ہے۔

(۴) بحار الانوار میں صرف روایات بیان نہیں کی گئیں بلکہ علامہ نے حسب عادت بہت سے شیعہ اور سنی علماء کے افکار و نظریات بھی نقل کیے ہیں۔ یہ روش اُن کی دوسری کتابوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ بعض اوقات علماء کی آراء کو کئی صفحات تک نقل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بحار الانوار کو نظریات اور آراء کی شناخت کے حوالے سے نہایت اہم مقام حاصل ہے۔

۱۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۹۹۔ زندگی نامہ علامہ مجلسی ج ۲، ص ۲۶۶
کچھ لوگوں نے علامہ مجلسی کے شاگردوں مثلاً سید نعمت اللہ جزائری کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بحار الانوار علامہ مجلسی کی زیر نگرانی ان کے شاگردوں نے مرتب کی تھی۔ اس پر استاد علی دوانی نے تنقید کی ہے۔ مفاخر اسلام ص ۱۷۵ - ۱۸۲

۲۔ مقدمہ معجم بحار الانوار ص ۸۷ - ۹۸

۳۔ آیت اللہ شیخ محمد آصف محسنی نے اپنی کتاب **مشرعة بحار الانوار** میں بحار الانوار کی متن و اسناد کے حوالے سے ضعیف روایات کی نشاندہی کی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۴۲۳ھ میں قم سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ (رضوانی)

(۲) وسائل الشیعہ

محمد بن حسن بن علی المعروف شیخ حر عاملی کا سلسلۂ نسب چھتیس واسطوں سے کربلا کے تائب شہید حضرت حُر بن یزید ریاحی سے جا ملتا ہے۔ آپ ۱۰۳۳ھ کو جبل عامل (لبنان) کے گاؤں مشغر میں پیدا ہوئے اور ۷۱ برس کی عمر میں ۱۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار امام علی رضاؑ کے روضۂ اقدس کے شمالی حصے میں واقع ہے۔[۱]

شیخ کے آباء و اجداد کا شمار جبل عامل کے مشہور علماء و فقہاء میں ہوتا تھا۔ آپ کے والد، چچا اور نانا اپنے دور کے جید علماء تھے۔ "معالم" کے مؤلف شیخ زین الدین محمد بن حسن آپ کے چچا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ حر عاملی نے زیادہ تر علم اپنے خاندان سے حاصل کیا تھا۔ شیخ نے اپنے اصفہان کے سفر میں علامہ مجلسی سے اجازۂ حدیث حاصل کیا جس کے جواب میں علامہ مجلسی نے بھی اُن سے اجازۂ حدیث حاصل کیا تھا۔[۲] شیخ حر عاملی نے چالیس برس کا عرصہ اپنے وطن میں گزارا تھا۔ اس کے بعد شاید آپ ائمہ طاہرینؑ کی زیارت کے لیے عراق تشریف لے گئے اور وہاں سے مشہد مقدس گئے[۳] اور اپنی وفات تک یہیں قیام پذیر رہے۔ اور زندگی کے آخری ایام تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ بہت سے شیعہ علماء نے یہاں آپ سے کسب فیض کیا۔ حکومت نے آپ کو اس علاقے کے شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ کا عہدہ سپرد کیا تھا۔[۴]

شیخ حر عاملی نے ۲۴ کتابیں تالیف کی تھیں[۵] جن میں "وسائل الشیعہ" کے بعد حسب ذیل تالیفات کو بڑی شہرت حاصل ہوئی:

(۱) **الجواھر السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ**

۱۔ ہدایۃ الامۃ ج ۱، ص ح۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۷۵

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۷۷

۳۔ ایران کے صفوی بادشاہ شیعہ علماء کا بڑا احترام کرتے تھے۔ صفوی سلطنت اور عثمانی سلطنت میں شدید اختلافات کی وجہ سے زین الدین عاملی (شہید ثانی) ۹۶۶ھ میں شہید کر دیے گئے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے شیخ حر عاملی نے ایران ہجرت کی تھی۔ شیخ حر عاملی سے پہلے شہید ثانی کے فرزند، شہید کے نواسے (صاحب مدارک الاحکام) محقق کرکی (صاحب جامع المقاصد) اور شیخ بہائی نے بھی ایران ہجرت کی تھی۔

۴۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۷۹

۵۔ شیخ نے "امل الآمل" میں اپنے حالات کے ضمن میں اس کتاب کے عنوانات کو بیان کیا ہے۔ (ج ۱، ص ۱۴۲ - ۱۴۵)

(۲) اثبات الهداة بالنصوص والمعجزات (سات جلدیں)

(۳) الفوائد الطوسیه

وسائل الشیعہ حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں کتب اربعہ اور ۷۰ دیگر کتابوں سے فقہی روایات کا استخراج کیا گیا ہے۔[۱] اس کتاب کا مقدمہ ۳۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتب فقہ کی ترتیب کے لحاظ سے اس میں ۵۱ کتابیں اور ۳۵۸۵۰ روایات ہیں۔[۲] اس کی تالیف میں شیخ حر عاملی کو اٹھارہ سے بیس برس کا عرصہ لگا۔[۳] یہ کتاب ۱۰۸۲ھ میں مکمل ہوئی۔ شیخ حر عاملی نے کم از کم تین مرتبہ پوری کتاب کا خود مطالعہ کیا تھا۔[۴] پچھلے برسوں میں یہ کتاب بیس جلدوں میں شائع ہوئی جن میں سے پندرہ جلدوں پر آیت اللہ ربانی نے اور آخری پانچ جلدوں پر مرحوم رازی نے حاشیہ لکھا ہے۔

شیخ حر عاملی نے وسائل الشیعہ کی وجہ تالیف یہ بیان کی ہے کہ سابقہ کتب میں واقعہ سے دور طولانی تاویلات پائی جاتی تھیں۔ روایات منتشر تھیں اور فقہی ابواب کے نام روایات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور شرعی مسائل سے متعلق روایات مفقود تھیں اس لیے اس کتاب کے ذریعے مذکورہ نقائص کو دور کیا گیا۔[۵] شیخ حر عاملی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی روایات کو اُن مشہور کتابوں سے نقل کیا ہے جن پر شیعہ علماء بھروسا اور عمل کرتے ہیں۔[۶]

وسائل الشیعہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف یہ چاہتے تھے کہ فقہی ابواب سے متعلق تمام روایات کو جمع کر کے استنباط و اجتہاد میں سہولت پیدا کی جائے۔ اُن کے خیال میں اس کتاب کے بغیر فقیہ کو کتب اربعہ میں مختلف ابواب میں منتشر احادیث دیکھنی پڑتی تھیں اور باقی کتابوں کی روایات سے آگاہی بھی نہیں ہوتی تھی جبکہ وسائل الشیعہ میں کتب اربعہ اور دیگر مشہور کتابوں کی تمام روایات فقیہ کو ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں۔ وسائل الشیعہ اپنی تالیف کے وقت سے لے کر آج تک حسن ترتیب و

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۸۸
استاد کاظم مدیر شانہ چی نے اپنی کتاب علم الحدیث کے صفحہ ۸۶ پر وسائل الشیعہ، مطبوعہ اسلامیہ تہران کے مقدمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ حر عاملی نے اس کتاب کی تالیف میں ۱۸۰ کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔

۲۔ علم الحدیث ص ۸۸

۳ تا ۵۔ وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۹۵

۶۔ ایضاً ص ۷

تبویب کی وجہ سے شیعہ مجتہدین کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔[1]

(۳) مستدرک الوسائل

میرزا حسین بن میرزا محمد تقی نوری طبرسی ۱۲۵۴ھ میں مازندران کے شہر "شہرستان نور" کے ایک گاؤں "یالو" میں پیدا ہوئے۔ آپ آٹھ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر تہران میں شیخ عبدالرحیم بروجردی کی شاگردی اختیار کی۔ بعدازاں ۱۲۸۳ھ میں ۱۹ برس کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے نجف تشریف لے گئے اور شیخ عبدالحسین تہرانی المعروف شیخ العراقین، شیخ مرتضیٰ انصاری اور سید مجدد شیرازی جیسے مشاہیر سے کسبِ فیض کیا۔

میرزا حسین نوری حدیث پر تحقیق اور غور و فکر میں بہت دلچسپی لیتے تھے جس کی وجہ سے وہ "محدث نوری" کے نام سے مشہور ہوئے۔[2]

انھوں نے شیخ عباس قمی اور شیخ آغا بزرگ تہرانی جیسے قابل شاگردوں کی تربیت کی تھی۔

شیخ آغا بزرگ تہرانی نے "مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل" کے آغاز میں اپنے استاد کے علمی و معنوی مقام نیز اُن کے زہد، عبادت، کثرت مطالعہ بالخصوص حدیث کے مطالعے کو خوب سراہا ہے اور زندگی میں اُن کے نظم وضبط کی بہت تعریف کی ہے۔[3]

محدث نوری نے جو کتابیں تالیف کی ہیں اُن میں سے دارالسلام، نفس الرحمان، معالم العبر اور جنت المأویٰ بہت مشہور ہیں۔[4] آپ کے دوسرے شاگرد شیخ عباس قمی اپنے استاد کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

محدث نوری علم حدیث، شناخت رجال، اقوال پر علمی دسترس اور آیات و روایات کے دقیق

۱۔ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: گزشتہ تین سو سال سے شیعہ علماء بالاتفاق اس کتاب کی طرف رجوع کرتے آئے ہیں اور اس کی روایات کی طرف استناد کرتے ہیں۔ کتاب کی یہ اہمیت اس کے حسن ترتیب وتبویب اور اہل بیت اطہارؑ کی زیادہ سے زیادہ احادیث کے روائی منابع پر محیط ہونے کی وجہ سے ہے۔ نقل از مستدرک الوسائل ج ۱، ص ۳۳

۲۔ الفوائد الرضویہ ج ۱، ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۳

۳۔ مستدرک الوسائل ج ۱، ص ۲

۴۔ الفوائد الرضویہ ج ۱، ص ۱۵۲۔ محدث نوری کی ۳۰ کتابیں شمار کی گئی ہیں۔

نکات سے آگاہی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے تبحر علمی کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ آپ کی کثرت معلومات اور علوم، روایات، سنن اور آثار میں تبحر علمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ ...[۱]

آپ نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں ۱۳۲۰ھ کو وفات پائی اور نجف اشرف میں دفن ہوئے۔[۲]

مستدرک محدث نوری کی مشہور تالیف ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں انھوں نے اُن احادیث کو جمع کیا ہے جنھیں شیخ حر عاملی نے وسائل الشیعہ میں نہیں لکھا تھا۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر وسائل الشیعہ میں موجود خلا کو پُر کیا۔ اس کتاب میں ۵۴۲۱ ابواب اور ۲۳۵۱۴ روایات ہیں۔[۳]

محدث نوری نے اس کتاب کو ۱۳۱۹ھ میں مکمل کیا تھا۔[۴]

اس کتاب کی خصوصیات میں سے ایک اس کا آخری باب ''خاتمہ'' ہے۔ اس میں مؤلف نے کتاب کے دس فوائد بیان کئے ہیں۔[۵] پہلے فائدے میں مستدرک کے منابع کو اور دوسرے فائدے میں کتابوں اور اُن کے مؤلفین کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرے فائدے میں محدث نوری نے سابقہ کتابوں کے مؤلفین سے اپنے طرق حدیث کو بیان کیا ہے۔ باقی فوائد میں کافی، مشیخہ من لایحضرہ الفقیہ اور تہذیب الاحکام کے متعلق بحث ہے۔ مذکورہ فوائد میں سے فائدہ دوم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں مذکورہ کتابوں کی کتاب شناسی کے متعلق اہم بحث کی گئی ہے۔

مستدرک الوسائل میں ابواب کی ترتیب وسائل الشیعہ کی ترتیب کے مطابق ہے اور وسائل کی طرح صرف فقہی روایات کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلی بار یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ پھر موسسہ آل البیتؑ نے اسے چوبیس جلدوں میں شائع کیا۔ اس کی اٹھارہ جلدوں کا تعلق اصلی مباحث سے ہے اور چھ جلدوں کا تعلق خاتمہ مستدرک سے ہے۔

۱۔ الفوائد الرضویہ ج ۱، ص ۱۵۲

۲۔ الکنی والالقاب ج ۲، ص ۴۴۵

۳۔ الذریعہ ج ۲۱، ص ۸

۴۔ ایضاً

۵۔ آغا بزرگ تہرانی کے بقول مستدرک الوسائل کا باب ''خاتمہ'' بذات خود ایک نفیس کتاب ہے جو ہمیں علم درایۃ الحدیث اور رجال کی دوسری کتابوں سے بے نیاز کردیتی ہے۔ (الذریعہ ج ۲۱، ص ۸)

(۴) جامع احادیث الشیعہ

آیت اللہ سید حسین طباطبائی بروجردی (متوفی ۱۳۸۰ھ) ماضی قریب کے عظیم ترین مرجع تقلید تھے۔ انھوں نے اپنی مرجعیت کے زمانے میں مذہب تشیع کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ قم مقدسہ کے حوزہ علمیہ میں اُن کے وجود باجود اور علمی صلاحیتوں کی وجہ سے فقہ، رجال اور حدیث کے علوم کو نئی زندگی ملی۔ دورِ حاضر کے اکثر مراجع اور حوزہ کے علماء اُن کے شاگرد ہیں۔

مرحوم آیت اللہ بروجردی نے فقہی مباحث میں ایک نئے انداز کا آغاز کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ شرعی احکام کے استنباط کے لیے فقہ کی تاریخ، دیگر مذاہب کے فقہی نظریات اور تاریخ، حدیث اور سیرت کے منابع کے علاوہ استنباط کی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ فقہاء کی نظر میں وسائل الشیعہ کی بے پناہ اہمیت کے باوجود آیت اللہ بروجردی اس بات کے قائل تھے کہ اس کتاب میں کچھ کمی بیشی ہے اس لیے انھوں نے ایک ایسی کتاب کی تدوین شروع کی جو انتہائی جامع ہو اور اس میں وہ تمام روایات موجود ہوں جن کی فقہاء کو ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے فاضل شاگردوں کی ایک جماعت تیار کی اور آپ کی رہنمائی میں انھوں نے احادیث جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ اُن کی کاوش سے کتاب "جامع احادیث الشیعہ" منظرعام پر آگئی۔

مرحوم آیت اللہ بروجردی کی زندگی میں اس کتاب کی صرف ایک جلد شائع ہوئی تھی۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کے شاگردِ رشید حاج شیخ اسماعیل معزی ملایری نے کتاب کی تدوین کا سلسلہ جاری رکھا اور اب تک اس کتاب کی چھبیس جلدیں آچکی ہیں۔

جامع احادیث الشیعہ کی خصوصیات

کتاب کے مقدمے میں اس کی ۲۳ خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ہم یہاں اُن میں سے چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) اس کتاب کے ہر باب کے شروع میں اس باب سے مربوط آیات بیان کی گئی ہیں۔

(۲) وسائل الشیعہ کی روش کے برعکس اس کتاب میں روایات کا پورا متن دیا گیا ہے اور ادھوری روایت کو بقدرِ ضرورت پیش کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے البتہ جن خاص موارد میں جہاں بات واضح ہو اور روایت کا ایک حصہ بیان کرنے سے مفہوم سمجھ میں آتا ہو وہاں روایت کو بقدرِ ضرورت نقل کیا گیا ہے۔

(۳) روایات کے صحیح الفاظ اور عبارات کو اصلی منابع سے پیش کیا گیا ہے اور نسخوں میں موجود فرق کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) جہاں متعارض روایات نقل کی گئی ہیں وہاں جمع اور تاویل کے راستوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۵) سنن، آداب، اُخلاق، دعاؤں اور اذکار کی روایات کو احکام سے علاحدہ اور مستقل صورت میں لکھا گیا ہے۔

(۶) ہر باب کی احادیث میں ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے یعنی پہلے اُن روایات کو نقل کیا گیا ہے جو فتاویٰ کے مطابق ہیں پھر اُس کے معارض یا مخالف روایات کو بیان کیا گیا ہے۔

(۷) جہاں ضرورت تھی وہاں روایات میں موجود ضمائر کے مرجع کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے گئے ہیں۔[۱]

آیت اللہ بروجردی جامع احادیث الشیعہ کی تدوین کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور انھوں نے اس کام کی تکمیل کے لیے اَن تھک کوششیں کی تھیں۔ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس کتاب کی تدوین کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتے تھے۔

۱۔ جامع احادیث الشیعہ ج ۱، ص ف - ث

دورِ تدوین کے اہم منابع حدیث

(۱) الوافی

محمد بن مرتضیٰ بن محمود ۱۰۰۷ھ کو کاشان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ فیض کاشانی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے جن مشہور علماء سے کسب علم کیا تھا اُن میں آپ کے والد سید ماجد بحرانی (متوفی ۱۰۲۸ھ)، ملا صدرا (متوفی ۱۰۵۰ھ)، میر محمد باقر داماد (متوفی ۱۰۴۱ھ)، بہاؤالدین عاملی المعروف شیخ بہائی (متوفی ۱۰۳۰ھ)، ملا خلیل قزوینی (متوفی ۱۰۸۹ھ)، محمد صالح مازندرانی (متوفی ۱۰۸۱ھ) سرفہرست ہیں۔ آپ نے ان اساتذہ سے فقہ، حدیث، فلسفہ اور عرفان کی تعلیم حاصل کی۔[۱]

آپ نے ملا صدرا اور میر داماد سے فلسفہ و عرفان، سید ماجد بحرانی اور شیخ بہائی سے فقہ، عرفان و حدیث اور ملا خلیل قزوینی اور محمد صالح مازندرانی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ان نامور اساتذہ کی تربیت کے طفیل انھیں وسعتِ فکر عطا ہوئی اور اُن کی تحریروں میں یہ وسعتِ فکر ایک تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہے جو اُن کی قابلیت کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے ۱۴۴ کتابیں تالیف کی تھیں جن میں سے فقہ میں مفاتیح الشرائع، تفسیر میں صافی، حدیث میں **الوافی فی جمع الاحادیث الکتب الاربعة القدیمة** اور اخلاق میں **المحجة البیضاء** کو خاص اہمیت حاصل ہے۔[۲]

فیض کاشانی کے مشہور شاگردوں میں علامہ محمد باقر مجلسی، قاضی سعید قمی اور سید نعمت اللہ جزائری شامل ہیں۔ آپ نے ۱۰۹۱ھ میں وفات پائی اور کاشان میں مدفون ہوئے۔[۳]

وافی فی جمع الاحادیث الکتب الاربعة القدیمة وہ پہلی اور جامع ترین کتاب ہے جس میں کتب اربعہ کی تمام روایات کے مکررات کو حذف کر کے جمع کیا گیا ہے اور ان روایات کا ایک نئی ترتیب

۱۔ وافی ج ۱، ص ۱۸

۲۔ مقدمہ تفسیر صافی ج ۱، ص ۵۔ الکنٰی والالقاب ج ۳، ص ۳۹۔ ۴۱

۳۔ الکنٰی والالقاب ج ۳، ص ۴۱

سے انتخاب کیا گیا ہے۔ نیز روایات کی ضروری تشریح بھی کی گئی ہے۔ وافی ایک مقدمہ، چودہ کتابوں اور ایک خاتمہ اور ۲۷۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ شیخ آغا بزرگ تہرانی کے شمار کے مطابق وافی میں پچاس ہزار روایات ہیں اور احتمال ہے کہ اس حساب میں وہ روایات بھی شامل ہوں جن میں کتب اربعہ کی روایات کی تشریح کی گئی ہے۔[1]

مؤلف نے وافی کی غرض تالیف یہ بیان کی ہے کہ کتب اربعہ میں ہر ضروری روایت موجود نہیں تھی اور اُن کے ابواب وعنوانات منتشر تھے جس کی وجہ سے ان کی طرف رجوع کرنے میں دشواری پیش آتی تھی اور مکررات اس پر مستزاد تھیں۔[2]

یہ کتاب ۲۳ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وافی کی تلخیص بھی خود مؤلف نے کی تھی جو **الشافی المنتخب من الوافی** کے نام سے شائع ہوئی تھی۔[3]

وافی کی خصوصیات

(۱) کتب اربعہ پر مزید کام۔ فیض کاشانی نے کتب اربعہ کی مکررات کو حذف کیا اور ایک نئے انداز سے اُن کی روایات کو مرتب کر کے انھیں مزید کارآمد بنایا۔ اس طرح وافی کا مطالعہ ہمیں کتب اربعہ کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کردیتا ہے۔

(۲) روایات کی تشریح۔ جوامع روائی میں تشریح کا رواج موجود نہیں تھا مگر فیض کاشانی نے ''وافی'' میں مبہم اور مشکل الفاظ کی تشریح کر کے روایات کو عام فہم بنانے کی کوشش کی۔

(۳) مکمل اسناد اور روایات کے متون کا بیان۔ شیخ صدوق نے من لا یحضرہ الفقیہ میں اور شیخ طوسی نے تہذیب اور استبصار میں روایات نقل کرتے ہوئے اسناد بیان نہیں کی تھیں۔ اس کی تلافی انھوں نے اپنی کتابوں کے آخر میں باب مشیخہ کے ذریعے سے کی۔ اس کے برعکس وسائل الشیعہ میں کسی کانٹ چھانٹ کے بغیر روایات کو بیان کیا گیا تاکہ داخلی قرائن بالخصوص سیاق عبارت سے حدیث کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ الذریعہ ج ۲۵، ص ۱۳

۲۔ وافی ج ۱، ص ۱۹۔ ۲۰

۳۔ الذریعہ ج ۱۳، ص ۱۰

(۲) منتقی الجمان

شہید ثانی کے فرزند جمال الدین حسن بن زین الدین جبل عامل (لبنان) کے ایک قریہ "جُبع" میں ۹۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۱۱ھ میں اپنے وطن میں فوت ہوئے۔[۱]

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی جو ایک عظیم فقیہ تھے۔ والد ماجد کی شہادت کے بعد آپ نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر اپنے گہرے دوست صاحب مدارک کے ساتھ نجف اشرف تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے اساتذہ کے زیر سایہ فقہ، حدیث، رجال اور علم اصول میں بلند علمی مدارج طے کیے۔[۲] آپ نے شیخ بہائی کے والد حسین بن عبدالصمد، مقدس اردبیلی اور شیخ عبداللہ یزدی جیسے اکابر علماء سے تحصیل علم کیا اور خود آپ نے نجیب الدین علی بن محمد بن مکی عاملی اور شیخ عبدالسلام بن محمد حُر جیسے شاگردوں کی تربیت فرمائی۔[۳] انھوں نے بارہ کتابیں تالیف کی تھیں۔ اُن کی کتاب **معالم الدین و ملاذ المجتهدین** ایک طویل عرصے تک حوزات علمیہ میں پڑھائی جاتی رہی۔[۴]

شیخ حر عاملی کہتے ہیں کہ جمال الدین اپنے زمانے میں فقہ، حدیث اور رجال کے نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کا علمی اور اخلاقی مرتبہ نہایت بلند تھا۔[۵]

کتاب **منتقی الجمان فی الاحادیث الصحاح والحسان** آج بھی موجود ہے۔ اس کتاب میں کتب اربعہ کی فقہی احادیث کو جمع کیا گیا ہے اور روایات کو سند کے اعتبار سے "صحیح اور حسن" میں تقسیم کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ پھر ان روایات کے مضامین پر تحقیق کی گئی ہے۔

کتاب کی "تمہید" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتب اربعہ کی روایات میں تصحیف وتغییر کے متعلق فکر مند تھے اور انھیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اُن کی صحت وسقم ہی غیر مشخص ہو کر نہ رہ جائے۔[۶] اسی لیے انھوں نے پوری کوشش کی کہ کتاب میں صحیح اور غیر صحیح روایات کو ایک دوسرے سے جدا کریں۔

اس کتاب کی خصوصیات میں وہ بارہ فوائد بھی ہیں جنھیں مؤلف نے "تمہید" میں لکھا ہے۔ انھوں نے روایات کی چار قسمیں بیان کی ہیں اور کتب اربعہ کے مؤلفین کے انداز کا فرق اور طرق شیخ... تفصیل سے نقل کیے ہیں۔ یہ کتاب مسائل حج تک شائع ہوئی ہے لیکن افسوس ابھی تک نامکمل ہے۔ پہلی بار یہ ایک جلد میں شائع ہوئی تھی اور آخری ایڈیشن میں اسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

۱۔ امل الآمل ج ۱، ص ۵۷۔ روضات الجنات ج ۲، ص ۲۹۶

۲۔ منتقی الجمان فی الاحادیث الصحاح والحسان ص ۱۴

۳۔ ایضاً ص ۱۵   ۴۔ ایضاً ص ۱۲۔ ۱۳   ۵۔ ایضاً ص ۶   ۶۔ ایضاً ص ۲

کتب اربعہ ایک نظر میں

کتاب	تالیف	ولادت/وفات	روایات	جلد	مشہور شروح
کافی	محمد بن یعقوب کلینی	۲۵۵ ـ ۳۲۹	۱۶۱۹۹	۸	مراۃ العقول از علامہ مجلسی شرح از ملا صالح مازندرانی
من لایحضرہ الفقیہ	محمد بن علی بن بابویہ قمی	۳۰۶ ـ ۳۸۱	۵۹۹۸	۴	روضۃ المتقین ولوامع صاحبقرانی از علامہ محمد تقی مجلسی اول
تہذیب الاحکام	محمد بن حسن طوسی	۳۸۵ ـ ۴۶۰	۱۳۹۸۸	۱۰	ملاذ الاخیار از علامہ مجلسی غایۃ المرام از نعمۃ اللہ جزائری
الاستبصار	محمد بن حسن طوسی	۳۸۵ ـ ۴۶۰	۵۵۱۱	۴	جلاء الابصار از شیخ عبد الرضا طفیلی

شیعہ کتب حدیث کا دورِ تکمیل و تنظیم ایک نظر میں

کتاب	تالیف	ولادت/وفات	جلد	اجمالی خصوصیت
بحار الانوار	علامہ مجلسی	۱۰۳۷ ـ ۱۱۱۱	۱۱۰	یہ کتاب شیعہ معارف کا جامع ترین انسائیکلوپیڈیا ہے
وسائل الشیعہ	شیخ حر عاملی	۱۰۳۳ ـ ۱۱۰۴	۲۰	یہ کتاب کتب اربعہ کی فقہی روایات اور روائی منابع پر مشتمل ہے
مستدرک الوسائل	میرزا حسین نوری	۱۲۵۴ ـ ۱۳۲۰	۲۴	یہ کتاب وسائل الشیعہ کی تکمیل کرتی ہے
الوافی	ملا محسن فیض کاشانی	۱۰۰۷ ـ ۱۰۹۱	۲۳	اس کتاب میں کتب اربعہ کی تمام روایات کی تنظیم کی گئی ہے
منتقی الجمان	حسن بن زین الدین	۹۵۷ ـ ۱۰۱۱	۳	یہ کتاب کتاب حج تک نامکمل ہے
جامع احادیث الشیعہ	آیت اللہ بروجردی	متوفی ۱۳۸۰	۲۶	اس کتاب میں فقہی روایات کی جامعیت قابل توجہ ہے

شیعی علوم حدیث میں جمود کا دور

شیعہ حدیث کی تاریخ بتاتی ہے کہ حدیث کی تلاش، کتابت اور تدوین ائمہ طاہرینؑ کے دور سے شروع ہوئی اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں اس کو عروج ملا یہاں تک غیبت صغریٰ کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور کتب اربعہ کی تدوین ہوئی لیکن ۴۶۰ھ میں شیخ طوسی کی رحلت کے بعد مدارس علمیہ اور علمی محفلوں پر خاموشی چھا گئی اور علم حدیث پر کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا اور جمود کا یہ سلسلہ دسویں صدی ہجری تک مسلسل جاری رہا جبکہ اس دوران فقہ اور شیعی علم کلام میں کوئی جمود نہ رہا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران شیخ مفید، سید مرتضیٰ اور شیخ طوسی نے جس انداز میں فقہ اور اجتہاد پر کام کیا تھا اس کی وجہ سے احادیث پر انحصار کم ہوگیا اور یہی چیز بعد میں علم حدیث کے جمود کا باعث بن گئی پھر جب گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری میں ''محمدون ثلاثہ دوم'' (یعنی محمد بن مرتضیٰ فیض کاشانی (متوفی ۱۰۹۱ھ) اور محمد بن حسن حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ھ) اور علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) نے علم حدیث کا احیاء کیا۔ حدیث کا احیاء، اس عہد میں حدیث کی تکمیل، تشریح اور تنظیم کا کارنامہ انہی علماء عظام کے ذریعے انجام پایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صدوق کے بعد احیاء حدیث کی تحریک ایک طویل عرصے تک ماند پڑی رہی پھر گیارہویں صدی ہجری میں اس کے اندر دوبارہ جان پڑ گئی۔

احیائے حدیث کا یہ دور شیعی فرہنگ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فیض کاشانی، شیخ حر عاملی اور علامہ مجلسی اول و دوم اخباری مکتب فکر کے علم بردار اور حامی تھے البتہ شدت پسند اخباری علماء کے برعکس یہ تینوں حضرات متوازن اور معتدل فکر رکھتے تھے۔

ان بزرگوں نے سابقہ ادوار اور موجودہ دور کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شیعی علم کلام اور فقہ کے دو مکاتب فکر ہیں۔ شیعی علم کلام پر ارسطو کے مشائی فلسفہ اور افلاطون کے نظریہ

مثلاً مدینے میں نقلِ حدیث پر زور دیا جاتا تھا جبکہ کوفہ میں حدیث پر غور وفکر پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس طرح سے تاریخ حدیث میں مختلف مکاتب منظرِعام پر آئے۔

(۲) مطالعہ حدیث کے دبستان کا محدود ہونا

ابن صلاح کے مقدمہ اور مامقانی کی مقباس الہدایہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں تاریخ حدیث کے ابتدائی ادوار اور علوم حدیث پر بحث و تحقیق کی گئی ہے۔ عصر حاضر سے پہلے احادیث سے متعلق کتابوں کی یہی کیفیت تھی۔ عصر حاضر میں مختلف علمی میدانوں میں تحقیق کے مواقع فراہم ہونے کی وجہ سے حدیث کے مباحث پر جستہ جستہ اور محدود طریقے سے بھی بحث و گفتگو ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث سے متعلق خاص موضوعات پر بھی نئے انداز سے تحقیق ہوئی ہے جیسا کہ علل الحدیث کی مباحث، حدیث میں ناسخ ومنسوخ اور صدورِ حدیث کے اسباب پر مستقل کتابیں منظرِعام پر آئی ہیں۔

(۳) روایات کی تنقید و تنقیح

پہلے ادوار میں جوامع حدیث اور اصول حدیث کو تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بہت کم محققین روایات کی تنقید و تنقیح کی جرأت کرتے تھے کیونکہ اس صورت میں انھیں بہت سے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر اب اس سوچ میں تبدیلی آچکی ہے اور عصر حاضر کے محققین نے جوامع حدیث پر تنقید و تنقیح کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ چنانچہ نقد حدیث کے متعلق اہل سنت کے ہاں آخری دہائیوں میں حدیث کی جانچ کے لیے کئی معیارات بنائے گئے نیز شیعی حدیث کی پرکھ کے لیے بھی بہت سے معیارات قائم کئے گئے۔

(۴) معاجم حدیث اور فہرست حدیث کی تدوین

آخری صدی میں بہت سے محققین حدیث نے منابع احادیث سے بہتر طریقے سے استفادے کے لیے ان کتابوں کی لغات اور فہارس تیار کی ہیں۔ اس سلسلے میں دو طرح کے معاجم سامنے آئے ہیں کچھ معاجم میں ایک ہی موضوع کی روایات کو یکجا کیا گیا ہے اور کچھ میں حروف تہجی کی بنیاد پر روایات لکھی گئی ہیں۔

مستشرقین کی طرف سے پہلا مجم المعجم المفھرس لالفاظ الصحاح الستة کے نام سے منظرِعام پر آیا۔ اس طرح اہل سنت کی صحاح ستہ سے کسی روایت کو ڈھونڈنا بہت آسان ہوگیا۔ اسی طرح شیعی کتب حدیث کے لیے بھی معاجم منظرِعام پر آئے جن میں سے حسب ذیل معاجم انتہائی اہم ہیں:

(۱) **معجم المفھرس لالفاظ بحار الانوار**

(۲) **معجم المفھرس لالفاظ الکتب الاربعه**

(۳) **الکاشف لالفاظ نھج البلاغة**

(۵) متقدمین کے آثار اور کتب کا اِحیاء

متقدمین نے ہمارے لیے جو آثار حدیث چھوڑے ہیں وہ علوم حدیث کے وسیع وعمیق مطالب پر مشتمل ہیں۔ یہ آثار اور یہ کتابیں اُن بزرگوں کی اَن تھک کوششوں کی واضح دلیل ہیں۔ ان آثار کا ایک حصہ قدرتی آفتوں، شورشوں اور آتش زنی کے واقعات کی نذر ہو چکا ہے اور جو حصہ ہم تک پہنچا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) بہت سی کتابیں قلمی نسخوں کی شکل میں ذاتی اور عمومی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

(۲) بہت سی کتابیں جو چھپی ہیں اُن میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر کتابیں خرد چھاپے micro printing میں اور متراکب overlapped ہیں یا چوبی چھاپے wooden blocks پر چھاپی گئی ہیں جنھیں پڑھنا ممکن نہیں یہاں تک کہ جو کتاب دس جلدوں میں چھپنی چاہیے تھی وہ دو یا تین جلدوں میں چھپی ہیں۔ ایسے منابع سے استفادہ انتہائی دشوار ہے۔

گزشتہ دو صدیوں میں خاص کر موجودہ صدی میں کچھ افراد نے نیز تحقیقاتی اور علمی مراکز نے متقدمین کے آثار حدیث کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے بہت کام کیا ہے۔ چنانچہ قلمی نسخوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا اور پرانی کتابوں کو دلکش انداز میں چھاپا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کتابوں میں تحقیقی مقدمے لکھے گئے اور مصادر و منابع چھاپے گئے۔ ان کتابوں کے محققین مقدمے میں عام طور پر مؤلف کا تعارف کراتے ہیں اور اُس کی کتابوں، استادوں اور شاگردوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ پھر مؤلف کے طرز نگارش پر تبصرہ کرتے ہیں۔ نیز دوسرے محققین کی نظر میں اس کتاب کا مقام اور بعض اوقات استفادہ کیے گئے نسخوں کے تعارف کے ضمن میں اپنا اُسلوب تحریر بھی بیان کرتے ہیں۔ اس طرح کی مقدماتی باتیں کتابوں کی شناخت اور مؤلفین کے حالات سے آگاہی کے لیے انتہائی فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔

(۶) احادیث کی تحقیق کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات

بعض مستشرقین نے امریکا اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے اسلام شناسی میں ڈگریاں لینے کے لیے اور بعض نے اسلامی ممالک میں رہ کر اسلام شناسی پر اپنے تجزیوں اور تبصروں کے لیے اسلامی منابع کا گہرا مطالعہ کیا اور اسلام شناسی اور حدیث شناسی پر قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مستشرقین میں ہنگری کا گول ڈزیہر Ignác Goldziher (1850-1921) بھی شامل ہے جس نے اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے تحقیق حدیث کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ اُس نے اہل سنت کی تاریخ اور جوامع پر بہت سے اشکالات کیے ہیں (جس کی وجہ سے معاصر اہل سنت علماء اُس سے بہت خفا ہیں) [1] لیکن مستشرقین کی کچھ کتابیں بڑی فائدہ مند بھی ہیں کیونکہ انھوں نے تحقیق کی نئی راہیں کھولی ہیں اور اہل سنت کے جوامع حدیث کے الفاظ کا پہلا معجم انہی مستشرقین کی تالیف ہے۔

(۷) تحقیق حدیث کے لیے کمپیوٹر کی خدمات

کمپیوٹر آخری چند دہائیوں کی بابرکت ایجاد ہے۔ کمپیوٹر نے انسانوں کے اجتماعی تعلقات اور بین الاقوامی معاملات میں بڑی خدمت کرنے کے علاوہ علم و دانش، سائنس اور تحقیق کے میدانوں میں بھی خاصی مدد کی ہے۔ کمپیوٹر اگرچہ مسلمانوں کہ ایجاد نہیں مگر اس کی وجہ سے جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب آیا اسی طرح دین کے مختلف شعبوں منجملہ حدیث کی تحقیق میں بڑی مدد ملی ہے۔

سنی اور شیعہ حدیث کے بہت سے سوفٹ ویئرز منظر عام پر آچکے ہیں اور ان میں جوامع حدیث کے متون، علوم حدیث کی کتابیں اور منابع رجال وغیرہ یکجا کیے گئے ہیں۔ ان سوفٹ ویئرز کے ذریعے انتہائی آسانی کے ساتھ کم سے کم وقت میں ان منابع سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ پر موجود اسلامی کتابوں سے بھی طلباء اور محققین کو حدیث شناسی میں کافی مدد ملتی ہے۔

علم حدیث کے لیے تعلیمی اور تحقیقی مراکز کا قیام، تحقیقی فہارس اور معاجم کی تیاری سے بھی علم حدیث کے میدان میں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔

۱۔ گول ڈزیہر کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے: فرہنگ خاور شناسان ص ۳۲۸۔۳۳۶

تیسرا باب

سنی حدیث کی تاریخ

سنی حدیث کی تاریخ کے ادوار

فقہ، کلام، تفسیر اور فلسفے کی طرح علم حدیث کی بھی ایک تاریخ ہے اور اس سے آگاہی کے ذریعے حدیث کے متعلق ہمارے فکری افق میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ حدیث میں مندرجہ ذیل امور پر گفتگو کی جائے گی:

(۱) چودہ سو برس گزرنے کے بعد ہمارے پاس جو میراثِ حدیث ہے اس کی صحت کا معیار کیا ہے اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حدیث کی کتابت اور جوامع حدیث کی تدوین کب ہوئی؟

سیدھی سی بات ہے کہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ قرآن کی طرح جوامع حدیث بھی حیاتِ رسولؐ میں ہی منظرعام پر آگئے تھے تو پھر ان پر زیادہ اعتماد کیا جائے گا۔ اسی طرح دوسری صدی میں لکھی جانے والی جوامع حدیث کی اہمیت تیسری صدی میں لکھی جانے والی جوامع حدیث سے اور تیسری صدی کی جوامع حدیث کی اہمیت چوتھی صدی کی جوامع سے زیادہ ہے۔ علی ہذا القیاس... جہاں تک شیعی جوامع کی تاریخ کا تعلق ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان جوامع کا منبع "اصول اربعمأۃ" ہے جو ائمہ طاہرینؑ کی زندگی میں مرتب ہوگئے تھے اس لیے شیعی روایات اہل سنت کی روایات سے زیادہ معتبر ہیں۔

(۲) میراثِ حدیث کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس جو کتابیں موجود ہیں ان میں جعلی احادیث کی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ احادیث ملحدوں، یہودیوں، ضعیف الایمان اور دنیا طلب مسلمانوں کی جعل کی ہوئی ہیں۔ ایسی احادیث سنی اور شیعہ دونوں کی کتب احادیث میں موجود ہیں۔ احادیث سازی کے زمانے اور ماحول کا تعین کرنے نیز جعل ساز افراد کے مقاصد کو جاننا ضروری ہے اور جعلی احادیث کو جانچنے کا معیار تلاش کرنا بذاتِ خود ایک تاریخی بحث ہے۔ صحیح اور جعلی روایات کی پہچان سے ہمیں روائی میراث کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کتب حدیث میں جہاں جعلی روایات موجود

ہیں وہاں ہمیں تصحیف اور نقل بالمعنیٰ سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس کی وجہ سے حدیث کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ تاریخ حدیث کو جاننے سے کسی نہ کسی حد تک انسان ان چیزوں کو جان سکتا ہے۔

(۳) طولِ تاریخ میں علماء اور حدیث شناسوں کی طرف سے احادیث کے جو منابع اور آثار فراہم ہوئے ہیں اگر ان کا موازنہ حدیث کی ان تحقیقات سے کیا جائے جو آخری صدی میں سامنے آئی ہیں تو ان کی طرف رجوع کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا ہمیں اُن کے میزانِ اعتبار اور معیارات کی بنیاد پر احادیث کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ منابع حدیث کی تنقیح اور اُن سے ضعیف اور جعلی روایات کو نکالنا اور روایات کے مفاہیم پر فقہ الحدیث کے تحت تحقیق کرنا بڑا دشوار اور وسیع کام ہے۔

(۴) مختلف صدیوں میں لکھی جانے والی احادیث اور علوم حدیث کے میزان اور حجم کی صحیح جانچ سے علوم حدیث کے نشیب و فراز اور اُن عوامل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن کا مسلمان علماء کو سامنا کرنا پڑا۔

یہاں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ شیعی حدیث اور سنی حدیث کی تاریخ ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے ہر مذہب کی تاریخ حدیث کی الگ تحقیق کی جانی چاہیے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مکتب خلفاء میں وفاتِ رسولؐ کے بعد ایک صدی تک کتابتِ حدیث اور نقلِ حدیث پر پابندی عائد رہی جبکہ اہل بیتؑ نے اس دوران میراثِ حدیث کو محفوظ رکھنے اور اس کی کتابت کا مکمل اہتمام کیا۔ واضح الفاظ میں اس حقیقت کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت کے برعکس (جہاں حدیث کی تاریخی کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں) شیعی حدیث کی تاریخ کی کڑیاں مکمل طور پر جڑی ہوئی ہیں اسی لیے حدیثِ اہل سنت اور حدیثِ شیعہ کی تاریخ کو ہم علاحدہ ابواب میں بیان کریں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حدیثِ اہل سنت کی تاریخ مختلف نشیب و فراز کا شکار رہی اور اُن کے ہاں مختلف صدیوں میں احادیث اور منابع احادیث میں جو تبدیلیاں ہوئیں انھیں حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) تدوین حدیث پر پابندی کا دور
(۲) جوامع حدیث کی تدوین کا دور
(۳) جوامع حدیث کی تکمیل اور تنظیم کا دور
(۴) علوم حدیث کے تکامل اور ظہور کا دور
(۵) علوم حدیث کے جمود کا دور
(۶) علوم حدیث کی ترقی کا حیرت انگیز دور

پہلا دور

تدوینِ حدیث پر پابندی کا دور

کتابتِ حدیث اور تدوینِ حدیث پر پابندی کا دور حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت سے شروع ہو کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت (یعنی ۹۹ھ) تک جاری رہا۔ یہ تاریخ حدیث کے مسلمات میں سے ہے جس سے کوئی محقق انکار نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا رسول خدا ﷺ نے اپنی زندگی میں اپنے اصحاب کو حدیث لکھنے سے منع کیا تھا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر اس کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے؟ بہت سے اہل سنت علماء اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حدیث پر پابندی کے حکم کو خلفاء تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے رسول خدا ﷺ کی زندگی تک وسعت دیں اور کچھ روایات سے استناد کر کے لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ خود رسول خدا ﷺ نے حدیث لکھنے سے منع کیا تھا۔

اہل سنت کے کچھ علماء اگرچہ یہ مانتے ہیں کہ حدیث پر پابندی کا آغاز حضرت ابوبکرؓ کی حکومت میں ہوا تھا مگر وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر یہ پابندی لگائی تھی جبکہ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث پر پابندی کے پیچھے سیاسی مقاصد کارفرما تھے اور اس کے نتیجے میں اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت پر دلالت کرنے والی روایات سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ یہ حضرت عمرؓ تھے جنھوں نے رسول خدا ﷺ کی موجودگی میں کتابتِ حدیث کی مخالفت کی تھی۔ تمام شیعہ سنی محدثین اور مورخین نے لکھا ہے کہ رسول خدا ﷺ کے مرض الموت میں آپ کے حجرے میں کچھ صحابہ اور بنی ہاشم کے افراد جمع تھے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: ''میرے لیے کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ جاؤں کہ جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول خدا ﷺ پر درد کا غلبہ ہے۔ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔[1] رسول خدا ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں حضرت عمرؓ

۱۔ صحیح بخاری ج ۱، ص ۴۵۔ صحیح مسلم ج ۲، ص ۱۶۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۳۵۵

نے حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کیا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حدیث لکھنے نہیں دی تھی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں اپنی جمع کردہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو تلف کر دیا تھا۔ پھر انھوں نے یہ حکم دیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث نقل نہ کی جائے۔

بی بی عائشہؓ کا بیان ہے کہ میرے والد نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ ایک رات کو سوئے مگر انھیں آرام نہ آیا۔ اپنے والد کی بے چینی دیکھ کر میں پریشان ہوگئی اور میں نے اُن سے اس بے چینی کا سبب پوچھا۔ جب سورج طلوع ہوا تو انھوں نے کہا: میری بیٹی! تمہارے پاس جتنی احادیث موجود ہیں وہ میرے پاس لے آؤ۔ میں احادیث لے کر آئی تو انھوں نے آگ منگوائی اور انھیں جلا دیا۔[1]

دوسرے مرحلے میں انھوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

تم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی باتیں نقل کرتے ہو اور پھر اُن میں اختلاف کرتے ہو۔ تمہارے بعد اختلافات مزید بڑھ جائیں گے لہٰذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی بات نقل نہ کرو۔ اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے۔ بس اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔[2]

تاریخ بیان کرتی ہے کہ اپنی خلافت کے آغاز میں حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ احادیث جمع کریں اور صحابہ بھی انھیں اس کی ترغیب دلاتے تھے مگر انھوں نے ایک بہانے سے اس کارِ خیر کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ ''عروہ'' بیان کرتے ہیں:

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ سنن (احادیث) کو تحریری صورت دی جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے صحابہ سے مشورہ کیا تو صحابہ نے انھیں اس کام کی ترغیب دلائی۔ حضرت عمرؓ ایک مہینے تک اس مسئلے پر سوچتے رہے اور خدا سے رہنمائی کی درخواست کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے ان کے عزم کو استحکام بخشا۔ چنانچہ ایک دن وہ کہنے لگا:

میں احادیث لکھوانا چاہتا تھا مگر مجھے تم سے پہلے کی قومیں یاد آگئیں جنھوں نے (اپنے انبیاء

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۵۔ تاریخ الاسلام الثقافی والسیاسی ص ۳۶۲ ۔ ۳۶۳

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۳۔ معالم المدرستین ج ۲، ص ۴۴

کے ارشادات پر مبنی) کتابیں لکھیں اور انہی کتابوں میں کھو گئے اور کتابِ خدا کو چھوڑ دیا۔ خدا کی قسم! میں کتابِ خدا میں کسی چیز کی آمیزش نہیں کروں گا۔[1]

اس طرح حضرت عمرؓ نے نہ صرف تدوینِ حدیث کے لیے کوئی اقدام نہ کیا بلکہ سابقہ خلیفہ کی طرح تدوینِ حدیث کے ہر اقدام سے لوگوں کو باز رکھا اور جب انھیں پتا چلا کہ احادیث زیادہ ہو چکی ہیں اور کچھ لوگ حدیث کی کتابت کر رہے ہیں تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ احادیث کے مجموعے میرے پاس لاؤ۔ لوگ احادیث کے مجموعے لے کر آئے تو انھوں نے حکم دیا کہ انھیں جلا دیا جائے۔[2]

خطیب بغدادی رقمطراز ہیں: حضرت عمرؓ کو رپورٹ دی گئی کہ لوگوں نے احادیث کو کتابی صورت میں جمع کیا ہے اور بہت سی کتابیں منظرِعام پر آگئی ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ بہت ناراض ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان احادیث کی کتابیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو جمع کرنے والے خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں لہٰذا تم اپنی کتابیں میرے پاس لے آؤ تاکہ میں ان کے بارے میں رائے دے سکوں۔ اُن کی یہ بات سن کر لوگ سمجھے شاید وہ ان احادیث میں کچھ چھان بین کر کے کوئی معیار مقرر کریں گے اور احادیث میں موجود تعارض کو دور کریں گے اسی لیے کتابیں طلب کر رہے ہیں مگر جب کتابیں لائی گئیں تو انھوں نے سب کتابیں جلا ڈالیں۔[3]

حضرت عمرؓ حدیث پر پابندی کے معاملے میں اتنے سنجیدہ تھے کہ انھوں نے عبداللہ بن مسعود، ابو درداء اور ابو مسعود انصاری جیسے اکابر صحابہ کو احادیث بیان کرنے کی وجہ سے قید میں ڈال دیا تھا۔[4] اُن کے علاوہ بھی جو مسلمان دوسرے شہروں میں حدیث بیان کیا کرتے تھے اُن سب کو حضرت عمرؓ نے مدینہ بلایا اور جب تک زندہ رہے انھیں مدینہ سے باہر جانے نہ دیا۔

عبدالرحمان بن عوف بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بلادِ اسلامی سے عبداللہ بن حذیفہ، ابو درداء، ابوذر غفاری، عقبہ بن عامر اور دوسرے صحابہ کو مدینے بلا کر اُن سے کہا کہ یہ کیسی احادیث ہیں جو تم شہروں میں پھیلا رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ کیا آپ ہمیں حدیثِ رسولؐ بیان کرنے سے منع کرتے

۱۔ تقیید العلم ص ۵۰

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۱۴۰

۳۔ تقیید العلم ص ۵۲

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۷۵۔ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۴۳۶

ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس رہو۔ جب تک میں زندہ ہوں تم مجھ سے جدا نہ رہو کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم سے کیا لینا چاہیے اور کیا نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ جب تک حضرت عمرؓ زندہ رہے یہ صحابہ اُن کے پاس مدینہ میں رہے۔[۱] اور اگر حضرت عمرؓ کو کسی مجبوری کے تحت صحابہ کو شہر سے باہر بھیجنا پڑتا تو انھیں یہ نصیحت کرنا نہیں بھولتے تھے کہ باہر جا کر احادیث نقل نہ کرنا۔

قرظہ بن کعب کہتے ہیں:

حضرت عمرؓ ہمیں عراق بھیج رہے تھے چنانچہ وہ ہمیں وداع کرنے ''صرار'' نامی جگہ تک ساتھ آئے اور راستے میں بولے کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تمھیں وداع کرنے کیوں آیا ہوں؟ ہم نے کہا: ہمارے احترام کے لیے۔ وہ بولے کہ اس کے علاوہ بھی ایک مقصد سے آیا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم ایسی سرزمین کی طرف جا رہے ہو جہاں کے لوگ قرآن سے بہت مانوس ہیں۔ ان کے گھروں سے تلاوت قرآن کی آوازیں یوں آتی ہیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں بھنبھناتی ہیں۔ اُن کو اس سے نہ روکنا اور اُن کو حدیث میں مشغول نہ کرنا۔ اُن سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کم سے کم بیان کرنا۔[۲]

روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ یہ تاکید کیا کرتے تھے: **اقلوا الروایة عن رسول اللہ الا فیما یعمل به** یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات بہت کم نقل کیا کرو مگر یہ کہ اُن کا تعلق عمل سے ہو۔[۳]

حضرت عمرؓ کے ان اقدامات کی وجہ سے بہت سے اکابر صحابہ نے مخصوص مواقع کے علاوہ احادیث لکھنا یا بیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کی سہل پسندی اور بعض تاریخی شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے دور میں حدیث پر عائد پابندیوں میں وہ سختی باقی نہ رہی مگر اس کے باوجود کسی کو تدوینِ حدیث کی اجازت بھی نہیں تھی۔[۴] حضرت ابوذرؓ جیسے صحابی پر احادیث بیان کرنے پر پابندی تھی۔[۵]

۱۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۴، ص ۵۰۰۔ کنز العمال ج ۱۰، ص ۲۹۳

۲۔ سنن ابن ماجہ ج ۱، ص ۱۲۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۱۰۲

۳۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۶۷، ص ۳۴۴۔ البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۱۵

۴۔ قرظہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اعلان کیا کہ جو حدیث ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں نہ سنی گئی ہو، کوئی اسے بیان نہ کرے۔ (طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۳۳۶)

۵۔ طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۳۳۶۔ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۳۲۳۔۳۳۶

مکتبِ خلفاء کی طرف سے حدیث پر پابندی کے دلائل کا جائزہ

مکتبِ خلفاء کے علماء خلفاء کی طرف سے حدیث پر پابندی کو جائز قرار دینے کے لیے کہتے ہیں کہ کتابتِ حدیث پر پابندی خلفاء نے نہیں بلکہ خود رسول خدا ﷺ نے لگائی تھی۔ اس حوالے سے ہم اب اُن کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

رسول اکرم ﷺ سے منسوب روایات اور اُس مفہوم کی کچھ روایات بھی مکتبِ خلفاء کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ذیل میں ہم اُن روایات کا پوری دیانت داری سے جائزہ لیتے ہیں:

کتابتِ حدیث پر پابندی کی روایت تین صحابہ سے نقل کی گئی ہے جن کے نام یہ ہیں: ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور ابو ہریرہ۔ ان میں سے ابوسعید کی روایات زیادہ اہم ہیں۔

ڈاکٹر رفعت رقمطراز ہیں: اس سلسلے (حدیث پر پابندی) کی جتنی بھی روایات ہیں وہ سب ضعیف ہیں مگر ابوسعید خدری کی روایت ضعیف نہیں ہے۔[۱]

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کے مطابق کتابتِ حدیث کی ممانعت کے متعلق صرف ابوسعید خدری کی روایت صحیح ہے باقی روایات صحیح نہیں ہیں۔[۲]

یہ حدیث دو طرح سے منقول ہے۔ ایک روایت میں رسول خدا ﷺ کا فرمان یوں نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: **لا تکتبوا عنی شیئا الا القرآن ومن کتب عنی شیئا غیر القرآن فلیمحه** میری طرف سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے۔[۳]

دوسری دو روایتوں میں اُن سے یوں منقول ہے کہ ہم نے رسول خدا ﷺ سے کتابتِ حدیث کی اجازت مانگی مگر آپ نے ہمیں اجازت نہیں دی۔[۴]

زید بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ہمیں حدیث نہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔[۵] یا روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔[۶]

۱۔ توثیق السنۃ ص ۴۶ بحوالہ مقالہ تدوینِ حدیث ۲۔ فصل نامہ علوم حدیث ش ۲، ص ۳۵

۲۔ دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ ج ۱، ص ۸۰

۳۔ مستدرک ج ۱، ص ۱۲۷۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۱۲ و ۲۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۲۸۸

۴۔ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۲۹۵

۵۔ سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۱۷۶

۶۔ تقیید العلم ص ۳۵

ابو ہریرہ کی روایات تین طرح سے نقل ہوئی ہے:

پہلی روایت یوں شروع ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ہمارے پاس اُس وقت تشریف لائے جب ہم احادیث لکھنے میں مشغول تھے۔ آپ نے پوچھا کہ تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم آپ سے سنی ہوئی احادیث لکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم قرآن کے علاوہ کوئی دوسری کتاب چاہتے ہو؟ تم سے پہلے کی امتیں اسی لیے گمراہ ہوئیں کہ انھوں نے آسمانی کتاب کے مقابلے میں دوسری کتابیں لکھی تھیں۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا ہم آپ سے حدیث نقل کر سکتے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہاں۔ تم میری طرف سے حدیث نقل کر سکتے ہو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں لیکن جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔[1]

دوسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے کتابتِ حدیث سے منع کیا تھا اور انھوں نے تمام کتابت شدہ احادیث منگوا کر انھیں جلا دیا تھا۔[2]

تیسری روایت یوں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو بتایا گیا کہ لوگوں کی ایک جماعت نے آپ کی احادیث جمع کی ہیں۔ یہ سن کر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

”تم نے میری باتوں پر مبنی جو کتابیں لکھی ہیں یہ کیا ہیں؟ میں تو صرف ایک بشر ہوں۔ جس کسی کے پاس میری احادیث ہیں وہ انھیں مٹا دے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ہم ان احادیث کو آپ کے پاس لے آئے اور آپ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! کیا ہم آپ سے حدیث (زبانی) نقل کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھ سے حدیث نقل کرو۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں (مگر یاد رکھو) جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے گا۔“[3]

بہت سے سنی علماء اس روایت کے ضعیف ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ ایک گروہ ابو سعید خدری کی روایت کو موقوف یا مرفوع سمجھتا ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس حدیث کے بعض راویوں مثلاً زید بن اسلم اور اُس کے بیٹے عبدالرحمان بن زید یا کثیر بن زید کو موثق نہیں جانتا۔

۱۔ تقیید العلم ص ۳۵

۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۱۳

۳۔ تقیید العلم ص ۳۵

سند ضعیف ہونے کے علاوہ ان روایات کی دلالت بھی مشکوک ہے مثلاً کہا گیا ہے فابی ان یاذن لی یا فابی ان یاذن لنا کا جملہ صرف ابو سعید خدری یا چند مخاطبین کے لیے ہی مخصوص ہو۔[۱]

سابقہ روایات کے متن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ایک صفحے پر قرآن کے پہلو بہ پہلو احادیث لکھنے سے منع کیا تھا کیونکہ اس بات کا احتمال تھا کہ قرآن اور حدیث مخلوط ہو جائیں اور حدیث، قرآن کے مشتبہ ہونے کا باعث بنے۔[۲]

دوسری طرف ان روایات میں سے بعض جیسے ابو ہریرہ کی بیان کردہ پہلی اور تیسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے کتابتِ حدیث سے منع کرنے کی بجائے کتابت حدیث کی تاکید کی ہے البتہ جعلی احادیث بنانے سے منع فرمایا ہے۔

اسناد اور دلالت کے جھگڑے سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو ان روایات کے مضامین بالخصوص ابو ہریرہ کی پہلی روایت کا مضمون اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان روایات کا مقصد خلفاء کی طرف سے حدیث پر پابندی کی سیاست کا دفاع کرنا ہے کیونکہ مذکورہ روایات میں جو دلائل رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیے گئے ہیں یہ بعینہٖ وہی دلائل ہیں جو خلفاء نے بیان کیے ہیں مثلاً حدیث میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ امتوں نے دوسری کتابیں لکھنے کی وجہ سے آسمانی کتاب سے منہ پھیر لیا۔ یہ استدلال حضرت عمرؓ نے حدیث پر پابندی لگانے کے لیے کیا تھا۔ باقی رہا یہ جملہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو صرف ایک بشر ہوں دراصل وہ جملہ ہے جو قریش نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کہا تھا۔ اس واقعے کو خود عبداللہ بن عمرو بن العاص کی زبانی سنئے۔ وہ کہتے ہیں:

میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا اسے لکھ لیتا تھا۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے فرمودات ضائع نہ ہو جائیں۔ قریش نے مجھے اس کام سے روکنے کی کوشش کی اور کہا تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات لکھتے رہتے ہو جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی تو آخر ایک بشر ہی ہیں جو خوشی اور غصے کے عالم میں باتیں کرتے ہیں۔ اُن کی یہ بات سن کر میں نے حدیث لکھنا چھوڑ دی۔ پھر میں نے ایک دن قریش کی یہ بات آنحضرتؐ کے گوش گزار کی۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا: تم لکھتے رہو۔ پھر آپ نے اپنے دہن اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! اس سے حق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔[۳]

۱۔ اس تنقید سے آگاہی کے لیے دیکھئے: کتاب تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۳۰۰۔ ۳۰۲

۲۔ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۳۱۸ بحوالہ تیسیر الوصول ج ۳، ص ۱۷۷

۳۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۱۰۶

بہر حال مخالفین نے حدیث کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ایسا کہا مگر آنحضرتؐ نے اُن لوگوں کے اس خیال کو رد کیا اور فرمایا کہ میرے منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ کیا آنحضرتؐ کی اس وضاحت کے بعد کتابتِ حدیث پر پابندی کے حوالے سے مخالفین کا نظریہ مانا جا سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ نے کتابتِ حدیث سے منع کیا تھا تو پھر اہل سنت کے عظیم القدر محدثین نے اور صحاح ستہ کے مؤلفین نے کس دلیل کی بنیاد پر اپنی کتابیں لکھیں؟ کتابتِ حدیث کی ممانعت کی روایات صحیح ہیں تو ایسی دسیوں روایات اور شواہد کا کیا کریں گے جن میں کتابتِ حدیث کا حکم دیا گیا ہے؟ چنانچہ روایات کے اس تعارض کو ختم کرنے کے لیے علمائے اہل سنت نے عجیب و غریب تاویلات کی ہیں تاکہ اس تعارض کو ختم کیا جائے۔

ممانعت اور اجازت کی روایات کے تعارض کو ختم کرنے کا طریقہ

(الف) کمزور حافظہ رکھنے والے افراد کو احادیث لکھنے کی اجازت دی گئی

اس نظریے کا دفاع کرنے والے اُن روایات سے استناد کرتے ہیں جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمزور حافظہ رکھنے والوں کے لیے کتابت کی اجازت مرحمت فرمائی تھی مثلاً عبدالرحمان بن صخر الازدی المعروف ابو ہریرہ سے نقل ہوا ہے کہ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبے کے اختتام پر ایک یمنی مسلمان "ابو شاۃ" نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ میرے لیے تحریر فرما دیجیے۔ آنحضرتؐ نے اپنے کاتب سے فرمایا: یہ خطبہ لکھ کر ابو شاۃ کو دے دو۔[1]

امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ بن حنبل اس بات کے قائل ہیں کہ کتابتِ حدیث کے باب میں اس سے زیادہ صحیح روایت نہیں ملتی۔[2]

مشہور مفسر قرآن رشید رضا نے کہا ہے کہ کتابتِ حدیث کے بارے میں ابو ہریرہ سے منقول ابو شاۃ یمنی والی روایت صحیح ترین روایت ہے اور یہ بخاری و مسلم میں بھی نقل ہوئی ہے۔[3]

نیز ابو ہریرہ کی ایک اور روایت میں ہے کہ انصار کا ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت

۱۔ تدریب الراوی ج ۲، ص ۶۲

۲۔ تدوین السنۃ الشریفہ ص ۸۸

۳۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۴۸

میں حاضر ہوا اور بڑی توجہ سے آپ کی باتیں سننے لگا۔ اُس کا حافظہ کمزور تھا چنانچہ وہ آپ کی باتیں یاد نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ اپنے حافظے کی شکایت لے کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا:

استعن بیمینک اپنے ہاتھ سے اپنی مدد کرو پھر آپ نے اسے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ کیا[۱]

لہٰذا ظاہر ہے کہ دونوں روایات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمزور حافظہ رکھنے والے لوگوں کے لیے روایات لکھنے کی اجازت دی تھی۔ جب ہم روایات نہ لکھنے کی احادیث ان روایات کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ممانعتِ کتابت کی روایات عام اور اجازتِ کتابت کی روایات خاص ہیں۔

یہ استدلال غلط ہے کیونکہ درست ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمزور حافظہ رکھنے والوں کے لیے کتابتِ حدیث کی اجازت دی تھی اور اُن کو کتابت کا حکم دیا تھا مگر یہ اجازت صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ یہ تو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے حدیث لکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

دوسری صورت میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ قریش کی مخالفت کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عبداللہ بن عمرو بن عاص کو حدیث لکھنے کی اجازت دینا کیا کمزور حافظے کی وجہ سے تھا؟ بی بی عائشہؓ کے بقول حضرت ابوبکرؓ نے جو ۵۰۰ احادیث لکھی تھیں جن کو انھوں نے بعد میں جلا دیا کیا اس بنا پر لکھی تھیں کہ اُن کا حافظہ کمزور تھا؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وقت آخر یہ خطاب کہ قلم دوات لے آؤ تاکہ میں ایسی دستاویز لکھ دوں جس کے بعد امت کبھی گمراہ نہ ہو کیا تمام صحابہ سے نہ تھا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ مہاجرین اور انصار کے بزرگ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اُن سب کا حافظہ کمزور ہو؟ کیا حضرت علیؑ نے نہیں فرمایا کہ — اس دعائے پیغمبرؐ کے بعد کہ اللہ تمھیں نہ بھولنے والا حافظہ عطا فرمائے — میرا حافظہ اتنا تیز ہو گیا کہ میں آنحضرتؐ کی ارشادات میں سے ایک حرف بھی نہیں بھولا۔ کیا امام نے احادیث پیغمبرؐ کو ''کتابِ علیؑ'' کے نام سے مشہور کتاب میں جمع نہیں کیا تھا؟

(ب) کتابت جاننے والے افراد کو احادیث لکھنے کی اجازت دی گئی

ڈاکٹر عجاج خطیب نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا ہے:

عموماً حدیث لکھنا منع تھا مگر خاص صورتوں میں اس کی اجازت تھی۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص

۱۔ سنن ترمذی ج ۴، ص ۱۴۶۔ کنز العمال ج ۱۰، ص ۲۴۵

جیسے خواندہ لوگوں کو، جن کے بارے میں خطا و سہو کا خدشہ نہیں تھا، پیغمبر اکرم ﷺ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی تھی مگر عام لوگوں کو منع کر دیا تھا۔[1]

ڈاکٹر عجاج کا خیال ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا عام حکم تو کتابت کی ممانعت کے بارے میں تھا مگر کچھ لوگوں کو۔ جن کے بارے میں یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ قرآن مجید کو حدیث کے ساتھ ملا دیں گے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی تھی۔[2]

اس نظریے پر بھی اعتراضات ہیں اور یہ رد کرنے کے قابل ہے۔ ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر خطا و سہو سے مراد نقل حدیث میں سہو ہے تو وہ لوگ جن کے بارے میں سہو کا خوف تھا اُن کو کتابت کی اجازت بطریق اولیٰ دی گئی بالفاظ دیگر عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اس خیال سے حدیث لکھنے کی اجازت دی گئی کہ وہ خطا و اشتباہ نہیں کریں گے تو یہ احتمال تمام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے دیا جانا چاہیے اور اس کی ضرورت بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ کتابت خطا و اشتباہ سے بچنے کا بہترین اوزار ہے۔ اگر اشتباہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیث کو ایک جگہ لکھا جائے اور اُن دونوں میں کوئی فرق نہ ہو تو قرآن مجید اور حدیث کے باہم خلط ملط ہونے کا احتمال ہے اور یہ احتمال اپنی جگہ موجود رہے گا چاہے لکھنے والا عبداللہ بن عمرو بن عاص جیسا شخص ہو یا کوئی اور ہو۔

(ج) ممانعت کی روایت کا ناسخ ہونا

اس بنیاد پر کتابتِ حدیث کی ممانعت کا حکم حیات رسولؐ کے اختتام پر صادر ہوا تھا اور اجازت والی روایات کی ناسخ حدیث اس سے پہلے آئی ہے اس بنا پر رحلت پیغمبرؐ کے بعد حدیث لکھنا ممنوع ہے۔

محمد رشید رضا لکھتے ہیں: اگر ہم فرض کریں کہ اجازت اور ممانعت والی روایات کے درمیان تعارض ہے، تضاد ہے تو صحیح یہ ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسری کی ناسخ مانیں اور دو دلیل کی بنا پر ممانعت والی روایات کو اجازت والی روایات کی ناسخ مانیں:

(۱) ایک گروہ نے رحلتِ رسولؐ کے بعد صحابہ کی سیرت سے کتابتِ حدیث سے اجتناب کو استناد کیا۔

(۲) صحابہ نے رسول اکرم ﷺ کی احادیث کو مدون کرنے اور پھیلانے کے سلسلے میں اقدامات نہیں کئے تھے اور اگر انھوں نے ایسا کیا تھا تو اُن کی لکھی ہوئی احادیث بعد میں آنے والے طبقات کی

---

۱ و ۲۔ السنۃ قبل التدوین ص ۳۰۶

دسترس میں ہوتیں۔[۱]

چنانچہ محمد رشید رضا نے تدوین و تالیف حدیث کے بارے میں صحابہ کی بے رغبتی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رسول اکرم ﷺ حدیث کی کتابت اور تدوین کے طرفدار نہیں تھے۔

یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اولاً کتابتِ حدیث کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے وقت حضرت عمرؓ کی مخالفت ہمارے سامنے ہے۔ کتابتِ حدیث کے بارے میں یہ رسول اکرم ﷺ کا آخری کلام تھا اور اہل سنت کے بعض محققین نے تصریح کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا یہ اقدام اور کلام کتابتِ حدیث کے جواز پر نہایت اہم سند ہے۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ نے کوئی کلام نہیں فرمایا کہ وہ کتابت کی ممانعت کا ناسخ بن سکے۔

ثانیاً یہ کہ اگر ممانعت والی روایات ناسخ ہوں تو جو لوگ حدیث کی کتابت یا تدوین حتیٰ کہ اس کی نقل سے بھی روکتے تھے انھیں ایک مہینے تک صحابہ کے ساتھ مشورہ اور غور وفکر کرنے کی کیا ضرورت تھی جیسا کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے اور یہ بہانہ تراشنے کی بھی کیا ضرورت تھی کہ قرآن اور حدیث باہم مخلوط نہ ہوجائیں یا یہ کہ مسلمان قرآن سے کہیں روگردان نہ ہوجائیں اور یہ استناد عبداللہ بن مسعود جیسے بعض صحابہ کے اقدامات سے بچنے کے لحاظ سے زیادہ اطمینان بخش ہوتا۔

ثالثاً اگر یہ دعویٰ صحیح ہو تو تدوینِ حدیث کا کام جو دوسری صدی ہجری کے آغاز سے آج تک جاری ہے خلاف شرع اور حرام کام ٹھہرتا ہے اور بدعت قرار پاتا ہے کیونکہ سب یہ جانتے ہیں کہ حلال محمد قیامت تک حلال اور حرام محمد قیامت تک حرام ہے۔

اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ کتابت کی اجازت کو پیغمبر اکرم ﷺ نے منسوخ کیا ہے تو پھر بابِ اذن ونہی کو کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(د) روایات اجازت کا ناسخ ہونا

ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں: حدیث لکھنے کی ممانعت کا معاملہ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے اوائل سے متعلق ہے کیونکہ آنحضرتؐ کو اندیشہ تھا کہ تفسیری مطالب اور آپ کی سیرت قرآن مجید کے ساتھ آپس میں خلط ملط نہ ہوجائے کیونکہ اس وقت یہ تمام چیزیں قرآن کے ساتھ لکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کے اکثر سوروں کے نزول کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کی زیر نگرانی متعدد مسلمانوں کے قرآن کو

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۴۸۔ ۴۹

حفظ کرنے کے بعد یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ قرآن اور حدیث خلط ملط ہوجائیں گے چنانچہ آپ نے کتابتِ حدیث کا حکم دیا اور فرمایا: قیدوا العلم بالکتابۃ۔[۱]

اس نظریے کی بنیاد پر خلفاء کی طرف سے کتابت و تدوین حدیث کی ممانعت کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ روایات پیغمبر سے اس کو ثابت کیا جائے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو بھی حل اس بابت پیش کیے گئے ہیں وہ قانع کنندہ نہیں ہیں۔

اس حکم کے ذریعے لوگوں کو باہمی اختلاف سے بچایا گیا

جب بی بی عائشہؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو کیوں جلا رہے ہیں تو انھوں نے کہا میں اس حالت میں مرنے سے ڈرتا ہوں کہ جن احادیث پر مجھے اطمینان تھا وہ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل نہ ہوئی ہوں۔[۲] حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک اور خطاب میں لوگوں سے کہا تھا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایات نقل کر رہے ہو اُن میں تمہارے درمیان اختلاف ہے اور جو لوگ تمہارے بعد آئیں گے وہ تم سے کہیں زیادہ اختلاف کریں گے لہٰذا احادیث بیان نہ کرو۔[۳]

واضح رہے کہ یہ استدلال صرف حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا۔ اُن کے علاوہ دوسرے خلفاء اور علمائے اہل سنت نے حدیث پر پابندی کا اس طرح دفاع نہیں کیا۔ بلاشبہ یہی اس استدلال کے کمزور اور بے اعتبار ہونے کو ثابت کرتا ہے کیونکہ

(۱) حضرت ابوبکرؓ نے امت کے اختلاف کا اعلان وفاتِ پیغمبرؐ کے ایک یا دو سال بعد کیا تھا جسے علمائے اہل سنت بھی قبول نہیں کرتے کیونکہ ہمیشہ اُن کا اصرار رہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد چالیس برس تک مسلمانوں میں ایمان اور عقیدے کے حوالے سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔[۴]

۱۔ علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۷۔۹

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۵

۳۔ علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۳۹

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: السنة و مکانتها من التشریع الاسلامی ص ۷۵۔ السنة قبل التدوین ص ۱۸۷ ۔ ۱۸۹۔ الحدیث والمحدثون ص ۸۰۔ لمحات من تاریخ السنة المشرفة ص ۳۶۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ مسلمان ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد فرقوں میں بٹ گئے جبکہ کچھ کہتے ہیں کہ جنگ صفین کے بعد اور کچھ کہتے ہیں کہ ۴۰ھ میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد مسلمان الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے۔

(۲) اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ احادیث مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا باعث بن رہی تھیں تو پھر اس کا حل کیا تھا؟ کیا اس کا حل صرف یہی تھا کہ احادیث کو سرے سے لکھا ہی نہ جائے اور جس کے پاس احادیث کا ذخیرہ موجود ہو اسے نذر آتش کردیا جائے؟ کیا اس کے علاوہ اور کوئی حل موجود نہ تھا؟ خلیفہ اول سے پورے ادب کے ساتھ یہ پوچھنا چاہیے کہ مسلمان اپنے دین کے مسائل کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے محتاج ہیں یا نہیں؟ اگر وہ اس کے محتاج ہیں تو پھر آپ احادیث کے مخطوطات کو نذر آتش کر کے اُن کی ضرورت پر خط بطلان کیوں کھینچ رہے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ سنت کے مکتوبی نسخوں میں غلطی کا امکان تھا تو پھر زبانی بیان کی جانے والی احادیث جو صرف حافظے کی بنیاد پر یاد ہوتی ہیں اُن پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے جبکہ اس صورت میں غلطی کا امکان دگنا ہوتا ہے!!

(۳) اگر عصر رسالت کے نزدیک ترین زمانے میں لکھی جانے والی روایات امکانِ خطا کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں اور خلیفہ نے اُن کو جلانے کا حکم دیا تو پھر ایسی کتابوں پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے جو آنحضرتؐ کی رحلت کے سو سال بعد وجود میں آئی ہوں؟

حضرت عمرؓ کتابتِ حدیث کے شدید مخالف تھے۔ خطیب بغدادی اُن کے اس عمل کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ نے دین میں احتیاط کے پیش نظر یہ اقدام کیا تھا کیونکہ انھیں یہ خوف تھا کہ مبادا لوگ احادیث کے ظاہری الفاظ پر ہی قناعت نہ کرلیں اور اُن کے معانی سے بے خبر رہیں ... یا کہیں حدیث کا الٹا مفہوم نہ لے لیا جائے ... اور حضرت عمرؓ نے حدیث کے متعلق یہ سخت رویہ اس لیے اپنایا تھا تاکہ حدیث محفوظ رہے اور جو لوگ صحابی نہیں تھے اس سے اُن کو تنبیہ کرنا مقصود تھا تاکہ وہ اپنے ذاتی خیالات کو حدیث میں شامل نہ کریں۔[۱] واضح رہے کہ خطیب بغدادی نے حضرت عمرؓ کے عمل پر جو دلیل دی ہے اس سے تو کتابتِ حدیث کی ممانعت کی بجائے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث کا لکھنا ضروری ہے۔

قرآن اور حدیث کے مخلوط ہونے کا خوف

مکتبِ خلفاء کے علماء اپنے بزرگوں کے اس اقدام کا یوں دفاع کرتے ہیں کہ خلفاء نے حدیث کی کتابت اور تدوین پر اس لیے قدغن لگائی کہ انھیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں قرآن اور حدیث باہم مخلوط نہ ہوجائیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک ہی صفحے یا ایک ہی کتاب پر قرآن اور احادیث کو ساتھ

۱۔ شرف اصحاب الحدیث ص ۹۷ - ۹۸ بحوالہ مقالہ تدوین حدیث (۵) فصل نامہ علوم حدیث ش ۶، ص ۲۳

ساتھ لکھا جاتا تو لوگ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی پڑھتے اور آہستہ آہستہ احادیث کے متعلق یہ گمان کرنے لگتے کہ یہ بھی قرآن ہی کا حصہ ہیں۔ چنانچہ ابو ہریرہ کی بیان کردہ روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اِمْحَضُوْا كِتَابَ اللهِ وَاَخْلَصُوْهُ یعنی کتاب اللہ کو علاحدہ لکھو اور اسے کسی چیز سے مخلوط نہ کرو۔[۱]

اور حضرت عمرؓ نے بھی امتناع نشر حدیث کی ایک دلیل یہی دی تھی اور کہا تھا: ... وَاِنِّيْ وَاللهِ لَا اَلْبِسُ كِتَابَ اللهِ بِشَيْءٍ اَبَدًا خدا کی قسم! میں کتاب اللہ کو کسی چیز سے کبھی مخلوط نہیں ہونے دوں گا۔[۲]

ابو سعید خدری کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ جب کسی نے اُن سے کہا کہ آپ ہمیں احادیث لکھوائیں تو انھوں نے کہا تھا: میں احادیث نہیں لکھوں گا اور انھیں قرآن کا حصہ نہیں بناؤں گا۔[۳]

ابن صلاح لکھتے ہیں کہ کتابتِ حدیث سے اس لیے منع کیا گیا تھا کہ قرآن اور احادیث مخلوط نہ ہوجائیں۔ جب یہ خطرہ ٹل گیا تو ممانعت کا حکم خود بخود ختم ہوگیا۔[۴]

خطیب بغدادی اس نظریے کی توجیہ یوں کرتے ہیں:

بزرگوں کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں قرآن کے ساتھ غیر قرآن مخلوط نہ ہوجائے اس لیے وہ کتابتِ حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صدر اسلام میں حدیث لکھنے سے منع کیا گیا کیونکہ اُس وقت ایسے فقیہ اور سمجھ دار لوگ بہت کم تھے جو کلام ربانی اور کلام انسانی کا فرق جان سکیں۔ اُس دَور میں عربوں کی اکثریت فہم دین سے عاری تھی اور دین کو سمجھنے والے علماء سے اُن کی نشست و برخاست بھی نہ تھی۔ اسی لیے اُن لوگوں کے متعلق یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں یہ لوگ حدیث کو قرآن کے ساتھ مخلوط نہ کردیں اور غیر قرآنی کلام کو کلام خدا نہ سمجھنے لگیں۔[۵]

سمعانی بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ابتدا میں احادیث کی کتابت کو اس لیے ناپسند کیا گیا کہ کہیں وہ قرآن کے ساتھ مخلوط نہ ہوجائیں مگر جب یہ خطرہ ٹل گیا تو حدیث کی کتابت جائز ہوگئی۔[۶]

۱۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۲ ۔ ۱۳

۲۔ تقیید العلم ص ۴۹

۳۔ کتاب تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۳۱۷

۴۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱۹

۵۔ تقیید العلم ص ۵۷

۶۔ ادب الاملاء والاستملاء ص ۱۴۶

عصر حاضر کے محققین حدیث میں سے ڈاکٹر صبحی صالح نے بھی اسی نظریے کی تاکید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: نزول وحی کے آغاز میں رسول خدا ﷺ کو یہ اندیشہ تھا کہ خدا کے کلام میں کہیں ان کا کلام، تشریح اور سیرت شامل نہ ہوجائے اسی لیے آپ نے کتابتِ حدیث سے منع کیا تھا کیونکہ جب حدیث کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صحیفے میں لکھا جاتا تو یہ خطرہ موجود رہتا۔[1]

یہ نظریہ کئی وجوہات کی بنا پر غلط ہے:

(۱) پہلی روایت — جسے رسول اکرم ﷺ کی طرف نسبت دی گئی ہے — کے علاوہ حضرت عمرؓ کی بات اور ظاہراً ابوسعید خدری کی گفتگو کا تعلق رحلتِ رسولؐ کے بعد کے زمانے سے ہے۔ یہ وہ دور تھا جب کاتبانِ وحی کے ذریعے سے قرآن لکھا جا چکا تھا اور تمام صحائف یا جمع شدہ صحیفے پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اُس دَور میں بہت سے مسلمان پورا قرآن حفظ کر چکے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کیونکر درست ہوسکتا ہے کہ حدیث اور قرآن کہیں مخلوط نہ ہوجائیں اس لیے کتابت حدیث پر پابندی لگائی گئی؟

(۲) استدلال کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث کے مخلوط ہونے کا خطرہ دو وجوہات کی بنا پر تھا:

(۱) یہ کہ ایک ہی صفحے پر یا ایک ہی کتاب میں قرآن اور حدیث کو لکھا جاتا تو اس کے مخلوط ہونے کا شدید خطرہ تھا۔

(۲) یہ کہ صدر اسلام کے لوگوں کی اکثریت فہم دین سے عاری تھی۔ وہ لوگ قرآن اور حدیث میں فرق کرنے کے قابل نہیں تھے اس لیے خلفاء نے کتابتِ حدیث پر پابندی عائد کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ اُس دور کے سارے لکھنے والے احادیث کو قرآن کے ساتھ ملا کر لکھا کرتے تھے جس کی وجہ سے خلفاء کو یہ خطرہ محسوس ہوا؟!

(۳) مذکورہ نظریے کی بنیاد قرآن اور حدیث کو ایک سطح کا سمجھنا ہے۔ یہ حضرات شاید یہ بھول گئے کہ قرآن فصاحت اور بلاغت میں معجزہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ لکھا کہ اگر حدیث لکھی جاتی تو لوگوں کو پتا ہی نہ چلتا کہ قرآن کون سا ہے اور حدیث کون سی ہے حالانکہ یہ نظریہ پیش کر کے عملی طور پر قرآن کے معجز بیانی سے انکار کیا گیا ہے اور یہ تاثر دیا گیا ہے کہ غیر قرآن بھی — اگر حدیث ہو تو — قرآن کا

۱۔ علم الحدیث و مصطلحہ ص ۲۰

ہم پلہ ہوسکتا ہے جبکہ کوئی بھی محقق اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا۔

علامہ محمد ابوریہ اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں : یہ توجیہ کسی بھی دانشور اور عقل مند کو مطمئن نہیں کر سکتی اور کوئی بھی محقق اسے نہیں مان سکتا۔ یہ صرف اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتی ہے جب ہم یہ مان لیں کہ قرآن اور حدیث بلاغت کے اعتبار سے ہم پلہ ہیں اور قرآن کی مانند حدیث کا اسلوب بھی معجزہ ہے اور آج تک کسی نے بھی اس نظریے کو تسلیم نہیں کیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن سرے سے معجزہ ہی نہیں ہے۔ اس نظریے سے اعجاز قرآن کی اساس ہی ختم ہوجاتی ہے۔[۱]

محمود سالم عبیدات اس کو بیان کرنے کے بعد کہ بہت سے علماء نے حدیث کی کتابت پر پابندی کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ کہیں قرآن اور حدیث ایک دوسرے میں مدغم نہ ہوجائیں ، لکھتے ہیں :

لیکن یہ توجیہ بہت دُور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے کیونکہ قرآن کریم معجزہ ہے۔ جس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کی پہلی آیت اتری اسی دن سے عرب اس کی فصاحت اور بیان کے سامنے مبہوت ہوگئے تھے۔[۲]

ہاشم معروف الحسنی اس بارے میں رقم طراز ہیں :

جو لوگ کتابتِ حدیث پر حضرت عمرؓ کی طرف سے لگائی گئی پابندی کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انھیں خطرہ تھا کہ کہیں قرآن اور حدیث ایک دوسرے سے مخلوط نہ ہوجائیں وہ سخت نقصان دہ بات کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ وہ اپنی اس تاویل سے یہ باور کرا رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کوتاہ اندیش تھے۔ وہ بیان اور بلاغت سخن سے اتنے ناواقف تھے کہ قرآن کی عظمت بیان کو نہیں سمجھتے تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ قرآن کس طرح دلوں میں گھر کرتا ہے۔[۳]

کتابت اور تدوینِ حدیث پر پابندی کے متعلق شیعہ علماء کا نظریہ

مکتبِ خلفاء کے علماء نے اپنے بزرگوں کی طرف سے حدیث نقل کی ، کتابت اور تدوینِ حدیث پر لگائی گئی پابندی کی جو توجیہات پیش کی ہیں ہم نے ان کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۵۳ ۔ ۵۴

۲۔ تاریخ الحدیث ومناہج المحدثین ص ۲۷

۳۔ دراسات فی الحدیث والمحدثین ص ۲۳

ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند شخص ان تاویلات سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ سوال اب بھی اپنی جگہ باقی ہے کہ آخر اس پابندی کی اصل وجہ کیا تھی؟

شیعہ محققین کی نظر میں اس پابندی کے پس منظر میں حسب ذیل مقاصد کارفرما تھے:

(۱) اہل بیت رسولؐ کے فضائل کی تشہیر کو روکنا۔

(۲) اصحاب رسولؐ کے ناپسندیدہ کاموں کو چھپانا۔

(۳) نص کے مقابلے میں ذاتی اجتہاد کی بنیاد رکھنا۔

ان مقاصد کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے۔

ذیل میں ہم مذکورہ تینوں مقاصد کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

(۱) اہل بیت رسولؐ کے فضائل کی تشہیر کو روکنا

تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی تبلیغ کے تئیس سالوں میں قدم قدم پر اپنے اہل بیتؑ کی فضیلت اور اُن کا مقام بیان کیا تھا۔ آپ نے اسلام کی پہلی کھلی دعوت یعنی دعوت ذو العشیرہ سے لے کر غدیر خم تک اور غدیر خم سے لے کر اپنی وفات تک حضرت علیؑ کی خلافت و امامت کے متعلق نصوص ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ جب وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں۔ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴) کی آیت نازل ہوئی تو آپ نے اپنے خاندان والوں کو کھانے پر بلایا۔ تاریخ بیان کرتی ہے کہ اس دعوت میں چالیس افراد شریک تھے۔ چنانچہ اس موقع پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ — جن کی عمر ابھی پندرہ سال تھی — کو اپنا بھائی، وصی اور جانشین مقرر کیا تھا اور اس بات پر قریش نے حضرت ابو طالبؑ کا مذاق اڑایا تھا۔[۱] اور جب حجۃ الوداع سے واپسی پر آپ غدیر خم کے مقام پر پہنچے تو آپ نے حضرت علیؑ کو باقاعدہ طور پر مومنین کا ولی اور اُن پر اولیٰ بالتصرف قرار دیا اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اُن سے پیمانِ ولایت استوار کریں۔[۲]

رحلت سے پہلے آپ نے حاضرین کو حکم دیا کہ وہ کاغذ اور دوات لائیں تاکہ آپ انھیں ایسی تحریر لکھ کر دیں جس سے مسلمان قیامت تک گمراہی سے بچ سکیں۔ بہت سے محققین اس حوالے سے کہتے

۱۔ سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۳۲۱۔ بحار الانوار ج ۱۸، ص ۱۶۳

۲۔ واقعۂ غدیر کے متعلق سب سے مفصل اور تحقیقی کتاب علامہ امینی کی الغدیر ہے۔

ہیں کہ آنحضرتؐ اُس تحریر میں حضرت علیؑ کی خلافت و امامت کی تصریح کرنا چاہتے تھے۔[۱]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں حضرت علیؑ کی فداکاری، اخلاص، عبادت، ایثار اور تقویٰ کی مثالیں اس طرح زبان زد پر خاص و عام تھیں کہ خدا نے آپ کی مدح میں کئی آیات نازل فرمائیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے بھی آپ کی شان میں احادیث بیان ہوئی ہیں۔[۲]

اسلامی غزوات میں حضرت علیؑ نے ایسے عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور اسلام کو سربلندی نصیب ہوئی۔ چنانچہ جنگ بدر ہو یا احد، خندق ہو یا خیبر ہر جنگ میں آپ نے شجاعت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ آپ کو **لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ وَلَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَارِ** اور **ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَۃِ الثَّقَلَیْنِ** کے تمغے عطا ہوئے۔

حضرت علیؑ کی عظمت سے سارے صحابۂ کرام واقف تھے۔ وہ آپ کو حق کا محور اور آپ کی ذات کو ایمان و نفاق کا میزان جانتے تھے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: **لَا یُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِقٌ وَلَا یُحِبُّکَ اِلَّا مُؤْمِنٌ** اے علیؑ! منافق کے سوا کوئی تم سے دشمنی نہیں رکھے گا اور مومن کے سوا کوئی تم سے محبت نہیں رکھے گا۔[۳] صحابۂ کرام حضرت علیؑ کی محبت اور دشمنی کے ذریعے سے مومن اور منافق کی پہچان کیا کرتے تھے۔[۴]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی چند افراد کے سامنے حضرت علیؑ کے فضائل بیان کئے اور کبھی مجمع عام میں آپ کے فضائل بیان کئے۔ انہی میں سے وہ روایت بھی ہے جس میں آنحضرتؐ نے اپنی وفات کے بعد پیش آنے والے حالات کی پیشین گوئی فرمائی اور لوگوں کو حکم دیا کہ جب ہر طرف گمراہی اور تاریک فتنے پھیل جائیں تو علیؑ کی پیروی کرنا اور اُن کی مخالفت سے گریز کرنا۔

۱۔ المراجعات ص ۳۵۶

۲۔ حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب کتاب موسوعۃ الامام علی ابن ابی طالبؑ کی آٹھویں جلد میں دیکھئے۔ اس کے ایک باب میں فضائل علیؑ بزبان قرآن اور ایک باب میں فضائل علیؑ بزبان رسولؐ اور ایک باب میں فضائل علیؑ بزبان علیؑ بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ الغدیر ج ۳، ص ۱۸۴۔ کنز العمال ج ۱۱، ص ۶۲۲

۴۔ قرب الاسناد ص ۲۶۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۲۹۔ المعجم الاوسط ج ۲، ص ۳۲۸۔
صحیح مسلم، ج ۱، کتاب الایمان، باب ۳۳ کی حدیث رقم ۲۴۰، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور میں ہے کہ امام علیؑ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور جس نے جان داروں کو پیدا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ مجھ سے مومن ہی محبت کرے گا اور مجھ سے منافق ہی بغض رکھے گا۔ (رضوانی)

چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنی بی بی عائشہؓ سے فرمایا:

''خبردار! ایسا نہ ہو کہ حواب کے کتے تم پر بھونکیں۔''

جب بی بی، حضرت علیؑ کے ساتھ جنگ جمل لڑنے کے لیے بصرہ جا رہی تھیں تو مقام حواب کے کتے اُن کے گرد بھونکے تھے۔[۱] اسی طرح آنحضرتؐ نے زبیر بن عوام کو حضرت علیؑ کے مقابل آنے سے خبردار کیا تھا اور حضرت علیؑ نے جنگ جمل کے دوران جب زبیر کو یہ حدیث یاد دلائی تو انھوں نے میدان چھوڑنے ہی میں عافیت جانی۔ یہ آپ کے فضائل کے چند نمونے ہیں۔[۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیتؑ کے فضائل اور ائمہ اہل بیتؑ کی امامت کی جو تاکید کی تھی وہ کھلی ہوئی حقیقت ہے حتیٰ کہ امام مہدیؑ کے ظہور اور اُن کی خصوصیات پر بھی آنحضرتؐ سے روایات منقول ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ روایات صرف شیعہ کتبِ حدیث میں ہی نہیں بلکہ اہل سنت کی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور فضائل اہل بیتؑ کی روایات اہل سنت محققین کے نزدیک تقریباً متواتر ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي مَثَلُ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ تمہارے درمیان میرے اہل بیت کی مثال کشتیٔ نوحؑ جیسی ہے جو اس میں سوار ہوا وہ پار لگ گیا اور جس نے انکار کیا وہ غرق ہو گیا۔[۳]

دوسری طرف اصحاب کا ایک گروہ اور ایمان و تقویٰ سے عاری منافقین فضائل آل محمدؐ کی جتنی احادیث سنتے آل محمدؐ خصوصاً حضرت علیؑ سے اُن کے بغض و عناد اور حسد میں مزید اضافہ ہوتا تھا اس لیے حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کو ایسے افراد نے کئی تکالیف پہنچائیں۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ کچھ لوگوں کو حضرت علیؑ کے فضائل گراں گزرتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے حبیبؐ کو مجمع عام میں حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان کرنے کا حکم دیا تو مخالفین کو بھی خدا نے فراموش نہیں کیا جیسا کہ آیۂ بلغ میں ارشاد اقدس الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ اے رسولؐ! جو حکم تمہارے رب کی طرف سے تم پر

۱۔ شرح نہج البلاغہ ج ۹، ص ۳۱۰۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۸۱

۲۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۳۳۔ امالی شیخ طوسی ص ۱۳۷

۳۔ قرب الاسناد ص ۸۔ خلاصہ عبقات الانوار ج ۴، ص ۴۴

نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اُس کی رسالت ہی نہیں پہنچائی۔ خدا تمھیں لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ بے شک خدا کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (سورۂ مائدہ: آیت ٦٧)

ذرا سوچیے! رسول خدا ﷺ کو ولایت علیؑ کے اعلان سے کیا خطرہ تھا کہ خدا نے اُس خطرے سے آپ کو محفوظ رکھنے کی ضمانت دی؟ اس کی وجہ اس کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے کہ آنحضرتؐ جانتے تھے کہ ابھی تک بہت سے لوگوں کے دلوں میں جاہلیت کے تعصبات باقی ہیں اور وہ لوگ الٰہی حکومت و حاکمیت کے سامنے سر جھکانا پسند نہیں کرتے۔ جی ہاں! آپ بخوبی جانتے تھے کہ ایسے لوگوں کے لیے ایک نوجوان کی ولایت و وصایت کا اعلان انتہائی گراں گزرے گا۔ ابھی تو اُس نے زندگی کی صرف تینتیس بہاریں ہی دیکھی ہیں اور وہ بھی رسول اکرم ﷺ کی طرح بنی ہاشم کا چشم و چراغ ہے۔ مزید یہ کہ عدل اور احکام الٰہی کے اجرا میں انتہائی سخت اور سنجیدہ ہے۔ اسی لیے اُس کی حکمرانی بہت سے لوگوں پر سخت گزرے گی۔ چنانچہ حضرت علیؑ کی یہی خوبیاں اور مخالفین کی ناگواری رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کی پچیس سالہ خانہ نشینی کا باعث بنی تھیں۔

جب تک رسول اکرم ﷺ زندہ رہے یہ لوگ کھل کر حضرت علیؑ سے اپنی مخالفت اور حسد کا اظہار نہ کر سکے مگر جونہی آپ کی آنکھیں بند ہوئیں تو دلوں میں دبے تمام کینے کھل کر سامنے آگئے اور انھوں نے یہ طے کیا کہ احادیث بیان کرنے اور لکھنے پر پابندی عائد کردی جائے تاکہ حضرت علیؑ کے فضائل لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہیں اور اسلام کے اس بدر منیر کو گمنامی کے اندھیرے میں دھکیل دیں اور تاریخ کی نظر سے اُس کے وجود کو چھپا دیں۔

چنانچہ جب اُن کے ہاتھوں میں زمام حکومت آگئی اور سیاستِ دوراں پر یہی لوگ چھا گئے تو سوچنے لگے کہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں موجود امام علیؑ اور اہل بیتؑ کی محبت کو کیسے نکالا جائے اور اُن کے فضائل کیسے لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیئے جائیں؟ چنانچہ ذہین سیاست دانوں کی طرح انھوں نے حدیث کے موجود نسخوں کو ختم کیا اور حدیث کی تدوین روک دی اور اُس کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا دی اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں اور اُن کا مفہوم بیان کرنے سے بھی باز رہیں۔ عہد شیخین میں یہ پابندی برقرار رہی اور خلیفۂ ثالث کی حکومت میں بھی یہ پالیسی جاری رہی۔ البتہ یہ صرف حضرت عثمانؓ کی اپنی رائے نہ تھی — کیونکہ اُن کی تو اپنی کوئی رائے ہی نہ ہوتی تھی — بلکہ مروان جیسے مشیروں کے مشورے سے باقی رہی۔

تاریخ حدیث اس بات کی شاہد ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے نہ صرف اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حدیث کے مجموعوں کو جلا دیا تھا بلکہ صحابہ کے پاس روایات کا جتنا ذخیرہ تھا اسے بھی جلا ڈالا تھا۔ کیا ان بزرگوں نے روایاتِ احکام (وہ بھی محدود صورت میں) کے علاوہ ہر طرح کی احادیث نشر کرنے پر پابندی نہیں لگائی تھی؟ کیا انھوں نے حدیث بیان کرنے والے صحابہ کو مدینہ نہیں بلا لیا تھا اور کیا انھوں نے چند صحابہ کو قید نہیں کر دیا تھا؟

(۲) اصحاب رسولؐ کے ناپسندیدہ کاموں کو چھپانا

مذکورہ بالا اقدامات کا مقصد جہاں فضائل اہل بیتؑ کو چھپانا تھا وہاں خلفاء کی طرف سے اپنے حامیوں کے ناپسندیدہ کاموں کو چھپانا بھی تھا۔ مکتب خلفاء کے بانی اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ اُن کی حکومت کے دوام کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کی نظر سے اہل بیتؑ کے فضائل مخفی رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت میں شامل افراد کے چہروں پر بھی نقاب پڑا رہے اور لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اُن کی مذمت پر مبنی احادیث سے آگاہ نہ ہونے پائیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے دو طرح کے اقدامات کئے گئے:

(۱) ایسی جھوٹی روایات بنائی گئیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو ایک عام انسان سے بھی (نعوذ باللہ) کمتر دکھایا جائے اور لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ آپ نعوذ باللہ ایک عام انسان تھے۔ آپ سے بھی لغزشیں ہوا کرتی تھیں اور آپ بھی لوگوں کو گالیاں دیتے تھے، ناسزا کہتے تھے اور غصے میں اُن پر لعنت کیا کرتے تھے۔

اس طرح کی توہین آمیز روایات کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ اگر کل کلاں لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فلاں کی مذمت کی تھی یا فلاں پر لعنت کی تھی یا فلاں کو بددعا دی تھی تو اس سے ان افراد کی حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑے اور وہ بدستور اسلامی معاشرے کے چاند تارے دکھائی دیتے رہیں۔

(۲) احادیث بیان کرنے پر پابندی اور حدیث کی کتابت ممنوع قرار دینے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جن کی مذمت میں احادیث موجود ہیں اُن کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیں اور جب مناسب موقع میسر آئے تو ان افراد کے حق میں جھوٹی احادیث بنا کر مسلمانوں میں پھیلائی جائیں۔

چنانچہ پہلے مقصد کے حصول کے لیے رسول خدا ﷺ کی زبانی ایک حدیث گھڑی گئی جس میں یہ بیان کیا گیا کہ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں یہ درخواست کی تھی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ سَبَبْتُہٗ اَوْ لَعَنْتُہٗ اَوْ جَلَدْتُہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ زَکَاۃً وَّ رَحْمَۃً پروردگار! میں تو ایک انسان ہوں اور مسلمانوں میں سے جس آدمی کو برا کہوں یا اُس کو لعنت کروں یا اسے سزا دوں تو تو اسے اُس کے لیے پاکیزگی اور رحمت بنا دے۔[۱]

اس قسم کی روایات میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''میں تو ایک انسان ہوں۔'' ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ آخر اس میں کیا خرابی ہے کیونکہ قرآن کریم میں بھی تو ہے **اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ**۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی تصور کے مطابق رسول خدا ﷺ ایسے بشر ہیں جو معصوم ہیں، ہر گناہ سے پاک اور خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں جبکہ ان روایات میں تو ''الٹی گنگا بہہ رہی ہے'' کیونکہ اُن کے مطابق آپ حیران کن لغزشوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر آپ کسی پر لعنت کریں یا کسی کو برا کہیں تو یہ اُس کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس رسول خدا ﷺ دعا کرتے ہیں کہ یہ لعنت اُس کے لیے اجر اور رحمت میں بدل جائے اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی دعا قبول ہوجاتی ہے!!

جب یہ تمہید باندھ دی گئی کہ آپ کی لعنت سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ وہ رحمت کا باعث بن جاتی ہے تو پھر ابوسفیان، معاویہ اور اُس کے بڑے بھائی یزید کے لیے رحمت کا دروازہ خود بخود کھل گیا کیونکہ آپ نے ان افراد پر لعنت کی تھی۔ لہٰذا یہ لعنت اُن کے لیے رحمت بن گئی۔[۲] اسی طرح ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ نے معاویہ اور عمرو بن عاص پر یوں نفرین کی تھی: خدایا! انھیں سختی کے ساتھ فتنے میں مبتلا فرما اور انھیں دوزخ میں بدترین حالت میں جگہ دے۔[۳] اور خدا نے قرآن میں ''شجرہ ملعونہ'' کا ذکر کیا ہے اور رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ یہ بنی امیہ کی طرف اشارہ ہے۔[۴] آنحضرتؐ کی یہ بددعا ان دونوں کے لیے رحمت بن گئی!!

۱۔ صحیح مسلم ج ۳، کتاب البر والصلۃ والادب، حدیث رقم ۶۶۱۶، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور

۲۔ شرح نہج البلاغہ ج ۶، ص ۲۸۹۔ شرح الاخبار ج ۲، ص ۱۴۷

۳۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۴۲۱

۴۔ **...وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ** (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۶۰) اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بنی امیہ کے مظالم کی خبر دی تو اس کے بعد آپ ہمیشہ مغموم رہے اور آپ کو کسی نے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مستدرک حاکم ج ۴، ص ۴۸)

اسی طرح جب مروان بن حکم پیدا ہوا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کے لیے دعا کی بجائے نفرین کی تھی۔[1] لہٰذا آنحضرتؐ کی یہ نفرین اُس کے لیے کمال اور رحمت کا باعث بن گئی!!

قریش کی طرف سے عمرو بن عاص کے بیٹے عبداللہ کے حدیث لکھنے کی مخالفت ہمارے مدعا پر بہترین دلیل ہے کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ تم جو کچھ بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن لیتے ہو اسے لکھ لیتے ہو جبکہ وہ بھی ایک انسان ہیں۔ وہ خوشی اور ناراضی کی حالت میں باتیں کرتے ہیں۔[2]

سیدھی سی بات ہے کہ قریش عبداللہ کو اس لیے روکتے تھے کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے کسی کے فضائل سنے تھے تو کسی کی مذمت سنی تھی اسی لیے قریش نے اپنے طور پر یہ پروپیگنڈا شروع کیا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انسان ہیں۔ آپ جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کے فضائل بیان کرتے ہیں اور جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اس کی مذمت کرتے ہیں لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ فضائل اور مذمتی بیانات کی کوئی اہمیت نہیں!!!

خلفاء صرف ایسی احادیث بیان کرنے کی اجازت دیتے تھے جن کا تعلق حلال وحرام اور احکام سے تھا اور ان احادیث میں نہ تو کسی کے فضائل تھے اور نہ ہی کسی کی مذمت بیان ہوئی تھی لہٰذا انھیں بے ضرر سمجھ کر بیان کرنے کی اجازت دی گئی۔

ایک مصری محقق لکھتے ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں پر لعنت کی تھی اور کچھ کو جلاوطن کیا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر نقل احادیث پر پابندی لگائی گئی کہ لوگ ان پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے لعنت اور ان کی جلاوطنی کو فراموش کردیں اور بعد میں انھیں حکومت کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔[3]

حضرت علیؑ کے تدوین کردہ قرآن کریم کو بھی اسی لیے قبول نہیں کیا گیا کہ تاریخی مدارک کے مطابق وہ قرآن ترتیب نزول کے مطابق تھا اور حاشیہ میں آیات کے اسباب نزول، تفسیر اور تاویل کو بیان کیا گیا تھا اور بہت سے تاریخی حقائق کا قرآنی آیات سے تعلق بیان کیا گیا تھا۔

۱۔ مستدرک حاکم ج ۴، ص ۴۸۱

۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۲، ص ۱۶۲۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۱۰۶

۳۔ معالم الفتن ج ۱، ص ۳۳۲ بحوالہ مقالہ تدوین حدیث (۶)۔ فصل نامہ علوم حدیث ش ۸، ص ۲۸۔ ۲۹

(۳) نص کے مقابلے میں ذاتی اجتہاد کی بنیاد رکھنا

کچھ شیعہ علماء کہتے ہیں کہ خلفاء نے نقل حدیث پر اس لیے پابندی لگائی تھی کہ نصوص کے مقابلے میں اپنی ذاتی رائے اور اجتہاد کے لیے زمین ہموار کی جاسکے۔ چنانچہ استاد شہرستانی لکھتے ہیں:

گزشتہ مباحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نقل حدیث پر پابندی کا مقصد صرف فضائل اہل بیتؑ کو چھپانا ہی نہیں تھا بلکہ اس سے ایک نئی فقہ کا اختراع بھی مقصود تھا تاکہ خلیفہ اُس فقہ کی فقہی کمزوریوں کا خلا اپنی مرضی سے پُر کر سکے ... لوگ جانتے تھے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ لوگ یہ بھی چاہتے تھے کہ احکام شریعت صرف اُس شخص سے حاصل کریں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاص الخاص ہو اور قرآن کی تنزیل و تاویل سے پوری طرح آگاہ ہو۔ دوسری طرف خلیفہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی رائے سے فتویٰ دیں اس لیے انھوں نے نقل حدیث پر پابندی لگادی اور اپنے سوا باقی لوگوں کے لیے بھی اجتہاد کا دروازہ کھول دیا تاکہ لوگ اُن کو اجتہاد میں معذور سمجھیں ... اس طرح تدوینِ حدیث پر پابندی کی وجہ سے خلیفہ کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھل گیا۔[1]

عبدالہادی فضلی کہتے ہیں کہ تدوینِ حدیث پر پابندی کے بنیادی عوامل کو سقیفہ کے بعد والے واقعات اور رائے و اجتہاد کو نص کے مقابلے میں معتبر جاننے کے حوالے سے تلاش کرنا چاہیے۔ نصوص پر پابندی عائد کر کے اُن کی تعداد کو محدود کر دیا گیا تھا بالخصوص فضائل اہل بیتؑ کی روایات پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ نص کے مقابلے میں اجتہاد کی حوصلہ افزائی کی جائے اور یہ میدان سیاست میں اُن کے خوب کام آئے۔[2]

خلفاء خصوصاً حضرت عمرؓ کا نص کے مقابلے میں اجتہاد کرنا تاریخی مسلمات میں سے ہے اور اہل سنت علماء کی اکثریت اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد رواس لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ نص کے مقابلے میں مکتب اجتہاد کے پہلے استاد تھے بالخصوص جب اُن کے عہد حکومت میں فتوحات کی وجہ سے اسلامی حکومت کی سرحدیں وسیع ہوئیں اور انھیں نئے نئے مسائل درپیش ہوئے تو انھوں نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کام لیا۔[3]

۱۔ منع تدوین الحدیث ص ۳۵۷۔۳۵۹

۲۔ دروس فی فقہ الامامیہ ج ۱، ص ۱۱۱

۳۔ موسوعۃ فقہ ابراہیم النخعی ج ۱، ص ۸۵ بحوالہ مقالہ تدوین حدیث (۷)۔ فصل نامہ علوم حدیث ش ۹، ص ۳۳

احمد امین بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مسائل اور واقعات کے متعلق اجتہاد سے کام لینے والے کے واضح ترین مصداق تھے اور اُن سے بکثرت آراء نقل ہوئی ہیں۔[۱]

تدوینِ حدیث پر پابندی کے نقصانات

گزشتہ بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تدوینِ حدیث پر پابندی کسی دینی مصلحت کی وجہ سے نہیں لگائی گئی تھی بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ خلفاء کی حکومت کو مستحکم کیا جائے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث پر پابندی کے نقصانات کا جائزہ لیا جائے۔

(۱) اسناد روایات کا تسلسل ٹوٹ گیا

ایک صدی تک نقل حدیث پر پابندی کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ تابعین اور پیغمبر اکرم ﷺ کے درمیان جو تسلسل کا حلقہ تھا وہ عملی طور پر ٹوٹ گیا کیونکہ پہلی صدی ختم ہونے سے قبل ہی بہت سے صحابہ وفات پا چکے تھے۔ تاریخی مدارک بتاتے ہیں کہ صحابہ میں سب سے آخر میں ابو الطفیل عامر بن واثلہ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی تھی اور وفات کے وقت اُن کی عمر ۱۰۸ برس کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ابو الطفیل آٹھ سال کے تھے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔[۲] کچھ دیر کے لیے سوچیے کہ کتنے صحابہ ہوں گے جنھوں نے اتنی طویل عمر پائی ہوگی؟! اس سلسلے میں ایک سیاسی رہنما کی بات قابل توجہ ہے۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی نے کہا تھا:

موجودہ کتابِ مقدس (تورات و انجیل) تبدیل ہو چکی ہے اور اپنا اعتبار کھو چکی ہے کیونکہ اس میں رسول اکرم ﷺ کا اسم گرامی موجود نہیں ہے جبکہ ہمیں یقین ہے کہ تورات و انجیل میں ہمارے نبیٔ مکرم ﷺ کا نام نامی موجود تھا کیونکہ قرآن نے اس کی گواہی دی ہے۔ تورات و انجیل میں تحریف ہوئی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اُن کی تدوین کیسے ہوئی تھی؟ اُن کی تالیف ہماری کتب حدیث کی طرح سے ہوئی تھی یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کئی برس بعد کچھ افراد عیسائیوں کے پاس آئے جنھیں عیسائی خدا کے نمائندے کہتے تھے یعنی ''متی، یوحنا، مرقس اور پولس'' اور انھوں نے کہا کہ خدا نے

۱۔ فجر الاسلام ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

۲۔ من لہ روایۃ فی کتب الستۃ ج ۱، ص ۵۲۷۔ تہذیب التہذیب ج ۵، ص ۷۱

حضرت عیسیٰؑ پر جو انجیل نازل کی تھی وہ انجیل ہمیں زبانی یاد ہے ... یہی چیز چار مختلف اور متضاد انجیلوں کے منظر عام پر آنے کا سبب بنی (ہماری کتب حدیث کا بھی کم و بیش یہی حال ہے)۔ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے ایک طویل عرصہ بعد یعنی دوسری صدی ہجری میں کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے احادیث رسولؐ کو جمع کیا ہے یعنی رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے دو سو برس بعد مسلمانوں نے حدیث جمع کرنے کی بنیاد ڈالی اور اُس وقت رسول اکرم ﷺ کا کوئی بھی صحابی زندہ نہیں تھا جو صحیح احادیث کو جمع کرتا۔

جب حدیث کی جمع اور تدوین کے دور میں کوئی صحابی زندہ نہیں تھا تو محدثین نے صحیح احادیث کیسے جمع کرلیں جبکہ ایسی جمع آوری تو سنی ہوئی باتوں پر انحصار اور اس کی اسناد کا معن عن (عن فلاں عن فلاں) ہونا ہے۔ جب حدیث کی تدوین ہوئی تو رسول اکرم ﷺ بقید حیات نہیں تھے اور آپ کے صحابہ بھی زندہ نہیں تھے تو اُس وقت کون یہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ واقعی رسول اکرم ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا... اس طرح کی حدیث کی کوئی سند نہیں ہے۔[۱]

قارئین! آپ جانتے ہیں کہ مسلمان سیاست دان آج حدیث کو حجت ماننے پر اس لیے تیار نہیں ہیں کہ کتبِ حدیث کی تدوین بھی اناجیل اربعہ کی طرح بہت بعد میں ہوئی تھی اور جب حدیث کی تدوین ہوئی تو رسول خدا ﷺ اور اُن کے صحابہ بقید حیات نہیں تھے اسی لیے احادیث میں تحریف، تبدیلیاں اور حافظے کی غلطیاں ہوئی ہیں اور احادیث میں اسناد کا متصل نہ ہونا احادیث کو ناقابل اعتماد بنا دیتا ہے۔ ہم یہاں کرنل قذافی کی تائید کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی اسے سو فیصد درست سمجھتے ہیں البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر ایک صدی تک نقلِ حدیث اور تدوینِ حدیث پر پابندی نہ لگائی گئی ہوتی تو آج کسی کو حدیث پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

استاد حسینی جلالی لکھتے ہیں کہ حدیث پر پابندی سنت نبوی میں شک کا باعث بنی جو تدوینِ حدیث پر پابندی کے نقصانات میں سے ایک ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کچھ مستشرقین کے اقوال نقل کیے ہیں: مثلاً ''گول ڈزیہر'' یہ نظریہ رکھتا ہے: تدوین شدہ تمام روایات جعلی ہیں اور تمام ایسی کتابیں جنھیں پہلی صدی سے منسوب کیا جاتا ہے وہ سب خود ساختہ اور ناقابل اعتبار ہیں۔[۲]

۱۔ المدخل الی علوم الحدیث ص ۱۲۔ ۱۳

۲۔ تدوین السنۃ الشریفۃ ص ۵۲۸۔ ۵۳۲

سیدھی سی بات ہے کہ اگر تدوینِ حدیث پر پابندی عائد نہ کی جاتی اور حلقۂ حدیث عصرِ رسولؐ تک متصل ہوتا تو آج قذافی اور مستشرقین کو یہ جسارت نہ ہوتی کہ وہ سنت کو ہی ناقابل اعتبار قرار دیں۔

(۲) پابندی کی وجہ سے جعلی احادیث منظرِ عام پر آئیں

جعلی احادیث بنانا اسلامی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے جو درحقیقت دین کی دین سے جنگ کے مترادف ہے۔ حدیث سازی میں ایسے لوگ پیش پیش تھے جو بادی النظر میں دین دار تھے۔ انھوں نے ایسی ایسی احادیث گھڑیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کرنے کے بعد اُن کا تقدس اور اعتبار بالکل ختم ہو کر رہ جائے۔ اُن کی مثال اُن کلہاڑیوں کی سی ہے جنھوں نے اسلام کی جڑوں کو کاٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اسلام کی اعتقادی و اخلاقی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی۔

جعلی احادیث کی تاریخ پر تحقیق سے بہت سے ناگوار حقائق سامنے آتے ہیں مثلاً یہ کہ جعلی حدیث گھڑنے کی ایک وجہ الحاد اور دین دشمنی تھی۔[۱] دشمنانِ اسلام نے اس مقصد کے لیے چودہ ہزار جعلی احادیث گھڑی تھیں۔[۲]

محمد بن سلیمان المعروف ابن ابی العوجاء نامی زندیق کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے گرفتار کیا گیا اور سزائے موت سنائی گئی تو اُس نے کہا تھا: خدا کی قسم! میں نے تمہارے درمیان چار ہزار جھوٹی احادیث پھیلا دی ہیں اور اُن کے ذریعے میں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا ہے۔ روزے کے دنوں میں تم سے افطار کرایا ہے اور افطار کے دنوں میں تم سے روزے رکھوائے ہیں۔[۳]

حدیث سازی کے ان عوامل کے ساتھ اگر مذہبی، سیاسی اور اخلاقی ... مقاصد کو بھی مدنظر رکھا جائے تو ہمیں بہت سی جعلی احادیث دکھائی دیں گی۔[۴] چنانچہ جب ہم پڑھتے ہیں کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے سات ہزار احادیث، امام مالک نے ایک لاکھ احادیث میں سے تین ہزار احادیث، ابو داؤد نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ ہزار دو سو احادیث، امام مسلم نے تیس لاکھ احادیث میں

۱۔ المجروحین ج ۱، ص ۶۲۔ کتاب الموضوعات ج ۱، ص ۱۸

۲۔ کتاب الموضوعات ج ۱، ص ۲۰

۳۔ ایضاً ص ۳۷۔ احادیث ام المومنین عائشہ ج ۲، ص ۳۲۷

۴۔ الوضع فی الحدیث ج ۱، ص ۲۶۵ ـ ۲۸۰۔ اصول الحدیث ص ۱۳۲ ـ ۱۳۳

سے سات ہزار دو سو احادیث، امام احمد بن حنبل نے سات لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے تین ہزار احادیث کا انتخاب کیا تھا تو ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔

یہ درست ہے کہ بہت سی جعلی روایات اب ختم ہو چکی ہیں لیکن اس کے باوجود جن جوامع حدیث پر ''صحیح'' کی مہر لگی ہوئی ہے ان میں بھی جعلی اور جھوٹی احادیث موجود ہیں۔ ایک معاصر سنی محقق نے اپنی کتاب ''موسوعۃ الاحادیث والآثار الضعیفۃ والموضوعۃ'' کے مقدمے میں جعلی روایات کی پہچان کے لیے ۷۸ عنوانات قائم کیے ہیں۔[۱]

ان حقائق سے جعلی احادیث کی کثرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سچے دل سے یہ پوچھنا چاہیے کہ ''اگر خلفاء حدیث کی نقل وتدوین پر پابندی نہ لگاتے اور یہ عظیم میراث کتابی صورت میں اسناد کے ساتھ مسلمانوں کے پاس موجود ہوتی تو کیا اتنی کثرت سے جعلی احادیث بن پاتیں؟ اگر خلفاء دین اور مسلمانوں کے خیر خواہ تھے تو انھیں یہ حقیقت دکھائی کیوں نہ دی کہ ہزاروں اندرونی اور بیرونی دشمن تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں اور زنادقہ اور فرقہ ساز افراد دین کی جڑیں کھودنے کے لیے موقع کی تلاش میں گھات لگائے ہوئے ہیں؟ کیا انھوں نے قرآن نہیں پڑھا تھا جس میں خدا نے خطا ونسیان سے بچنے کی خاطر مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے کو قرض دیتے ہوئے تحریری صورت میں اس کو لکھ لینا چاہیے اور اس پر گواہ بھی رکھنے چاہئیں تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ (دیکھیے: سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۲)

سوال یہ ہے کہ کیا حدیث نبوی کی حیثیت قرض کے برابر بھی نہیں کہ اس کی کتابت پر پابندی عائد کر دی گئی؟! اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں اگرچہ قرآن کریم کے حافظ بھی موجود تھے پھر بھی آنحضرتؐ قرآن مجید لکھواتے تھے جو قلمی نسخوں کی شکل میں محفوظ تھا اور قرآن کریم کے متعلق اللہ کی ضمانت کے بعد تحریف کا اندیشہ بھی نہ تھا اس کے باوجود خلیفہ ثالث نے تمام بکھرے ہوئے نسخوں سے صرف ایک نسخہ ترتیب دیا اور باقی نسخوں کو صحابہ کے مشورے سے جلا دیا تھا۔[۲] قرآن کریم شانِ اعجاز کا حامل ہے اور اس میں مخلوق کا کلام شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود خلفاء نے اس کی تدوین کا اہتمام کیا جبکہ حدیث کے متعلق اللہ کی طرف سے کوئی ایسی ضمانت نہ تھی اور اس میں خود ساختہ کلام شامل ہونے کا اندیشہ بھی تھا مگر خلفاء نے حدیث کی کتابت اور تدوین کی نہ صرف تشویق نہیں دلائی تھی

۱۔ موسوعۃ الاحادیث والآثار الضعیفۃ والموضوعۃ ج ۱، ص ۲۰۹۔ ۲۱۱

۲۔ مناہل العرفان ج ۱، ص ۲۶۰ اور التمہید علوم القرآن ج ۱، ص ۳۳۸۔ ۳۵۴

بلکہ سختی کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کردی تھی۔ پس خلفاء اور اُن کی خیانت کی توجیہ کرنے والے تاریخ میں اس کا کیا جواب دیں گے؟

انصاف پسند سنی محققین بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ تدوین حدیث پر پابندی کی وجہ سے جعلی احادیث بنانے اور پھیلانے کا راستہ کھل گیا۔

مصر کے مشہور دانشور استاد محمود ابوریہ لکھتے ہیں:

دوسری صدی کے آغاز تک تدوینِ حدیث میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بے پناہ جھوٹی روایات گھڑی گئیں اور جھوٹ گھڑنے کا دروازہ کھلا رہا یہاں تک کہ جھوٹی روایات کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی اور بہت سی جھوٹی احادیث پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کی نگارشات میں در آئیں۔[۱]

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۱۲۱

وضع حدیث کے مسلمان معاشرے پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فی نفسہ حدیث کو ہی رد کردیا جائے جو قرآن کے بعد استنباط احکام کے لیے اصل ثانی ہے جیسا کہ بعض یورپی مستشرقین کہتے ہیں جس میں نمایاں نام گولڈزیہر کا ہے احادیث کے بارے میں روایتی اسلامی تنقید نیز صحیح اور وضعی احادیث میں فرق کرنے کے لیے مقرر کئے گئے معیارات کو ان یورپی مستشرقین کی تنقید سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے جو احادیث کے سارے مجموعے پر اعتراض کرتے ہیں۔

محدثین عظام نے حدیث اور اصول حدیث کے ضمن میں صحیح اور ضعیف احادیث کو جانچنے کے لیے نیز راویان حدیث کے حالات اور حدیث کی درایت کے سلسلے کی تحقیق کے لیے مختلف علوم وضع کئے ہیں جن سے صحیح احادیث کی پہچان ہوجاتی ہے۔

اہل سنت کی احادیث کے مشہور ترین راوی ابو ہریرہ، ام المومنین بی بی عائشہؓ، انس بن مالک اور عبداللہ بن عمر ہیں۔

بی بی عائشہؓ نے ۲۲۰۰ سے زائد اور انس بن مالک نے بھی ۲۲۰۰ سے زائد احادیث نقل کی ہیں جبکہ ابن عمر نے ۲۶۰۰ سے زائد احادیث نقل کی ہیں۔ ان حضرات کے بعد عبداللہ ابن عباس کا نام آتا ہے۔

ابوہریرہ نے ایک حدیث بیان کی تو حاضرین نے پوچھا کہ کیا یہ حدیث تم نے خود رسول اکرم ﷺ سے سنی تھی؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ یہ حدیث میں نے اپنی جیب سے نکالی ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۳، صفحہ ۱۲۶، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی)

مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۴۵۴ مطبوعہ دار الاندلس میں ہے کہ

ابو ہریرہ نے جو فتح خیبر کے بعد ایمان لائے ۵۳۰۰ سے زائد احادیث رسول اکرم ﷺ سے روایت کی ہیں۔

ابو ہریرہ نے خود اپنے بارے میں کہا تھا کہ میرے پاس علم کے کئی ''ظرف'' ہیں جنھیں میں نے ابھی کھولا نہیں۔ اور میں نے رسول خدا ﷺ سے علم کے دو ''ظرف'' حاصل کئے تھے۔ ایک کو تو میں نے ظاہر کردیا ہے اور اگر میں دوسرے کو ظاہر کردوں تو یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر وہ سب کا سب میں تمھیں بتادوں تو لوگ کہیں گے کہ ابو ہریرہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ (السنۃ قبل التدوین ص ۴۲۶ بحوالہ طبقات ابن سعد اور فتح الباری)

رضوانی

جوامع حدیث کی تدوین

اہل سنت کی تاریخ حدیث میں اس کا دوسرا دور انتہائی اہم ہے۔ اسی دور میں میراثِ حدیث کے عنوان سے اہل سنت کے جوامع حدیث کی تدوین ہوئی اور بعد کے تمام ادوار، آج تک اسی دور سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ موطا مالک، مسند احمد بن حنبل، صحیح بخاری اور صحیح مسلم جیسی کتابیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

ذیل میں ہم ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں:

(۱) موطأ مالک بن انس

مالک بن انس ۹۳ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں مدینہ ہی میں فوت ہوئے۔[۱] انھوں نے مدینے میں حدیث کے نامور محدثین اور تابعین سے کسب فیض کیا تھا۔ اُن کے مشائخ میں ربیعۃ الرأی، ابن شہاب زُہری، زید بن اسلم اور یحییٰ بن سعید انصاری ... سرفہرست ہیں۔[۲] مالک بن انس نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ وہ آپ کی کثرت عبادت سے بہت متاثر تھے اور ہمیشہ آپ کی عبادت کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔[۳] مالک بن انس فقہ اہل سنت کے چار مشہور ائمہ میں سے ایک ہیں۔ وہ فقہ مالکی کے بانی ہیں۔ اس فقہ میں پیغمبر اکرم ﷺ کی سنت کی پیروی پر زور دیا گیا ہے اور بڑی حد تک قیاس اور ذاتی رائے سے اجتناب کیا گیا ہے۔[۴]

۱۔ تاریخ الاسلام ج ۱۱، ص ۳۱۸

۲۔ سیر اعلام النبلاء ج ۸، ص ۴۹۔ اس دوران ابوبکر عبداللہ بن یزید المعروف ابن ہرمز (متوفی ۱۴۸ھ) نے بھی اُن کی علمی تربیت میں مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ دیکھیے: موطا مالک ج ۱، ص ۲۰

۳۔ امالی صدوق ص ۱۳۴۔ الخصال ج ۱، ص ۱۶۷

۴۔ حلیۃ الاولیاء ج ۶، ص ۳۲۴۔۳۲۶

امام شافعی کہتے ہیں کہ منصور دوانیقی ۱۴۸ھ میں مدینہ آیا اور اُس نے مالک بن انس کو طلب کیا اور اُن سے کہا کہ عراق کے لوگ اختلافات کا شکار ہیں لہٰذا میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ایک ایسی کتاب لکھیے جو لوگوں کے اتحاد کا باعث بنے چنانچہ امام مالک نے منصور کی درخواست پر موطا لکھی۔[۱] انھوں نے ایک لاکھ احادیث میں سے دس ہزار احادیث کا انتخاب کیا، اُن کی مسلسل تنقیح اور چھان بین کرتے رہے اور اُن احادیث کو قرآن و حدیث کے معیارات پر جانچتے رہے اور بالآخر تین ہزار احادیث کا انتخاب کیا۔

کچھ محققین کہتے ہیں کہ اگر امام مالک کو مزید وقت ملتا تو وہ اپنی کتاب کی ساری روایات کو ہی حذف کر دیتے۔[۲]

امام مالک نے اپنی تالیف کو فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کیا اور پوری محنت سے اس کی تنقیح اور چھان بین میں لگے رہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام "موطا" رکھا جس کے معانی ہیں تنقیح شدہ۔[۳]

امام مالک خود فرماتے ہیں:

"میں نے کتاب کی تالیف کے بعد اسے ستر فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کیا اور اُن سب نے کتاب کے مضامین کے حوالے سے مجھ سے اتفاق کیا اسی لیے میں نے اس کا نام "موطا" (متفق شدہ) رکھا ہے۔"[۴]

موطا اہل سنت کی قدیم ترین حدیث کی کتاب ہے۔ یہ کتاب دوسری صدی میں لکھی گئی اور آج بھی موجود ہے۔ محمود ابوریہ نے ابوبکر ابہری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام مالک نے اس کتاب میں ۱۷۲۰ روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے ۶۰۰ مسند ہیں، ۲۲۲ مرسل اور ۶۱۳ موقوف (اقوال صحابہ) ہیں جبکہ ۲۸۵ مقطوع (اقوال تابعین) ہیں۔[۵]

موطا اہل سنت کی قدیم ترین کتاب ہے مگر اس کے نقل شدہ نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۱۳

۲۔ ایضاً ص ۳۱۰۔۳۱۱

۳۔ راویان مشترک ج ۲، ص ۷۷، نقل از شرح زرقانی بر موطا ج ۱، ص ۱۲

۴۔ مقدمہ موطا ج ۱، ص ۴۔ الحدیث والمحدثون ص ۲۴۶

۵۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۴۳۔ موطا کی روایات کی موجودہ تعداد مذکورہ تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

اس کے نقل شدہ نسخوں کی تعداد تیس تک بتائی گئی ہے۔[۱] سیوطی جو خود بھی موطا کی شرح لکھنے والوں میں سے ہیں کہتے ہیں کہ موطا کے مشہور ترین نسخے چودہ ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل چار نسخوں کو بڑی شہرت حاصل ہے:

(۱) یحییٰ بن یحییٰ لیثی کا نسخہ (۲) محمد بن حسن شیبانی کا نسخہ

(۳) ابو مصعب زہری کا نسخہ (۴) ابن وہب کا نسخہ[۲]

ان میں سے یحییٰ بن یحییٰ (متوفی ۲۳۴ھ) کے نسخے کو صحیح ترین نسخہ سمجھا جاتا ہے۔[۳]

امام مالک بن انس کے علمی وفقہی مقام اور دقت نظر کی وجہ سے اہل سنت میں موطا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام شافعی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قرآن کریم کے بعد روئے زمین پر امام مالک کی موطا صحیح ترین کتاب ہے۔[۴] شاہ ولی اللہ دہلوی نے موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو موثق ترین کتابوں کا درجہ دیا ہے۔[۵]

علمائے اہلسنت نے موطا کی متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے موطا کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک مفصل اور دوسری مختصر ہے۔ ایک کا نام "کشف المغطاء فی شرح الموطاء" اور دوسری کا نام "تنویر الحوالک فی شرح موطا مالک" ہے۔ ان کے علاوہ گیارہویں صدی کے مصری عالم عبدالباقی زرقانی کی شرح بھی مشہور ہے۔

امام مالک نے مرسل روایات نقل کی ہیں۔ انھوں نے عراق سے تعلق رکھنے والے اہل رائے کے خلاف اہل حدیث کے مکتب کی موافقت میں روایات نقل کی ہیں اسی لیے اس کتاب کو محدثین میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔[۶]

مؤطا میں مجموعی طور پر ۳۰۹۱ روایات ہیں اور یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۔ تاریخ عمومی حدیث ص ۱۲۴۔ دار قطنی اور ابو الولید باجی نے "اختلاف الموطا" کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔

۲۔ موطا مالک ج ۱، ص ۱۰۔۱۶

۳۔ ایضاً ص ۱۶

۴۔ موطا ج ۱، ص ۴ اور اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۳۱۰

۵۔ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۳۱۰

۶۔ علم حدیث ص ۳۶

(۲) مسند احمد بن حنبل

احمد بن حنبل کا آبائی تعلق قدیم خراسان کے علاقے مرو سے تھا۔ وہ ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں بغداد ہی میں فوت ہوئے۔[۱] انھوں نے ابتدائی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے مدینہ، بصرہ اور کوفہ تشریف لے گئے۔ اُن کے اساتذہ میں وکیع بن جراح، سفیان بن عیینہ، ہشیم بن بشیر، قاضی ابو یوسف اور امام شافعی جیسے مشائخ حدیث شامل ہیں۔[۲] احمد بن حنبل فقہ حنبلی کے بانی تھے اور اہل سنت کے ائمہ اربعہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ انھوں نے تیرہ تصانیف چھوڑی ہیں جن میں سے ''المسند'' اور ''العلل'' بہت مشہور ہیں۔[۳]

وہ قرآن مجید کو قدیم مانتے تھے۔ اس عقیدے کی وجہ سے انھیں مامون عباسی اور معتصم عباسی کی طرف سے سختیاں جھیلنی پڑیں۔ معتصم عباسی نے انھیں کوڑے لگوائے اور زندان میں ڈال دیا۔ پھر جب متوکل خلیفہ بنا اور معتزلہ کا علمی دبدبہ ختم ہوا تو اُس کی حکومت نے ان کا بڑا احترام کیا جس کی وجہ سے اُن کی اعتقادی فکر اور فقہ بڑی تیزی سے پھیلی۔[۴]

دوسری صدی ہجری کے آخر میں محدثین میں ''مسند'' لکھنے کا رجحان پیدا ہوا اور اُس دور میں سلیمان بن جارود طیالسی (متوفی ۲۰۴ھ)، عبیداللہ بن موسیٰ (متوفی ۲۱۳ھ) اور عثمان بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۹ھ) نے مسانید مرتب کیں تو اُن کی دیکھا دیکھی احمد بن حنبل نے بھی مسند لکھی۔

انھوں نے اپنی مسند میں سات لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے صرف تین ہزار احادیث لیں۔ انھیں یہ احساس ہوا کہ عمر طبیعی ختم ہونے کو ہے اسی لیے انھوں نے اس کتاب کی روایات اپنی اولاد اور احباب کے سامنے پڑھیں مگر اُن کی تنقیح نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی وفات ہوگئی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے عبداللہ اور اُن کے شاگرد ''قطیعی'' نے اس میں مزید روایات کا اضافہ کیا اور یوں موجودہ مسند منظر عام پر آئی۔[۵] آخری طباعت مطبوعہ دارالفکر بیروت کے مطابق مسند میں روایات کی تعداد ۲۷۷۱۸ ہے جبکہ مطبوعہ دار الحدیث بیروت کے مطابق روایات کی تعداد ۲۷۵۱۹ ہے۔

۱۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۱، ص ۱۸۰

۲۔ ایضاً۔ اس کتاب میں ذہبی نے اُن کے دیگر اساتذہ کے نام گنوائے ہیں۔

۳۔ فہرست ابن ندیم ص ۲۸۵۔ الاعلام ج ۱، ص ۲۰۳

۴۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۱، ص ۲۳۲۔ تاریخ اسلام ج ۱۸، ص ۱۶

۵۔ مسند نویسی ص ۳۳۳۔ ۳۳۴ بہ نقل از ابن جزری و اسفرائنی

ابن جزری نے مسند کی شرح لکھی جس کا نام المسند الاحمد فیما یتعلق بمسند احمد ہے اور سیوطی نے اس کی جو شرح لکھی ہے اس کا نام عقود الزبر جد علی مسند الامام احمد ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس کی شرحیں لکھی ہیں لیکن مذکورہ دو شروح زیادہ مشہور ہیں۔[۱]

مسند احمد بن حنبل کا تنقیدی جائزہ

اگرچہ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب کا دفاع کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”میں نے اس کتاب کو مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے لکھا ہے لہٰذا اگر سنتِ رسولؐ میں لوگوں کو اختلاف ہو تو انھیں اس کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اگر وہ اس کتاب میں اس اختلاف کا حل نہ پائیں تو اُس اختلاف کو باطل سمجھیں۔“[۲] مگر اس کے باوجود اس پر تنقید ہوئی ہے۔ ناقدین لکھتے ہیں:

(۱) یہ کتاب امام احمد کی حیات میں ان کی زیر نگرانی تنقیح و تکمیل کے مراحل سے نہیں گزری بلکہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے فرزند عبداللہ اور اُن کے شاگرد ”ابوبکر قطیعی“ نے اس میں اضافات کیے تھے اس سے کتاب پر بھروسے میں کمی آتی ہے بالخصوص علماء نے کہا ہے کہ ”اضافاتِ قطیعی“ میں گھڑی ہوئی احادیث بھی شامل ہیں۔[۳]

(۲) امام احمد نے خود یہ مانا تھا کہ ہم حلال و حرام کی روایات میں سخت گیری کرتے ہیں مگر فضائل کی روایات میں درگزر سے کام لیتے ہیں اور ان روایات میں صحتِ سند کے لیے سختی نہیں برتتے۔[۴] اس سے مسند احمد بن حنبل کی روایات کی قدر و قیمت یقیناً کم ہوجاتی ہے کیونکہ اس تسامح کے نتیجے میں ساختہ پرداختہ روایات منظر عام پر آئی تھیں اور اس وجہ سے بعض علماء جیسے زین الدین عراقی نے مسند کی ضعیف اور وضعی روایات پر تحقیق کی ہے۔[۵]

علامہ محمود ابوریہ مسند احمد بن حنبل کے متعلق نامور علماء کے نظریات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مسند کے متعلق یہ نامور علماء کا نقطۂ نظر تھا اور مسند کے تعارف اور اس کی قدر و قیمت معلوم کرنے کے

۱۔ مسند نویسی ص ۳۵۰۔ ۳۵۱

۲۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۴۵۔ خصائص المسند ص ۲۱

۳۔ مسند نویسی ص ۳۳۴۔ ۳۳۵

۴۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۴۴

۵۔ تدریب الراوی ج ۱ ص ۱۷۱۔ القول المسدد ص ۳۔ ۴

لیے یہی آراء کافی ہیں۔ جو کچھ مشہور ہے اُس کے برعکس مسند ایسے ''منابع'' میں سے ہے جس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے ذریعے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت وہی ہے جو کہ باقی مسانید کی ہے۔[۱]

(۳) صحیح بخاری

ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری ۱۹۴ھ میں (موجودہ ازبکستان کے شہر) بخارا میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ امام بخاری کے والد ایک امیر آدمی تھے۔ چنانچہ والد کی وفات پر امام بخاری کو میراث میں کافی دولت ملی۔ انھوں نے اس دولت کو علم کی پیاس بجھانے کے لیے خرچ کیا اور علم حدیث حاصل کرنے کے لیے خراسان، عراق، حجاز اور شام کا سفر کیا۔[۲] انھیں زیادہ احادیث حفظ کرنے اور حدیث شناسی میں مہارت کی وجہ سے اپنے معاصر علماء میں خاص مقام حاصل تھا انھوں نے ابو زرعہ رازی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور اسحاق بن راہویہ جیسے مشہور مشائخ حدیث سے کسب فیض کیا۔[۳]

امام بخاری طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد آخرکار ۲۵۶ھ میں اپنے وطن واپس لوٹے اور اسی سال سمرقند کے ایک گاؤں ''خرتنگ'' میں انتقال فرما گئے۔[۴]

امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن ہم اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کے پاس بیٹھے تھے کہ انھوں نے کہا ''کاش! کوئی ایسی کتاب ترتیب دی جائے جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں۔'' بخاری کہتے ہیں کہ استاد کی یہ بات میرے دل کو چھو گئی اور میں نے صحیح احادیث جمع کرنا شروع کر دیں اور یوں چھ لاکھ احادیث میں سے اپنی ''صحیح'' کا انتخاب کیا۔[۵]

بخاری کہا کرتے تھے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور ایک لاکھ غیر صحیح احادیث ازبر ہیں۔[۶]

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۴۷

۲۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۵۲، ص ۵۰۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۵۵۵۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۲، ص ۳۹۲

۳۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۵۲، ص ۵۰ ۔ ۵۲۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۲، ص ۳۹۴ ۔ ۳۹۶

۴۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۵۲، ص ۵۶

۵۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۲، ص ۴۰۱۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵

۶۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۵۵۶

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کے دور میں بہت زیادہ احادیث جمع ہو گئی تھیں۔ نیز ضعیف اور جھوٹی احادیث کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں میں پھیل چکی تھی۔

ابن حجر عسقلانی صحیح بخاری کی وجہ تالیف یوں بیان کرتے ہیں:

جب امام بخاری نے مسانید کا مطالعہ کیا تو انھوں نے دیکھا کہ اُن میں صحیح اور ضعیف روایات باہم مخلوط ہیں اور ہر شخص اُن میں فرق نہیں کر سکتا اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ان ہزاروں احادیث میں سے صرف صحیح احادیث جمع کریں گے تا کہ کسی کے لیے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔[۱]

امام بخاری نے اپنی شرائط کے مطابق روایات کا انتخاب کیا۔ اُن کی شرائط یہ تھیں کہ روایت کی سند طبقۂ صحابہ تک متصل ہو اور سارے راوی عادل اور محکم ہوں۔ بخاری نے اگرچہ اپنی مذکورہ شرائط کی خود کوئی تفصیل بیان نہیں کی مگر انھوں نے اپنی کتاب میں ان شرائط کا خیال رکھا ہے۔[۲]

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حرم پاک میں کتاب لکھنی شروع کی اور کتاب کی تکمیل کے لیے ۱۶ سال تک بصرہ اور دیگر شہروں میں قیام کیا اور پھر اپنے وطن میں اس کتاب کو مکمل کیا۔

لکھا ہے کہ وہ ہر حدیث کے انتخاب سے پہلے غسل کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے اور استخارہ دیکھ کر اسے اپنی کتاب میں لکھتے تھے۔[۳]

۱۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵

۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۷ ۔ ۸۔ اصول الحدیث ص ۳۱۲ ۔ ۳۱۳

۳۔ علم حدیث ص ۴۴ بنقل از مقدمہ التاج ج ۱، ص ۱۵۔ مقدمہ جامع الاصول ج ۱، ص ۱۸۶
سیری در صحیحین (اضواء علی الصحیحین) کے مولف شیخ محمد صادق نجمی نے لکھا ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے چھ لاکھ احادیث میں سے یہ احادیث منتخب کیں اور انھیں اپنی صحیح میں لکھا۔ اس کتاب کو میں نے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔ (مقدمہ فتح الباری، فصل اول، ص ۵) شیخ محمد بن یوسف فربری کہتے ہیں کہ امام بخاری نے فرمایا تھا:
ما کتبت فی کتاب الصحیح حدیثا الا اغتسلت قبل ذالک و صلیت رکعتین... میں نے ہر حدیث کو کتاب میں لکھنے سے پہلے غسل کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور استخارہ کیا۔ جب حدیث کی صحت استخارے سے مجھ پر ثابت ہو گئی تب میں نے اسے کتاب میں درج کیا۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد، جلد ۲ میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے فرمایا:
میں نے یہ کتاب ۱۶ سال میں لکھی ہے۔
شیخ محمد صادق نجمی نے امام بخاری کے اس قول کی تحقیق کی ہے کہ چھ لاکھ احادیث میں سے تقریباً سات ہزار احادیث پر استخارہ آیا اور باقی پر نہ آیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟
امام بخاری نے ہر حدیث کے لیے غسل کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور استخارہ دیکھا۔ پس کم سے کم وقت اگر ایک حدیث پر

قرائن بتاتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اور دیگر محدثین کے سامنے پیش کیا تھا تو انھوں نے چار روایات کے سوا اُن کی جمع کردہ باقی تمام روایات

صرف کیا جائے تو ۲۰ منٹ بنتے ہیں، گویا تین حدیثوں پر کم سے کم ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ اگر چھ لاکھ احادیث پر یہ عمل دہرایا جائے تو دو لاکھ گھنٹے صرف ہوں گے جس کا حساب اس طرح ہوگا:

(۱) اگر انھوں نے روزانہ ۴ گھنٹے کام کیا ہو تو چھ لاکھ احادیث کے لیے ۱۳۷ سال چاہئیں۔

(۲) اگر انھوں نے روزانہ ۸ گھنٹے کام کیا ہو تو تقریباً ۶۸ سال چاہئیں۔

(۳) اگر انھوں نے روزانہ ۱۲ گھنٹے کام کیا ہو تو ۴۶ سال چاہئیں۔

(۴) اگر انھوں نے روزانہ ۱۶ گھنٹے کام کیا ہو تو ۳۴ سال چاہئیں۔

(۵) اگر انھوں نے روزانہ ۲۰ گھنٹے کام کیا ہو تو ۲۷ سال چاہئیں۔

(۶) اگر انھوں نے روزانہ ۲۴ گھنٹے کام کیا ہو تو ۲۳ سال چاہئیں۔

امام بخاری نے ۱۰ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا، ۲۰ سال کی عمر میں تحصیل علم کے سفر پر نکلے، ۲۹ سال کی عمر میں حدیث پر کام شروع کیا اور ۶۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے لہٰذا اگر ہم ۶۲ سال میں سے ۲۹ سال کم کر دیں تو امام بخاری نے ۳۳ سال احادیث پر تحقیق میں لگائے اور اگر ایک سال اور بڑھالیں تو ۳۴ سال بنتے ہیں۔

اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے امام بخاری کا یہ قول کہ ''میں نے ۱۶ سال ان احادیث پر کام کیا'' کیسے درست ہو سکتا ہے؟! اس کام کو کرنے کے لیے تو آپ کی عمر ۱۳۷ سال ہونی چاہیے۔ دوسرے اور تیسرے فرضیہ کے مطابق آپ کی عمر بالترتیب ۶۸ سال اور ۴۶ سال ہونی چاہیے۔ اور اگر انھوں نے روزانہ ۱۶ گھنٹے کام کیا ہو تو اُن کی عمر ۳۴ سال ہونی چاہئیں۔

اگر آپ روزانہ ۱۶ گھنٹے کام کریں تو آپ کو ہر روز ۴۸ حدیثوں پر کام کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص یہ مان سکتا ہے کہ ایک آدمی روزانہ ۴۸ مرتبہ غسل کرے؟! اور ہر غسل کے بعد دو رکعت نماز پڑھے یعنی روزانہ ۱۹۶ رکعت نماز پڑھے اور ۴۸ مرتبہ استخارہ کرے؟! اگر غسل کو وضو کے لیے کافی نہ جانیں تو وضو بھی ۴۸ مرتبہ کرے اور پھر ۸ گھنٹوں میں کھانا، پینا، رفع حاجت اور نماز پنج گانہ مع فرائض و نوافل جو تقریباً ۵۱ رکعت ہوتی ہے اُن کے لیے بھی وضو کرے اور ان ہی ۸ گھنٹوں میں سوئے بھی۔ نیز ہر ماہ چار مرتبہ جمعہ کی نماز اور سال میں دو مرتبہ عید کی نماز ہوتی ہے۔

کسی کام کے لیے سفر کرنا، باہر سے سودا سلف لانا، گھر والوں سے بات کرنا، دیگر لوگوں کے دینی مسائل حل کرنا، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ برقرار رکھنا اور اس مقصد کے لیے مطالعہ دیکھنا نیز بیوی سے مقاربت کے لیے بھی وقت چاہیے ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ارباب دانش سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک آدمی ۳۴ سال تک مسلسل روزانہ ۴۸ مرتبہ نماز و غسل اور استخارہ کر سکتا ہے جبکہ اس میں ۸ گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ شاید امام بخاری کے زمانے میں دن ۴۸ گھنٹے کا ہوتا ہوگا؟

اگر اس حساب سے ہم ایک لمحے کے لیے چشم پوشی کر لیں تب بھی امام بخاری کا طریقہ انتخاب حدیث علم درایت و روایت کے خلاف ہے کیونکہ روایت قبول کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے احوالِ رُواۃ کو دیکھا جائے کہ وہ، سچا تھا یا

کی توثیق کی تھی۔[۱] امام بخاری نے اپنی صحیح کی روایات کی صحت اور حجیت کا دفاع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب میرے اور میرے خدا کے درمیان حجت ہے۔ میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث کے علاوہ کچھ نقل نہیں کیا۔[۲]

اہل سنت علماء امام بخاری کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ وہ ان کی کتاب کو **اصح الکتب بعد کتاب اللہ** یعنی قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب قرار دیتے ہیں۔[۳]

ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری کے مقدمے میں صحیح بخاری کے اصح ہونے پر طویل بحث کی ہے اور اس مقصد کے لیے ایک پورا باب مختص کیا ہے۔[۴]

امام نووی لکھتے ہیں کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری اور صحیح مسلم صحیح ترین کتابیں ہیں۔ پوری امت ان دونوں کتابوں کو قبول کرتی ہے۔ صحیح مسلم کے مقابلے میں صحیح بخاری صحیح تر اور زیادہ مفید ہے۔[۵] امام ذہبی نے بھی کم وبیش ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔[۶]

جھوٹا تھا، ذہین تھا یا کند ذہن تھا، امین تھا یا خائن تھا، مجہول الحال تھا یا غیر مجہول الحال وغیرہ۔ اس کے بعد سلسلۂ سند کو دیکھا جاتا ہے کہ روایت مقطوع تو نہیں ہے، راویوں کی کڑیاں درمیان سے ٹوٹی ہوئی تو نہیں ہیں۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ روایت، قرآن کے خلاف تو نہیں ہے۔

ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر امام صاحب کے جی میں نہ جانے کیا بات آئی کہ انھوں نے غسل ونماز اور استخارے کے ذریعے روایات منتخب کیں؟! جی ہاں! اگر ہر مسئلے میں استخارہ ہی کیا جائے تو پھر سلسلۂ سند تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اجتہاد کا کیا کام ہے؟ استخارہ دیکھتے جایئے اور عمل کرتے جایئے۔ اگر یہ بات آپ کے جی کو لگتی ہے تو میرا مشورہ ہے کہ صحیح بخاری پر ایک تجدید استخارہ ہو جائے، پھر دیکھیے کتنی روایات حذف ہوتی ہیں۔ (رضوانی)

صوفیہ "کشف" کے ذریعے حدیث کا انتخاب کرتے تھے۔ عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ نے اپنی کتاب المیزان الکبری میں لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے اُن سے حدیث کی صحت کے متعلق پوچھ لیا۔ (رضوانی)

۱۔ الحدیث والمحدثون ص ۳۷۸

۲۔ ایضاً ص ۳۷۹

۳۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۰

۴۔ ایضاً ص ۷۔ ۸

۵۔ شرح صحیح مسلم ج ۱، ص ۱۴

۶۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۲، ص ۴۷۰

اہل سنت کے مشہور علماء اور محدثین کے ان بیانات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اہل سنت قرآن کے بعد صحیح بخاری کو معتبر ترین کتاب مانتے ہیں۔ صحیح مسلم کا درجہ اس سے کچھ کم ہے۔

فواد عبد الباقی کی تحقیق کے مطابق صحیح بخاری میں ۷۵۶۳ احادیث ہیں۔

اہل سنت علماء کی نظر میں صحیح بخاری کے معتبر ہونے کی وجوہات

صحیح بخاری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ ذیل وجوہات کی بنا پر یہ کتاب اہل سنت علماء کی نظر میں سب سے زیادہ معتبر ہے:

(۱) قدیمی کتاب: ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ صحیح بخاری سے پہلے دو جوامع حدیث موجود تھے۔ ایک امام مالک کی موطا اور دوسری احمد بن حنبل کی مسند۔

موطا میں جامعیت کم اور اجتہادی رنگ زیادہ تھا اور مسند احمد میں ضعیف اور وضعی احادیث موجود تھیں اس لیے وہ صحیح بخاری جیسا درجہ حاصل نہ کرسکیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صحیح بخاری کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ جہاں جامع ترین کتاب ہے وہاں محکم ترین کتاب بھی ہے جو تدوینِ حدیث کے اہم ترین دور یعنی تیسری صدی کی پہلی دہائی میں منظر عام پر آئی۔

(۲) صحیح مضامین: صحیح بخاری کو جن حضرات نے قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب قرار دیا تھا انھوں نے یہ بات اس کے مضامین کو دیکھ کر کہی تھی کیونکہ اُن کے خیال میں صحیح کتاب اسی رنگ و بو کی حامل ہوتی ہے جس کے وہ طالب تھے اور یہ کتاب اُن کے نظریات کی پوری ترجمانی کرتی تھی۔ یہ کتاب مسند احمد کی مانند نہ تھی کہ جس میں فضائل اہل بیتؑ کی روایات بیان کی گئی ہیں اور نہ ہی حاکم نیشاپوری کی طرح بخاری محبت اہل بیتؑ کا دم بھرتے تھے اور نہ امام زمخشری کی طرح ''معتزلی عقیدہ'' رکھتے تھے۔ جب امام بخاری غسل کرنے، دو رکعت نماز پڑھنے اور استخارہ دیکھنے کے بعد تاریخ اسلام اور خلفاء کے متعلق ایسی خوب صورت روایات نقل کرتے ہیں کہ نہ سیخ جلتی ہے نہ کباب جلتا ہے — اور اس سے خلفاء کے طرف داروں کی پیشانیوں پر بل نہیں پڑتے — تو ایسی کتاب کو صحیح ترین کتاب کیوں نہ کہا جائے۔

صحیح بخاری کا تنقیدی جائزہ

امام بخاری نے اگرچہ اپنی کتاب کی صحت کا دفاع کیا ہے اور علمائے اہل سنت کی اکثریت نے اسے ''صحیح ترین'' کتاب قرار دیا ہے اس کے باوجود اس پر کئی حوالوں سے تنقید ہوئی ہے:

(۱) صحیح بخاری میں ضعفِ اسناد

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کل من روی عنہ البخاری فقد جاوز القنطرۃ یعنی بخاری نے جس راوی سے روایت نقل کی وہ علمائے رجال کی جرح و تعدیل کے پُل سے گزر چکا۔[۱] اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ بخاری نے بہت سے فاسق و فاجر، خارجی اور ناصبی لوگوں سے روایات نقل کی ہیں۔ بخاری کے راویوں میں ایسے افراد دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے اپنے دین کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا تھا جیسے عمرو بن عاص، مروان بن حکم، ابوسفیان، معاویہ بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور نعمان بن بشیر (جو آخری لمحے تک معاویہ اور یزید کے ساتھ اُن کے تمام جرائم میں شریک رہا)۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ امام بخاری کے رجال کی ثقاہت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے خوارج کے سردار عمران بن حطان سے بھی روایات لی ہیں۔ یہ شخص خوارج کا خطیب تھا۔ بخاری نے عروہ بن زبیر نیز مغرب عربی[۲] میں خارجی اور اباضی مذہب کے پرچارک عکرمہ سے بھی بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ بخاری نے یہ جاننے کے باوجود کہ ابو ہریرہ کی صحابیت کا زمانہ نہایت مختصر ہے ابو ہریرہ سے ۴۴۶ احادیث نقل کی ہیں۔ انھوں نے عبداللہ بن عمر سے ۲۷۰، بی بی عائشہ سے ۲۴۲ ابوموسیٰ اشعری سے ۵۷ اور انس بن مالک سے ۲۰۰ سے زائد احادیث نقل کی ہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے دین اسلام کے سچے رہنماؤں، معارف اسلامی کے سرچشموں اور اسلام و حدیث کے حقیقی معلموں سے یا تو احادیث لی ہی نہیں اور اگر لی ہیں تو بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر لی ہیں۔ حضرت علیؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق شہرِ علم کا دروازہ تھے مگر امام بخاری نے اُن سے صرف ۱۹ احادیث لی ہیں اور دختر رسولؐ جناب فاطمہ زہراؑ سے بس ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ اہل بیتؑ کے دوسرے افراد جیسے امام حسنؑ سے جو عبداللہ بن زبیر کے ہم عمر تھے ایک بھی حدیث نقل نہیں کی ہے۔ اور جناب زید بن علی جن کی طرف فرقہ زیدیہ منسوب ہے اور جو صاحب مسند بھی تھے اُن سے امام بخاری نے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ اسی طرح امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ جنھوں نے مدینہ منورہ میں علم حدیث اور علم فقہ کی شہرہ آفاق درس گاہ کی داغ بیل ڈالی تھی اور امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ جو

۱۔ مقدمہ فتح الباری ص ۳۸۱۔ الکشف الحدیث ص ۱۱۲۔ الصحیح من السیرہ ج ۱، ص ۲۶۰

۲۔ مراکش، الجزائر، تیونس، لیبیا اور موریطانیہ کو ملا کر مغرب عربی کہا جاتا ہے۔ (رضوانی)

کہ اسلامی علوم و معارف میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے، اُن سے بھی امام بخاری نے کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے۔ امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ بخاری کے ہم عصر تھے نیز اسلامی علوم و معارف اور احادیث کے مرجع سمجھے جاتے تھے، اُن سے بھی امام بخاری نے کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے۔[1]

علامہ سید شرف الدین عاملی رقم طراز ہیں:

بخاری کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ائمہ اہل بیتؑ سے احادیث نقل نہیں کیں۔ انھوں نے اپنی پوری کتاب میں امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ، امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ سے ایک بھی حدیث نقل نہیں کی جبکہ وہ اُن کے ہم عصر بھی تھے۔ اسی طرح انھوں نے حسن بن حسن، زید بن علی بن حسین، یحییٰ بن زید، نفس زکیہ اور دیگر بزرگانِ اہل بیتؑ اور باغ زہرا کے پھولوں مثلاً عبداللہ بن حسن اور علی بن جعفر عریضی سے بھی کوئی حدیث نقل نہیں کی حتیٰ کہ انھوں نے سبط رسولؐ، ریحان رسولؐ اور جوانانِ جنت کے سردار امام حسنؑ سے بھی کوئی روایت نقل نہیں کی جبکہ انھوں نے اہل بیتؑ کے بدترین دشمن اور خوارج کے سردار عمران بن حطان سے روایت لی ہے جبکہ وہ ملعون ہے جس نے حضرت علیؑ کے قاتل عبدالرحمان بن ملجم کی تعریف میں یہ اشعار کہے تھے:

یا ضربة من تقی ما اراد بها الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

انی لاذکره یوما فاحسبه او فی البریة عند الله میزانا

کیا کہنے اُس متقی کی ضربت کے جس کا مقصد رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں جب بھی ابن ملجم کو یاد کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں اس کی نیکیوں کا پلڑا سب لوگوں سے بھاری ہوگا۔[2]

علامہ محمد حسن مظفر نے الافصاح عن رجال احوال الصحاح میں ۳۶۸ ایسے راویوں کے نام گنوائے ہیں جو خود اہل سنت علماء کے دو معروف علمائے رجال کے نزدیک مطعون اور ضعیف ہیں۔[3]

صرف شیعہ علماء ہی نہیں بلکہ خود اہل سنت کے بہت سے علماء نے صحیح بخاری کے رجال پر تنقید کی ہے۔

۱۔ علم حدیث ص ۳۵۲ ۔ ۳۵۳

۲۔ اضواء علی السنة المحمدیة ص ۳۲۷ بحوالہ الفصول المہمہ ص ۱۵۹ و ۱۶۸۔ المراجعات ص ۳۱۵۔ النص والاجتہاد ص ۵۲۷۔ معالم المدرستین ج ۲، ص ۳۹۔ دراسات الحدیث والمحدثین ص ۱۶۱ ۔ ۱۹۱

۳۔ علم حدیث ص ۳۵۳

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: حافظانِ حدیث نے امام بخاری کے ۱۱۰ راویوں پر شک کا اظہار کیا ہے اور انھیں غیر صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری کے ۴۰۰ میں سے ۸۰ راوی ضعیف ہیں۔ ابن حجر نے اپنی شرح بخاری کی جلد دوم کے مقدمے میں چار سو ضعیف راویوں کا نام اور علمائے رجال کی زبانی اُن کے ضعف کے اسباب بیان کیے ہیں۔[1]

حافظ زین الدین عراقی نے محمد بن طاہر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''بخاری اور مسلم نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ صرف ان راویوں سے حدیث نقل کریں گے جن کی ثقاہت پر اتفاق ہو اور اُن کی روایت کا سلسلہ کسی مشہور صحابی سے متصل ہو۔'' اس کے بعد حافظ عراقی لکھتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں کیونکہ نسائی نے بخاری اور مسلم کے راویوں کے ایک گروہ کو یا اُن میں سے ہر گروہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔[2]

بدر الدین عینی لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کے رجال میں ایسے گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے کچھ متقدمین علمائے رجال نے ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

(۲) صحیح بخاری کی ضعیف روایات پر ایک نظر

سابقہ اعتراضات سے قطع نظر صحیح بخاری پر اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں ایسی ایسی روایات ہیں جو نہ صرف قرآن اور اہل بیتؑ کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں بلکہ اہل سنت کے بہت سے اہل نظر علماء کے عقائد کے بھی خلاف ہیں مگر اہل سنت کے دینی حلقوں میں اس کتاب کے احترام اور مقام کی وجہ سے بہت سے محققین ایسی روایات سے استناد کرتے ہیں۔

اگر ہم یہ کہیں کہ صحیح بخاری نے علم کلام اور علم فقہ میں نادرست افکار کو رواج دیا اور امت کو صحیح اسلامی اور خالص قرآنی فرہنگ سے دور رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

صحیح بخاری توحید کے باب میں ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے جو اعضاء و جوارح اور جسم رکھتا ہے اور قابل رؤیت ہے۔ وہ باقی موجودات کی طرح محل حوادث ہے اور زائد بر ذات صفات رکھتا ہے۔ اس کتاب کی روایات کے مطابق انبیاء جھوٹ بولتے ہیں، حرام غذا کھاتے ہیں، زن مرید ہوتے ہیں اور موت سے بچنے کے لیے ملک الموت کے منہ پر طمانچہ مار کر اُس کی آنکھ نکال دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۱۷ بحوالہ فتح الباری ج ۲، ص ۸۱

۲و۳۔ ایضاً ص ۳۲۵

حالتِ جنابت میں نماز پڑھاتے ہیں اور سہو ونسیان کا شکار ہوجاتے ہیں۔ انھیں اپنی نبوت میں شک ہوتا ہے اور اُن پر جادو کا اثر ہوتا ہے ... صحیح بخاری کے مطابق قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے اور حالتِ حیض میں بیوی سے مباشرت کرنا اور گانا بجانا جائز ہے ...[۱]

صحیح بخاری کی شروح

علمائے اہل سنت نے صحیح بخاری کی جو شروح لکھی ہیں اُن میں سے حسب ذیل شروح اہم ہیں:

(۱) الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری از شمس الدین کرمانی (متوفی ۷۸۶ھ)

(۲) فتح الباری فی شرح صحیح البخاری از ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

(۳) عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری از بدر الدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ)

(۴) صحیح مسلم

ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری ۲۰۴ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ میں اسی شہر میں فوت ہوئے۔[۲] انھوں نے اپنے شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر تکمیل تعلیم کے لیے عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر اختیار کیا۔ انھوں نے اپنے دور کے مشہور محدثین یحییٰ بن یحییٰ، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور محمد بن اسماعیل بخاری سے کسبِ فیض کیا۔[۳]

حدیث اور اس کی تحقیق کے حوالے سے اُن کی وسعتِ علمی کا عالم یہ تھا کہ احمد بن سلمہ اور ابو عیسیٰ ترمذی جو علمِ حدیث میں اُن کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے، وہ بھی اُن سے علم حدیث حاصل کرتے تھے۔[۴] نووی نے امام مسلم کی بہت سی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔[۵]

محمد بن ماسرجی کہتے ہیں کہ میں نے امام مسلم کو کہتے سنا کہ "میں نے اپنی صحیح کا انتخاب اُن

۱۔ علم حدیث ص ۵۶ ۳۔ مزید معلومات کے لیے دیکھیے: محمد صادق نجمی کی کتاب اضواء علی الصحیحین

۲۔ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۲۶۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۴۱

۳۔ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۰۱۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۵۸، ص ۸۶۔ ۸۷

۴ و ۵۔ شرح مسلم ج ۱، ص ۸

تین لاکھ احادیث سے کیا ہے جو مجھے زبانی یاد ہیں۔[1]

صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم، اہل سنت کی معتبر ترین کتاب ہے۔ ابن کثیر کے بقول مغرب عربی کے علماء اور ابو علی نیشاپوری، صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔[2]

صحیح مسلم میں کل ۷۲۷۵ روایات ہیں اور حذف مکررات کے بعد ۳۰۱۸ روایات ہیں۔

ویسے تو صحیح مسلم کی کافی شروح لکھی گئی ہیں مگر امام نووی اور علامہ سیوطی کی الدیباج علی صحیح مسلم اہم شرحیں شمار ہوتی ہیں۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا تقابلی جائزہ

اگرچہ مسلم بھی بخاری کی طرح مخصوص شرائط کی حامل روایات کو قبول کرتے تھے مگر کچھ شرائط میں وہ بخاری سے متفق نہیں تھے مثلاً بخاری نقل حدیث کے لیے یہ دو شرائط بھی عائد کرتے ہیں کہ راوی شیخ حدیث کا ہم عصر ہو اور اُن دونوں کی ملاقات بھی ہوئی ہو جبکہ مسلم کی نظر میں صرف ہم عصر ہونا ہی کافی ہے، ملاقات ضروری نہیں ہے۔ دوسری جانب بخاری اور مسلم کی نظر میں صحت حدیث کے معیار بھی یکساں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم نے کچھ ایسے رایوں سے روایت لی ہے جن سے بخاری نے روایت نہیں لی۔

بہت سے اہل علم نے صحیح مسلم کو روایات کی ترتیب اور انتخاب کی وجہ سے صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے۔ اگرچہ امام بخاری علم حدیث سے گہری واقفیت، وسیع معلومات اور زیادہ محدثین سے استفادہ کرنے کی وجہ سے مسلم پر برتری رکھتے ہیں اور امام بخاری، امام مسلم کے استاد ہیں اس لیے بھی انھیں امام مسلم پر فضیلت حاصل ہے۔[3]

(۵) سنن ابی داؤد

ابو داؤد سلیمان بن اشعث ازدی بجستانی ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں بصرہ میں فوت

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۰۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۳۰

۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۳۰۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۰

۳۔ دیکھیے: شرح مسلم ج ۱، ص ۱۱، ۲۲۔ اصول الحدیث ص ۳۱۶۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۲۲۔۳۳۹

ہوئے۔[۱] انھوں نے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے خراسان، شام، مصر اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور آخر میں بصرہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور مرتے دم تک بصرہ ہی میں قیام پذیر رہے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث کا علم احمد بن حنبل، صفوان بن صالح، قتیبہ بن سعید اور اسحاق بن راہویہ سے حاصل کیا تھا۔[۲]

بیان کیا جاتا ہے کہ ترمذی اور نسائی جیسے صاحبانِ سنن اور ابو عوانہ اسفرائینی نے ابو داؤد سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔[۳] اور وہ اپنے استاد کو اپنے دور کا امام المحدثین قرار دیتے تھے۔[۴] ابو داؤد نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں ''المسائل'' بھی شامل ہے۔ اس میں انھوں نے احمد بن حنبل کے سوالوں کے جواب دیے ہیں۔

ابو داؤد کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس سے فقہاء استدلال اور احکام کا استنباط کر سکیں چنانچہ انھوں نے ''سنن'' لکھی۔ ابوبکر بن داسہ جو سنن ابی داؤد کا ایک راوی ہے، بیان کرتا ہے کہ ابو داؤد کہا کرتے تھے: میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب پانچ لاکھ احادیث لکھی ہیں اور ان میں سے ۴۸۰۰ صحیح اور صحیح کے قریب ترین احادیث کا انتخاب کر کے اپنی سنن میں جمع کیا ہے۔[۵] ابو داؤد نے اپنی یہ کتاب احمد بن حنبل کے پاس بھجوائی تھی اور انھوں نے اس کی تائید کی تھی۔[۶]

اس وجہ سے سنن ابو داؤد کو خصوصی طور پر قابل اعتماد قرار دیا جاتا ہے اور اسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد کا درجہ حاصل ہے۔

خطابی کہتے ہیں کہ ''علم حدیث میں سنن ابو داؤد کی مانند کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔''[۷] ابو سعید بن اعرابی، ابو علی لؤلؤی اور ابوبکر بن داسہ سنن کے مشہور ترین راوی ہیں اور یہ کتاب ابو علی لؤلؤی کی روایت کی بنیاد پر شائع ہوئی ہے۔[۸] طبع دارالسلام کے مطابق سنن ابو داؤد میں ۵۲۷۴ احادیث ہیں۔

۱۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۲۲، ص ۱۹۶۔ الاعلام ج ۳، ص ۱۲۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۶۵

۲۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۱، ص ۱۹۱۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۱۳، ص ۲۰۳۔ تہذیب التہذیب ج ۴، ص ۱۵۰

۳۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۱، ص ۱۹۲، ۱۹۷۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۱۳، ص ۲۰۵

۴۔ تاریخ مدینۃ دمشق ج ۱، ص ۱۹۴

۵۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۱۳، ص ۲۰۹۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۶۴

۶۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۱۳، ص ۲۰۹

۷۔ علم الحدیث ص ۴۱ ۸۔ تاریخ عموی حدیث ص ۱۴۸

(۶) سنن ترمذی

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی ۲۰۹ھ میں دریائے جیحون[۱] کے کنارے واقع شہر ترمذ کے نواحی گاؤں ''بوغ'' میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اسی شہر میں ۲۷۹ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ترمذی نے قتیبہ بن سعید، اسحاق بن راہویہ اور ابو مصعب زہری جیسے مشائخ حدیث سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ انھوں نے حصول علم کے لیے خراسان، حجاز اور بغداد کا سفر کیا تھا۔[۲] تکمیل علم کے بعد وہ اپنے وطن واپس آگئے اور اسی شہر میں اپنی کتاب سنن تالیف کی۔ کچھ علماء کا بیان ہے کہ ترمذی آخر عمر میں نابینا ہوگئے تھے اسی لیے انھیں ''ضریر'' کہا جاتا ہے۔[۳] ترمذی نے بلا کا حافظہ اور ذہانت پائی تھی۔ انھوں نے اقسام حدیث میں ''حدیثِ حسن'' کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔ اُن کے بقول حسن وہ حدیث ہے جو صحیح سے ایک درجہ کمتر ہو۔ ترمذی سے پہلے حدیث کی صرف دو قسمیں ہوتی تھیں: صحیح اور ضعیف۔[۴]

امام ترمذی کی کتاب جامع ترمذی اور سنن ترمذی کے نام سے مشہور ہے چنانچہ سمعانی، مزی، ذہبی اور عسقلانی جیسے محدثین اسے جامع ترمذی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

محمد ناصر الدین البانی[۵] کہتے ہیں کہ اسے ''جامع ترمذی'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں

۱۔ ''ترمذ'' ماوراء النہر کا قدیم شہر ہے۔ یہ بلخ کے شمال میں جمہوریہ تاجکستان میں واقع ہے۔ (علم حدیث ص ۳۴۷)

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۶۳۶۔ تہذیب الکمال ج ۲۶، ص ۲۵۲۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۳، ص ۲۷۱

۳۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۳، ص ۲۷۰

۴۔ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۳۳۴۔ اصول الحدیث ص ۳۳۱

۵۔ مشہور سلفی عالم علامہ محمد ناصر الدین البانی (۱۹۱۴ء - ۱۹۹۹ء) عظیم معاصر محدث اور ۱۰۰ سے زائد کتابوں کے مولف تھے حدیث کے باب میں انھوں نے اس رجحان کی آبیاری کی کہ احکام و مسائل میں صحیح اور حسن حدیث کا ہی اہتمام کیا جائے، ضعیف پر قطعاً عمل نہ کیا جائے چنانچہ انھوں نے ذخیرۂ احادیث میں سے صحیح اور ضعیف روایات کو چھانٹ کر رکھ دیا۔ ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں: **سلسلة الاحاديث الصحيحة** (۱۱ جلدیں) **سلسلة الاحاديث الضعيفة** (۱۴ جلدیں) **الترغيب والترهيب** (۴ جلدیں)

ایران کے علامہ عزیز اللہ عطاردی (۱۹۲۸ء - ۲۰۱۴ء) حدیث، رجال اور تاریخ کے بہت بڑے کتاب شناس تھے۔ وہ آیت اللہ العظمیٰ سید محسن حکیم طباطبائی، آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئی، شیخ آقا بزرگ تہرانی اور علامہ امینی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے احادیث رسولؐ پر تحقیق کے بعد عربی زبان میں جو کتابیں تالیف کیں اُن کی فہرست یہ ہے: مسند امام علی ابن ابی طالبؑ (۲۵ جلدیں) مسند حضرت فاطمہ زہراؑ، مسند امام حسنؑ، مسند امام حسینؑ (۳ جلدیں) مسند امام زین العابدینؑ (۲ جلدیں) مسند امام محمد باقرؑ (۶ جلدیں) مسند امام جعفر صادقؑ (۲۲ جلدیں) مسند امام موسیٰ کاظمؑ (۳ جلدیں) مسند امام علی رضاؑ (۲ جلدیں) مسند امام محمد تقی، مسند امام علی نقی، مسند امام حسن عسکریؑ۔ انھوں نے تاریخ، رجال، جغرافیہ اور فرہنگ و ادب پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے۔ (رضوانی)

ترمذی نے اتنے فوائد اور علوم جمع کیے ہیں جو صحیح بخاری اور دوسری کتابوں میں بھی موجود نہیں ہیں۔[۱]

مصطفیٰ بن عبداللہ کاتب جلبی نے **کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون** میں اور احمد شاکر نے اس کتاب کو "الجامع الصحیح" کے نام سے یاد کیا ہے۔[۲] ترمذی بیان کرتے ہیں کہ سنن کی تدوین کے بعد میں نے اس کتاب کو حجاز، عراق اور خراسان کے محدثین کی خدمت میں پیش کیا تو سب نے اس کی تائید کی تھی۔[۳] عقیدت مندوں نے اس کتاب کے متعلق یہاں تک کہا ہے: **من کان فی بیتہ ھذا الکتاب فکانما نبی یتکلم** جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو گویا اُس گھر میں نبی گفتگو کر رہا ہے۔[۴]

طبع دار السلام کے مطابق سنن ترمذی میں ۳۹۵۶ روایات ہیں۔

(۷) سنن نسائی

ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب قدیم ایران کے شہر "نساء" میں پیدا ہوئے تھے جو سرخس، مرو اور ابیورد کے درمیان واقع ہے۔ اُن کا سال ولادت 215ھ اور سال وفات ۳۰۳ھ ہے۔ اُن کو دمشق کی جامع مسجد میں زخمی کیا گیا۔ وہاں سے وہ مکہ آئے جہاں اُن کا انتقال ہوگیا اور اُن کو صفا و مروہ کے درمیان دفن کیا گیا۔[۵] انھوں نے اسحاق بن راہویہ، حصین بن منصور اور عیسیٰ بن حماد سے علم حدیث کی تعلیم پائی۔[۶] نسائی کو اہل بیت رسولؐ سے خاص عقیدت تھی اس لیے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔[۷] انھوں نے امام علیؑ کے فضائل میں خصائص امیر المومنینؑ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں شام گیا تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ امام علیؑ سے منحرف ہیں اس لیے میں نے یہ کتاب لکھی تاکہ اُن لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ ثابت ہو۔[۸] کہا جاتا ہے کہ جب نسائی نے یہ کتاب لکھی تو اہل شام نے اُن سے کہا کہ آپ فضائل علیؑ کی طرح فضائل معاویہ پر بھی کوئی کتاب لکھیں۔

۱۔ ضعیف سنن الترمذی ص ۱۸

۲۔ ایضاً ص ۱۷

۳ و ۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۶۳۴۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۳، ص ۲۷۴

۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۷۰۱۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۴، ص ۱۲۵۔ ذہبی نے ان کی پیدائش کا سال ۲۱۰ھ لکھا ہے۔

۶۔ تہذیب التہذیب ج ۱، ص ۳۶۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۱۲۳

۷۔ خصائص امیر المومنین ص ۳۲۔ سید محسن عاملی نے انھیں شیعہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے: اعیان الشیعہ ج ۸، ص ۴۴۸

۸۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۴، ص ۱۲۹

انھوں نے کہا کہ میں بھلا اُس شخص کے متعلق کیا لکھوں جس کے لیے رسول خدا ﷺ نے فرمایا تھا: لَا اَشْبَعَ اللّٰهُ بَطْنَهُ خدا اسے کبھی شکم سیر نہ کرے۔ (تاریخ بلاذری)

یہ سن کر شامیوں نے اُن پر حملہ کردیا اور انھیں زد و کوب کیا۔ پھر برا بھلا کہتے اور مارتے ہوئے شہر سے نکال دیا اور اسی تشدد کے سبب وہ مکہ پہنچ کر انتقال کر گئے۔[۱]

نسائی نے ابتدا میں احادیث رسولؐ پر ایک مفصل کتاب لکھی اور اُس کا نام "السنن الکبریٰ" رکھا جس میں انھوں نے صحیح، حسن اور ضعیف روایات کو جمع کیا تھا۔ انھوں نے وہ کتاب حاکم رملہ کے سامنے پیش کی تو اُس نے پوچھا کہ کیا آپ کی اس کتاب میں تمام روایات صحیح ہیں؟ نسائی نے جواب دیا کہ میں نے اس کتاب میں صحیح، حسن اور حسن کے قریب ترین روایات کو جمع کیا ہے۔ حاکم نے انھیں تجویز دی کہ آپ اس میں سے صحیح احادیث کا استخراج کریں۔ اس تجویز کے بعد نسائی نے اپنی پہلی کتاب کی تلخیص کی اور اُس میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کر کے ایک نئی کتاب "السنن المجتبیٰ" لکھی اور اُن کی یہ مشہور سنن آج بھی موجود ہے۔ اس کتاب کو "السنن الصغیر" بھی کہا جاتا ہے۔

نسائی نے اس کتاب میں احادیث کے انتخاب اور چھان بین کے لیے بخاری اور مسلم کی شرائط سے بھی زیادہ سخت شرائط رکھی تھیں اسی لیے اس کتاب کو صحاح ستہ کا حصہ قرار دیا گیا۔ کچھ محدثین اس کتاب کو روایات کی تبویب اور فقہی ابواب کی تنظیم کی وجہ سے سنن ابی داؤد کے مساوی درجہ دیتے ہیں اور کچھ محدثین اسے سنن ابی داؤد کے برابر کا درجہ دیتے ہیں۔[۲] نسائی نے ضعیف راویوں سے بہت ہی کم احادیث نقل کی ہیں مگر اس کے باوجود ابن کثیر کا خیال ہے کہ سنن نسائی میں مجہول اور مجروح راوی پائے جاتے ہیں اور اس میں ضعیف، معلل اور منکر روایات بھی موجود ہیں۔[۳] سنن نسائی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں ایک ہی حدیث کو بار بار لکھا گیا ہے مثلاً اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کو سولہ بار مختلف اسناد کے ساتھ لکھا گیا ہے۔[۴]

سنن نسائی میں ۵۷۶۱ احادیث ہیں۔[۵]

۱۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۴، ص ۱۳۳

۲۔ مقدمہ سنن نسائی ص ۵

۳۔ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۳۳۵

۴۔ علم الحدیث ص ۵۴

۵۔ اصول الحدیث ص ۳۲۵

(۸) سنن ابن ماجہ

ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ ربعی قزوینی ۲۰۷ھ یا ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۳ھ میں وفات پا گئے۔ انھوں نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے بغداد، کوفہ، بصرہ، شام، حجاز اور رَے جیسے شہروں کا رخ کیا اور علی بن محمد طنافسی، مصعب بن عبداللہ زبیری جیسے مشائخ حدیث سے تعلیم حاصل کی۔[1]

انھوں نے قرآن کی ایک تفسیر اور قزوین شہر کی تاریخ بھی لکھی ہے[2] مگر اُن کی اہم ترین کتاب "سنن" ہے جس میں طہارت سے لے کر دیات (خوں بہا) تک کے تمام فقہی ابواب پر احادیث موجود ہیں۔ اُن کی کتاب کو صحاح ستہ کی آخری قرار دیا گیا ہے البتہ اکثر مالکی فقہاء سنن ابن ماجہ کی بجائے موطا مالک کو صحاح ستہ کی آخری کتاب کا درجہ دیتے ہیں۔[3]

فقہ مالکی کے پیروکاروں کے علاوہ کچھ اور علماء بھی مثلاً ابن اثیر جزری موطا مالک کو سنن ابن ماجہ پر ترجیح دیتے ہیں جبکہ کچھ دیگر علماء کا خیال ہے کہ سنن دارمی کو سنن ابن ماجہ پر فوقیت حاصل ہے۔[4]

سنن ابن ماجہ میں ۴۳۴۱ روایات ہیں جن میں سے ۳۰۰۲ ایسی ہیں جو صحاح ستہ کی پہلی پانچ کتابوں میں موجود ہیں۔ باقی روایات میں سے صرف ۴۲۸ روایات کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔[5]

سیوطی نے سنن ابن ماجہ کے کچھ راویوں پر جرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ متہم بالکذب تھے اور حدیث کے چور تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان مجروح افراد کی بیان کردہ روایات دوسرے طرق سے بھی منقول ہیں۔[6]

سنن ابن ماجہ کی درج ذیل دو شرحیں بہت مشہور ہیں:

(۱) سیوطی کی مصباح الزجاجہ

(۲) سندی کی کفایۃ الحاجہ

۱۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۳، ص ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ الاعلام ج ۷، ص ۱۴۴

۲۔ الاعلام ج ۷، ص ۱۴۴

۳۔ کتاب خانہ ابن طاؤس ص ۳۲۲

۴۔ اصول الحدیث ص ۳۲۷۔ تاریخ عمومی حدیث ص ۱۴۷

۵۔ ایضاً

۶۔ تاریخ عمومی حدیث ص ۱۴۷

صحاح ستہ + موطّا مالک + مسند احمد بن حنبل پر ایک طائرانہ نظر

نام	مؤلف	ولادت/وفات	روایات	جلد	مشہور شروح
موطا مالک	مالک بن انس	۹۳ _ ۱۷۹	۳۰۹۱	۲	کشف المغطاء تنویر الحوالک
مسند امام احمد	احمد بن حنبل	۱۶۴ _ ۲۴۱	۲۷۵۱۹	۶	عقود الزبرجد علی مسند الامام احمد
الجامع الصحیح	محمد بن اسماعیل بخاری	۱۹۴ _ ۲۵۶	۷۵۶۳	۸	فتح الباری از ابن حجر عمدۃ القاری از عینی
الجامع الصحیح	مسلم بن حجاج قشیری	۲۰۴ _ ۲۶۱	۷۲۷۵	۸	الدیباج علی صحیح مسلم از سیوطی
سنن ابن داؤد	سلیمان بن اشعث سجستانی	۲۰۲ _ ۲۷۵	۵۲۷۴	۲	معالم السنن از خطابی مرقاۃ الصعود از سیوطی
جامع ترمذی	ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۰۹ _ ۲۷۹	۳۹۵۶	۵	عارضۃ الاحوذی از معافری قوت المغتذی از سیوطی
سنن نسائی	احمد بن شعیب نسائی	۲۱۵ _ ۳۰۳	۵۷۶۱	۶	شرح سنن النسائی از سیوطی حاشیہ امام سندی
سنن ابن ماجہ	محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی	۲۰۹ _ ۲۷۳	۴۳۴۱	۲	مصباح الزجاجہ از سیوطی کفایۃ الحاجہ از امام سندی

سنی جوامع حدیث کی تکمیل و تنظیم کا دور

حدیث کی ابتدائی آٹھ کتابیں یعنی موطا مالک، مسند احمد بن حنبل اور صحاح ستہ مشہور محدثین نے بڑی توجہ سے مرتب کی تھیں اور علمائے اہلسنت نے ان کتابوں کو انتہائی قابل اعتماد قرار دیا۔ ان کتابوں کے بعد جوامع احادیث کی تکمیل و تنظیم کا دور شروع ہوا اور بعد میں آنے والے محدثین نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی امکان بھر کوششیں کیں۔ ان ابتدائی جوامع احادیث کے منظر عام پر آنے کے بعد محدثین نے محسوس کیا کہ اگرچہ ان کتابوں کے مؤلفین نے اپنی روایات کو درست قرار دیا ہے اور بہت سے دوسرے محدثین نے بھی ان کی تائید کی ہے لیکن اس کے باوجود بہت سی احادیث ایسی بھی ہیں جو ابھی تک رشتۂ تحریر میں نہیں آئیں اس لیے انھوں نے سوچا کہ اگر باقی احادیث کو جمع نہ کیا گیا تو امت بہت بڑے ذخیرۂ حدیث سے محروم رہ جائے گی۔ اسی طرح سے بہت سے علمائے حدیث نے یہ سوچا کہ مذکورہ جوامع سے مکررات کو نکال کر از سر نو منظم کرنا چاہیے۔ اس طرح جوامع احادیث کی تکمیل و تنظیم کا دور شروع ہوا اور اس دور میں جو مشہور کتابیں منظر عام پر آئیں اُن کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

یاد رہے کہ یہ دور دور تدوین کے فوراً بعد شروع ہوا کیونکہ دور تکمیل کا انحصار ابتدائی منابع احادیث پر تھا جبکہ دور تنظیم کا انحصار ابتدائی منابع پر نہیں تھا اس وجہ سے یہ دور ابھی تک جاری ہے۔

دورِ تکمیل کے اہم منابع حدیث

(۱) المسند الصحیح

اس کتاب کے مؤلف ابو حاتم محمد بن حبان ہیں جو ابن حبان کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کا سال وفات ۳۵۴ھ ہے۔ وہ مورخ، جغرافیہ دان اور محدث تھے۔

یہ کتاب ''صحیح ابن حبان'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ابن حبان نے اس کتاب میں روایات کو پانچ کلی موضوعات میں تقسیم کیا ہے یعنی اوامر، نواہی، اخبار، مباحات اور افعال رسولؐ۔ اس تقسیم کی وجہ سے اس کتاب کو الانواع والتقاسیم بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ محدثین کا خیال ہے کہ یہ کتاب صحت کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ پر فوقیت رکھتی ہے۔[1]

(۲) الالزامات

یہ کتاب ابوالحسن علی بن عمر بن احمد کی تالیف ہے جو دارقطنی کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کی رحلت کا سال ۳۸۵ھ ہے۔ دارقطنی نے حدیث پر چالیس کتابیں لکھی تھیں جن میں سے یہ کتابیں بہت مشہور ہیں: **التصحیف فی الحدیث، کتاب الجرح والتعدیل** اور **کتاب العلل فی الحدیث**۔[2]

دارقطنی نے اپنی کتاب ''الالزامات علی الصحیحین'' میں اُن روایات کو جمع کیا ہے جو بخاری و مسلم کی شرائط پر پوری اترتی تھیں مگر انھوں نے ان روایات کو نقل نہیں کیا تھا۔

(۳) المستدرک علی الصحیحین

یہ کتاب ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ کی تالیف ہے جو حاکم نیشاپوری کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کا سن وفات ۴۰۵ھ ہے۔ حاکم نیشاپوری اہل سنت کے مایہ ناز محدث تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اُن روایات کو جمع کیا ہے جو بخاری و مسلم کے معیارات پر پوری اترتی تھیں مگر بخاری اور مسلم نے بوجوہ انھیں نقل نہیں کیا تھا۔ اسی تلافی کی وجہ سے انھوں نے اپنی کتاب کا نام ''المستدرک علی الصحیحین'' رکھا ہے۔[3]

یہ کتاب چار جلدوں اور ۸۸۰۳ روایات پر مشتمل ہے۔

۱۔ الاعلام ج ۶، ص ۷۸

۲۔ ہدیۃ العارفین ج ۱، ص ۶۸۳

۳۔ مستدرک علی الصحیحین ج ۱، ص ۷۔ ۱۰

دور تنظیم کے اہم منابع احادیث

(۱) مصابیح السنۃ

یہ کتاب حسین بن مسعود شافعی کی تالیف ہے جو فراء بغوی کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کا انتقال ۵۱۶ھ میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں صحاح ستہ، موطا مالک اور سنن دارمی کی روایات کی اسناد کو حذف کر کے اُن روایات کو ازسرِنو لکھا۔ بغوی نے کتاب کے مقدمے میں کہا ہے کہ میں نے اختصار کے پیش نظر اسناد کو حذف کر دیا ہے کیونکہ یہ اصلی منابع میں موجود ہیں۔ انھوں نے احادیث کو دو حصوں یعنی صحیح اور حسن میں تقسیم کیا ہے۔ صحیح سے اُن کی مراد صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات ہیں اور حسن سے مراد وہ روایات ہیں جو دوسری کتابوں میں درج ہیں۔ چونکہ بغوی نے یہ طریقہ اپنے طور پر ایجاد کیا تھا اس لیے علماء نے اس پر تنقید کی ہے۔[1]

بغوی کے بعد محمد بن عبداللہ نے جو خطیب تبریزی (متوفی ۷۳۰ھ) کہلاتے ہیں بغوی کی کتاب پر کہ جس میں ضعیف روایات ہیں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ''مشکاۃ المصابیح'' نامی کتاب لکھی جس میں راویوں اور روایت کے منابع کو مشخص کیا۔ علماء نے بغوی کی کتاب سے بڑھ کر اس کتاب کا استقبال کیا۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی ۴۳ شروح لکھی جا چکی ہیں۔ بیضاوی نے بھی اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔

(۲) جامع الاصول فی احادیث الرسول

یہ کتاب ابو السعادات مبارک بن محمد کی تالیف ہے جو ابن اثیر جزری (متوفی ۶۰۶ھ) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ابن اثیر نے احمد بن رزین کی کتاب **التجرید الصحیح للصحاح الستۃ** کی بنیاد پر اپنی کتاب لکھی۔ البتہ فرق یہ ہے کہ انھوں نے صرف صحاح ستہ کی صحیح احادیث پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسری روایات کو بھی لیا۔ کتاب جامع الاصول کے ابواب و روایات کو حروف تہجی کی ترتیب سے تشکیل دیا گیا ہے۔ مؤلف نے ہر روایت کی ابتدا میں اُس کتاب کا حوالہ دیا ہے جس سے اس نے حدیث نقل کی ہے اور آخری راوی کے سوا باقی رواۃ کے نام حذف کر دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں

۱۔ مقدمہ مصابیح السنۃ ج ۱، ص ۱۱۰

انھوں نے روایات کے مشکل الفاظ اور عبارات کی تشریح بھی کی ہے اور کتاب کے آخر میں تمام راویوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے ہیں۔

یہ کتاب چودہ جلدوں میں چھپی ہے اور محققین میں اسے خاصی پذیرائی ملی ہے۔

(٣) المسند الجامع لاحادیث الکتب الستہ و مؤلفات اصحابہا الاخریٰ وموطا مالک ومسانید الحمیدی واحمد بن حنبل و

بشار عواد کی زیر نگرانی مؤلفین کی ایک جماعت کی تالیف کردہ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے صحاح ستہ کی روایات اور مؤلفین صحاح کی کتب احادیث، موطا مالک، مسند حمیدی، مسند احمد بن حنبل مسند عبد بن حمید، سنن دارمی اور صحیح ابن خزیمہ سمیت اکیس کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مؤلفین نے روایات کو صحابہ کی روایات پر مبنی کتب مسند کی طرز پر مدون کیا ہے اور صحابہ سے منقول روایات کی ترتیب وتنظیم میں کتب سنن کے انداز کو اپنایا ہے یعنی روایات کو فقہی ابواب کی بنیاد پر بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں مقطوع، مرسل اور معلق روایات نہیں ہیں۔

اس کتاب کی ١٧٨٠٢ روایات میں سے ١٢٣٧ روایات صحابہ سے منقول ہیں۔

(٤) جامع المسانید والسنن الہادی لاقوم السنن

یہ کتاب اسماعیل بن عمر بن کثیر کی تالیف ہے جو ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ٧٧٤ھ میں وفات پائی۔

ابن کثیر نے اس کتاب میں صحاح ستہ کی روایات کے علاوہ مسند احمد بن حنبل، مسند ابوبکر بزاز مسند ابو یعلی موصلی اور معجم کبیر طبرانی سمیت دس کتابوں کی روایات جمع کی ہیں۔ ابن کثیر نے اپنی کتاب کو مسانید کی طرز پر صحابہ سے منقول روایات کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیا ہے۔ مؤلف کا انداز تحریر یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اس صحابی کی زندگی کا مختصر حال بیان کرتے ہیں اور راویوں کی جرح وتعدیل کے لیے علمائے رجال کے نظریات کی تفصیل لکھتے ہیں۔ اس کے بعد روایات نقل کرتے ہیں۔ مؤلف تمام روایات کو جمع کرنے کی جستجو میں دکھائی دیتے ہیں اسی لیے انھوں نے صرف صحیح احادیث پر اکتفا نہیں کیا اور حسن، ضعیف یہاں تک کہ جعلی روایات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک لاکھ روایات ہیں۔

یہ کتاب اکتیس جلدوں پر مشتمل ہے۔[1] یہ کتاب روایات کی جمع آوری، صحیح روایات کی درجہ بندی کے بیان اور علمائے رجال کی آراء کے تذکرے کے لحاظ سے کامل اور جامع ترین کتاب معلوم ہوتی ہے۔

(۵) جمع الجوامع

یہ کتاب عبدالرحمان بن ابی بکر کی تالیف ہے جو جلال الدین سیوطی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی رحلت کا سال ۹۱۱ھ ہے۔

سیوطی نے اس کتاب میں صحاح ستہ، مسند احمد بن حنبل اور موطا مالک کی روایات کے ساتھ ۷۰ دیگر کتب حدیث کی روایات کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی ضخامت کے لحاظ سے اہل سنت متاخرین کی حدیث کی سب سے بڑی کتاب ہے اسی لیے اسے "جامع کبیر" کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ابن کثیر کی جامع المسانید کی طرح صحیح روایات کے ساتھ ضعیف روایات کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کا ہدف یہ تھا کہ تمام روایات کو جمع کیا جائے۔ مؤلف نے روایات کو سند کے بغیر نقل کیا ہے۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ "اقوال" پر مشتمل ہے جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے احادیث پیغمبر ﷺ کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ "افعال" کا ہے جو روایات صحابہ کی مسانید پر مشتمل ہے۔

پھر سیوطی نے "المختصر الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر" لکھی اور اس میں جامع کبیر کی روایات کی تلخیص و تنقیح کا اقدام کیا اور کوشش کی کہ ضعیف روایات کو الگ کر دیا جائے۔

یہ کتاب ۱۰۰۳۱ روایات پر مشتمل ہے۔

(۶) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال

یہ کتاب علاؤ الدین علی بن حسام کی تالیف ہے جو علی متقی ہندی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا سن وفات ۹۷۵ھ یا ۹۷۷ھ ہے۔

انھوں نے اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

الجامع الصغیر اور زوائد الجامع الصغیر جو کہ جلال الدین سیوطی کی تالیف اور ان کی الجامع الکبیر کے

۱۔ مسند نویسی ص ۴۵۷۔ ۴۶۷

کچھ حصے کی تلخیص ہے اور حروف تہجی کی ترتیب پر لکھی گئی ہیں انتہائی مناسب کتابیں ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کو "منہج العمال فی سنن الاقوال" کے نام سے فقہی ابواب کی ترتیب کو مدنظر رکھ کر جمع کیا ہے اور الجامع الکبیر کے کچھ حصے کو اس میں شامل کر کے اس کا نام **الاکمال لمنہج العمال** رکھا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے ادغام سے تیسری کتاب "غایۃ العمال" کے نام سے منظر عام پر آئی۔

پھر میں نے الجامع الکبیر سے استفادہ کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کے افعال و اقوال کے مجموعے کو شامل کیا اور یوں کتاب کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال منظر عام پر آئی۔

علی متقی ہندی لکھتے ہیں کہ الجامع الصغیر کی کچھ روایات جنھیں سیوطی نے الجامع الکبیر میں شامل نہیں کیا تھا میں نے وہ بھی کنز العمال میں جمع کی ہیں۔[۱]

کنز العمال میں سیوطی کی تین کتابوں یعنی الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور زوائد الجامع الصغیر کی روایات کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے۔

اس کتاب کی اٹھارہ جلدیں ہیں۔

۱۔ کنز العمال ج ۱، ص ۳۔ ۴

علوم حدیث کے ظہور اور تکامل کا دور

اگرچہ موطا مالک، مسند احمد بن حنبل اور صحاح ستہ کی تالیف سے پہلے حدیث کے مختلف علوم یعنی اصطلاحات حدیث، رجال حدیث اور فقہ الحدیث محدود اور بکھرے ہوئے تھے اور بوقت ضرورت اُن سے استفادہ کیا جا سکتا تھا مگر جوامع احادیث کے منظرعام پر آنے کے بعد یہ علوم باقاعدہ منظم شکل میں سامنے آئے اور تیسری صدی سے دسویں صدی تک ان کے ارتقا اور تکامل کا سفر تیزی سے جاری رہا۔

ان علوم کے منظرعام پر آنے کے اسباب جاننے کے لیے ہمیں اس بات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ جوامع احادیث کے دورِ تدوین نے محققین کے لیے تین میدانوں میں تحقیق کو لازمی قرار دیا۔ دراصل جوامع احادیث کے منظرعام پر آنے کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے کہ روایات کی سمجھ بوجھ اور اُن سے مناسب استفادہ کے لیے حسب ذیل امور کی تنقیح ضروری ہے:

(۱) رجالِ حدیث

حدیث کے بعض شواہد بتاتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کی تاکید کے سبب مسلمانوں میں روایات کی اسناد بیان کرنے کا آغاز ہوا[۱] اگرچہ اہل سنت کے کچھ محققین کہتے ہیں کہ چالیس ہجری میں لوگوں نے جعلی حدیثیں گھڑنا شروع کیں تو محدثین نے بطور احتیاط اسناد لکھنا شروع کیں۔[۲]

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو مشائخ حدیث نے بزرگوں کی تقلید کرتے ہوئے خود کو اسنادِ روایات بیان کرنے کا پابند بنایا۔ چنانچہ جب کوئی محدث حدیث بیان کرتا تو اپنے شیخ سے پہلے جتنے بھی راوی

۱۔ کافی ج ۱، ص ۵۲

۲۔ محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ مسلمان احادیث کی سند کے بارے میں استفسار نہیں کرتے تھے مگر جب فتنہ (۴۰ھ میں) رونما ہوا تو اس کے بعد مسلمانوں نے حدیث کی اسناد بیان کرنا شروع کی۔ (لمحات من تاریخ السنۃ المشرفۃ ص ۳۶)

ہوتے اُن سب کا ذکر کرتا اور سلسلۂ روایت کو صحابہ و تابعین تک بیان کرتا تھا۔ چنانچہ راویوں کی کثرت اور اُن میں سے بہت سے راویوں کے ہم عصر نہ ہونے اور بڑی تعداد کا غیر معروف ہونے کی وجہ سے اُن کی شخصیت پر جرح و تعدیل اور چھان بین کو ضروری بنا دیا۔ یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ کتب رجال لکھنے کا سلسلہ مؤلفین صحاح ستہ کے بعد شروع نہیں ہوا بلکہ خود امام بخاری نے اس موضوع پر **الضعفاء الکبیر** اور امام نسائی نے **الضعفاء والمتروکین** نامی کتابیں لکھی تھیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جوامع احادیث کے دور میں بھی علم رجال موجود تھا اور انھوں نے رجال پر کتابیں لکھی تھیں تاکہ آنے والے علماء اس بنیاد پر راویوں اور روایتوں کے بارے میں جرح و تعدیل کر کے فیصلہ کر سکیں۔

اس ضرورت کے سبب علمائے رجال نے علم رجال پر مفصل کتابیں لکھیں جن میں ابو حاتم رازی (متوفی ۲۷۷ھ) کی کتاب **الجرح والتعدیل**، ابن کثیر کی **التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل**، شمس الدین محمد ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی **تذکرۃ الحفاظ** جیسی کتابیں انتہائی اہم ہیں۔

(۲) اصطلاحاتِ حدیث

دور تدوین سے پہلے حدیث کے لیے صحیح، ضعیف، مسند، مرسل اور موضوع جیسی اصطلاحات محدثین میں رائج تھیں البتہ ان اصطلاحات کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کی ضرورت تب محسوس ہوئی جب جوامع احادیث کے مؤلفین نے کچھ اصولوں کی بنیاد پر اپنی بیان کردہ احادیث کو "صحیح یا حسن" قرار دیا اور ہر روایت کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کے متعلق علانیہ یا غیر علانیہ طور پر اپنی رائے دی اور روایات کے مشہور یا شاذ یا غریب یا منکر ... ہونے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تو حسب ذیل امور کی تحقیق ضروری ہوگئی:

(الف) ہر روایت کو سند کے لحاظ سے مشخص کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کی اصطلاحات کو سمجھا جائے مثلاً اگر کوئی محدث یہ لکھے کہ "اس روایت کے اسناد کا پورا سلسلہ ثقہ راویوں پر مشتمل اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ہے۔" اتنے لمبے چوڑے جملے کی بجائے محدث کی سہولت اسی میں ہے کہ وہ یوں لکھے کہ "یہ روایت صحیح ہے۔" چنانچہ اصطلاحاتِ حدیث وہی کردار ادا کرتی ہیں جو سڑک پر لگے ٹریفک کے اشارے ادا کرتے ہیں۔ ان اصطلاحات کے فوائد کی وجہ سے اُن کی اقسام کا مشخص کرنا اور اُن کے مفہوم کو سمجھنا بڑا ضروری ہے۔

(ب) اس بات کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ روایات کو کیسے اخذ کیا گیا ہے سماع کے ذریعے یا قراءت اور مناولہ کے ذریعے۔ چنانچہ بلحاظ اتقان ان الفاظ کے مفہوم میں کافی فرق پایا جاتا ہے اس لیے ان اصطلاحات سے روایات کے درجۂ اعتبار کو معین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(ج) روایت کو قبول یا رد کرنے کے لیے مکمل تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ صورتوں میں محدثین مثلاً احمد بن حنبل کسی روایت کو معتبر کہتے ہیں اور فضائل وسنت کے باب میں ضعف سند کو بھی روایت کے قبول کرنے کے لیے کافی سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اگر کسی روایت کا مضمون دینی اصولوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ اسے قبول کرتے ہیں جبکہ بہت سے محدثین صحتِ سند کے ساتھ صحتِ مضمون پر بھی اصرار کرتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے عوامل جو ایک طرح سے جوامع احادیث سے متاثر ہیں اصطلاحات حدیث کی ایجاد اور اُن کے ارتقا و تکامل میں موثر رہے ہیں۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے یہ کتابیں اہم ہیں:

(۱) حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) کی	**معرفة علوم الحدیث**
(۲) خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی	**الکفایة فی معرفة الروایة**
(۳) عمر بن عثمان بن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ) کی	**مقدمہ ابن صلاح**
(۴) ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) کی	**نخبة الفکر فی مصطلح اهل الاثر**[۱]

(۳) فقہ الحدیث

حدیث کی سند، اصطلاحات اور دوسرے تمام علوم درحقیقت فہم حدیث کے لیے منظرعام پر آئے چنانچہ ہم چھٹے باب میں اس کی تفصیل عرض کریں گے۔ فہم حدیث کو اصطلاح میں "فقہ الحدیث" کہا جاتا ہے۔ یہ موضوع اگرچہ انتہائی اہم ہے لیکن محدثین نے اس پر بہت کم توجہ دی ہے۔ اپنی تمام تر

۱۔ یہ اس فن کی ایک جامع کتاب ہے۔ خود ابن حجر عسقلانی نے **نزهة النظر** کے نام سے اپنی کتاب کی شرح لکھی ہے اور اُن کے بیٹے کمال الدین محمد نے بھی **نتیجة النظر** کے نام سے اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ شیخ ابو امداد قانی نے اس کتاب پر جو حاشیہ لکھا ہے اُس کا نام ہے **قضاالوتر من نزهة النظر**۔ ابن حجر کی **نزهة النظر** کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔
مولوی محمد عبداللہ ٹونکی شریف نے بھی **نخبة الفکر فی مصطلح اهل الاثر** کی شرح لکھی ہے جو کراچی سے شائع ہوئی ہے۔
اس کی ایک شرح مولوی عبدالحق اور مولوی غلام قادر کی تصحیح کے ساتھ ۱۸۶۲ء میں کلکتہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔
(کاظم مدیر شانہ چی، علم الحدیث صفحہ ۱۶۵، مطبوعہ دفتر انتشارات اسلامی، قم) رضوانی

اہمیت کے باوجود اس موضوع کی طرف دورِ تدوین کے بعد علماء کی توجہ مبذول ہوئی اور فہم حدیث کے لیے کچھ علوم سامنے آئے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱۔ ۳) غریب الحدیث

روایات میں جو مشکل الفاظ اور اصطلاحات ہیں اُن کا سمجھنا لغات اور ادبیات کی رائج کتابوں سے ممکن نہیں۔ ان مشکل الفاظ کو اصطلاحی طور پر "غریب الحدیث" کہا جاتا ہے۔[۱] کچھ علمائے حدیث نے ان مشکل الفاظ کی تشریح کی جس کی وجہ سے ایک نیا علم، غریب الحدیث کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ غریب الحدیث کا تعلق اگرچہ فقہ الحدیث سے ہے اس لیے اس پر علم کا اطلاق مجازاً اور متقدمین کی پیروی میں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ علم حدیث کے ہر شعبے پر علم کا اطلاق کرتے ہیں۔

اس موضوع پر اہم کتابیں یہ ہیں:

(۱) احمد بن محمد ہروی (متوفی ۴۰۱ھ) کی **غریب القرآن والحدیث**

(۲) ابن اثیر (متوفی ۶۰۴ھ) کی **النہایہ فی غریب الحدیث والاثر**

(۲۔ ۳) مختلف الحدیث

بہت سی احادیث میں بظاہر تضاد اور تناقض دکھائی دیتا ہے لیکن گہری تحقیق کے بعد وہ تعارض برطرف ہوجاتا ہے۔ اس برطرفی کی دو وجوہات ہیں:

(۱) بیرونی قرائن کی طرح احادیث بھی ایک دوسری پر عمل کرتی ہیں۔ اس صورت میں جمع عرفی کے قوانین (حمل عام بر خاص، حمل مطلق بر مقید ...) کے مطابق اُن کے درمیانی تعلق کو دیکھ کر مقصود متکلم کو سمجھنا چاہیے۔

(۲) کچھ احادیث کی دلالت ظاہری اور کچھ کی باطنی ہوتی ہے۔ اصطلاحی طور پر ان احادیث کی پہلی قسم کو محکم اور دوسری کو متشابہ کہا جاتا ہے۔[۲] اس صورت میں قاعدۂ تاویل اور متشابہ کو محکم پر حمل کرنے کے قانون سے مدد لینی چاہیے۔

۱۔ تدریب الراوی ص ۱۶۳۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۷۵

۲۔ اصول الحدیث و احکامہ کے ص ۹۳

دور تدوین کے بعد روایات میں تناقض نمائی اور جمع عرفی و تاویلی کی راہوں کے سبب بالخصوص علم اصول فقہ کی ترقی کے سبب ایسی کتابوں کے لیے راہ ہموار ہوئی جن میں فقہ الحدیث کے اہم مباحث کو بیان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ابن قتیبہ دینوری (متوفی ۲۷۶ھ) کی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث'' اور ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) کی کتاب ''التحقیق فی احادیث الخلاف'' کو شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔

(۳۔۳) ناسخ و منسوخ حدیث

کسی وسیع زمانے کو محدود کرنا نسخ کہلاتا ہے جو دراصل تخصیص کی ایک صورت ہے۔ اگر ایک عام دلیل جو ظاہراً بہت سے لوگوں اور زمانوں کو شامل کرتی ہو چند لوگوں کے لیے محدود کردی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں تخصیص کی گئی ہے۔ اور اگر زمانے کے اعتبار سے اسے محدود کردیا جائے اور یہ اعلان کردیا جائے کہ اس زمانے سے عمومیت پر دلالت کو لغو کیا جاتا ہے تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس میں نسخ واقع ہوا ہے۔ اس طرح کے معاملات قرآن اور حدیث دونوں میں جاری ہوتے ہیں۔[۱] دوسری طرف کچھ لوگوں کو جوامع احادیث کی روایات سے اشتباہ ہوا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے فتوے کے استناد کے لیے ناسخ روایت کی بجائے منسوخ روایت سے استدلال ہے۔ اسی بات نے علمائے کرام کو مجبور کیا کہ وہ علم الحدیث میں ناسخ اور منسوخ پر خاص توجہ دیں اور اس کو بھی فقہ الحدیث کا ایک شعبہ قرار دے کر تحقیق کریں۔ اس موضوع پر ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی (متوفی ۵۸۴ھ) کی کتاب **الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار** ایک اہم کتاب ہے۔

۱۔ منہج النقد فی علم الحدیث ص ۳۳۵۔۳۳۷

اہل سنت میں علم حدیث کے جمود کا دور

اہل سنت کی تاریخ حدیث میں دسویں صدی سے چودھویں صدی تک کا دور علوم حدیث میں جمود کا دور ہے۔ اس پورے عرصے میں نہ تو کوئی نامور محدث پیدا ہوا اور نہ ہی علم الحدیث کے موضوع پر کوئی اہم کتاب سامنے آئی اس لیے ہم اس دور کو علم الحدیث کے جمود کا دور کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نور الدین عتر لکھتے ہیں:

اس پورے عرصے میں نہ تو علمی مسائل میں کہیں اجتہاد دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی تصانیف میں کوئی جدت نظر آتی ہے۔ اس دور میں صرف یہی کچھ ہوا کہ علوم حدیث پر نثر اور نظم میں کچھ مختصر کتابیں شائع ہوئیں اور لکھنے والوں نے گہری تحقیق اور علمی مباحث کے بجائے خود کو گزشتہ مؤلفین کی لفظی عبارتوں کے مناقشات میں الجھائے رکھا۔[1] ڈاکٹر صاحب نے آخر میں اُس دور کی چند تالیفات کا ذکر کیا ہے۔[2]

ڈاکٹر نور الدین عتر کی طرح محمود سالم عبیدات نے بھی اس دور کو علم الحدیث کے لیے جمود کا دور قرار دیا ہے اور کہا کہ اس پورے عرصے میں کوئی علمی انقلاب دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی قابل توجہ کتب حدیث کا کہیں نام ونشان نظر آتا ہے۔[3]

۱۔ منہج النقد فی علوم الحدیث ص ۶۹

۲۔ ایضاً ص ۶۹ ۔ ۷۰

۳۔ تاریخ الحدیث ومناہج المحدثین ص ۵۷

چوتھا باب

مصطلحات الحدیث

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم مصطلح الحدیث کو "درایۃ الحدیث" اور "اصول حدیث" بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس علم کو مصطلح الحدیث کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حدیث کی اصطلاحات کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے مسائل کا بہت بڑا حصہ اسی علم میں واضح کیا گیا ہے۔ لغت میں علم و آگہی کی ایک خاص قسم کو درایہ کہا جاتا ہے یعنی ایسا علم جس سے پہلے شک وشبہ پایا جاتا ہو۔[۱] یا ایسا علم جو پوری توجہ کے بعد حاصل ہو۔[۲] قرآن کریم میں مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ کی آیت میں بھی لفظ درایہ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی تم نہیں جان سکتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۵۲) چنانچہ اس علم کو "درایۃ الحدیث" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس علم میں صرف نقل حدیث پر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ حدیث کی سند اور اس کے متن کے مقبول یا مردود ہونے کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے۔

ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے یہی لفظ نقل ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: حَدِيْثٌ تَدْرِيْهِ خَيْرٌ مِنْ اَلْفٍ تَرْوِيْهِ ایک حدیث کی مکمل سمجھ بوجھ، ہزار احادیث بیان کرنے سے بہتر ہے۔[۳]

اس عمومی استعمال کے باوجود مؤلف سمجھتا ہے کہ درایۃ الحدیث کی اصطلاح کا تعلق فقہ الحدیث سے ہے۔ اسی طرح مصطلح الحدیث اور اصول الحدیث کی دو اصطلاحات میں سے پہلی اصطلاح زیادہ مشہور ہے اور یہ اصطلاح حدیث کے وسیع مسائل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علم مصطلح الحدیث کی علماء نے یوں تعریف کی ہے:

۱۔ مختصر مقباس الہدایہ ص ۹

۲۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۱۴

۳۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۱۸۴۔ معانی الاخبار ص ۲

شہید ثانی ''مصطلح الحدیث'' کی تعریف میں فرماتے ہیں: العلم الذی یبحث فیہ عن متن الحدیث و سندہ و طرقہ من صحیحھا وسقیمھا و علیلھا و ما یحتاج الیہ لیعرف المقبول منہ من المردود یعنی یہ وہ علم ہے جس میں حدیث کے متن اور صحت و سقم کے لحاظ سے اس کی سند اور طرق کے ساتھ ایسے تمام امور پر بحث کی جاتی ہے جس سے مقبول اور مردود حدیث کی پہچان ہو سکے۔[1]

شیخ بہائی اس علم کی تعریف میں فرماتے ہیں: علم یبحث فیہ عن سند الحدیث و متنہ و کیفیتہ تحملہ و آداب نقلہ یعنی یہ وہ علم ہے جس میں حدیث کی سند، متن، اس کے مضامین کی کیفیت اور اس کے نقل کے آداب کو بیان کیا جاتا ہے۔[2]

علم مصطلح الحدیث میں جن مسائل پر بحث کی جاتی ہے اور اُس کے آغاز سے لے کر آج تک جو منابع مربوط ہیں اُن سب کو مدنظر رکھ کر اس علم کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے: ''مصطلح الحدیث وہ علم ہے جس میں حدیث کی تقسیمات، اصطلاحات اور حدیث کی سند، متن، طرق، شرائط برداشت اور روایات کی نقل اور قبولیت کی شرائط پر گفتگو کی جائے۔

مصطلح الحدیث کا موضوع، فائدہ اور مسائل

علم مصطلح الحدیث کا موضوع '' سند اور متن حدیث ہے۔''[3] کچھ علماء فرماتے ہیں کہ اس کا موضوع راوی اور روایت ہے لیکن چونکہ خبر آحاد پر بحث، علم رجال کا موضوع ہے اس لیے یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔[4] اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے انسان اُن اصطلاحات سے واقف ہو جاتا ہے جو محدثین نے وضع کی ہیں اور اس علم کے ذریعے مقبول یا مردود روایات کو پہچان سکتا ہے۔[5]

جب ہر علم کے مسائل کو اُس کے موضوع پر طاری ہونے والی حالتیں سمجھا گیا ہے تو مصطلح الحدیث کے مسائل بھی اس کی کچھ حالتیں ہیں مثلاً صحت، حسن اور ضعف وغیرہ جو کہ سند پر طاری ہوتے ہیں یا پھر اجمال، تبیین، محکم اور متشابہ جیسی حالتیں ہیں جو متن حدیث پر طاری ہوتی ہیں۔[6]

۱۔ النہایہ فی شرح البدایہ ص ۴۵

۲۔ الوجیزۃ فی علم الدرایہ ص ۶

۳ و ۴۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۴۴۔ ۴۵

۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۴۵۔ تدریب الراوی ص ۲۲

۶۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۱۵ و ۱۷

سیوطی نے حازمی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ علم حدیث میں علوم کی بہت سی انواع شامل ہیں جن کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے اور ہر نوع اپنے مقام پر ایک مستقل علم ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی پوری زندگی بھی ان کے حصول میں گزار دے تب بھی وہ انھیں پورے طور پر حاصل نہیں کر سکے گا۔[۱]

حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب میں علم الحدیث کی ۵۲ قسمیں اور ابن صلاح نے اپنے مقدمے میں اس کی ۶۵ قسمیں بتائی ہیں۔ پھر آخر میں انھوں نے لکھا کہ اس کی لاتعداد قسمیں شمار کی جا سکتی ہیں۔ سیوطی نے تدریب الراوی میں علم مصطلح الحدیث کی ۶۵ انواع بیان کی ہیں۔[۲]

متقدمین مصطلح الحدیث کی سو شاخیں بیان کرتے رہے ہیں۔ اصل میں ان بزرگوں نے ہر بحث کو ایک علاحدہ علم شمار کیا ہے۔

علم مصطلح الحدیث کے وہ مباحث جنھیں متقدمین نے الگ الگ نوع قرار دیا ہے اور اُن کی سیکڑوں انواع بیان کی ہیں، بنیادی طور پر انھیں حسب ذیل چار اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) تقسیمات خبر۔ اس میں خبر (روایت) کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پھر آحاد کو صحیح اور ضعیف وغیرہ میں تقسیم کر کے ان پر بحث کی جاتی ہے۔

(۲) اصطلاحات۔ اس میں سند اور متن پر بحث کی جاتی ہے۔

(۳) حدیث کے شرائط اور تحمل حدیث کے طرق۔

(۴) نقل روایت اور اُس کی قبولیت کی شرائط۔

ہر روایت اپنے صدور کے زمانے سے لے کر ہمارے پاس پہنچنے تک تین مراحل یعنی تحمل، نقل اور قبولیت یا رد سے گزرتی ہے۔ اس علم میں ان تینوں مراحل کی شرائط پر گفتگو کی جاتی ہے۔

مصطلح الحدیث کے مباحث پر مشتمل اس باب میں — مقدماتی مباحث کے علاوہ — انہی چار اقسام کی بنیاد پر بحث کی گئی ہے۔

۱۔ تدریب الراوی ص ۳۳

۲۔ اصول الحدیث ص ۲۰

تقسیمات خبر

حدیث کو بنیادی طور پر متواتر اور خبر واحد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ حدیث کی متواتر اور غیر متواتر میں تقسیم صرف علم الحدیث سے مخصوص نہیں ہے۔ اہل منطق بھی قیاس کے مواد کو آٹھ اقسام میں تقسیم کرنے اور یقینیات کو اس میں شامل کرنے کے بعد یقینیات کی ایک قسم کو متواترات کہتے ہیں اور متواتر کی وہی تعریف کرتے ہیں جو علم حدیث میں رائج ہے۔[1]

روایت کو ایک کلی تقسیم کے تحت راویوں کی تعداد کو مدنظر رکھ کر دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کو متواتر اور دوسری کو خبر واحد کہا جاتا ہے۔ متواتر کی بذات خود کئی اقسام ہیں مثلاً متواتر لفظی، متواتر معنوی اور متواتر اجمالی... متواتر روایات کی تعداد بہت کم ہے جبکہ جوامع احادیث میں پائی جانے والی زیادہ تر روایات اخبار آحاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیمات کی زیادہ بحث کا تعلق خبر واحد سے ہے اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

خبر متواتر

لفظ متواتر ''تواتر'' سے مشتق ہے جو کسی چیز کے مسلسل اور لگاتار نازل ہونے کا معانی دیتا ہے البتہ نزول میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ بلا فاصلہ ہو یا فاصلے کے ساتھ ہو۔ اگرچہ یہ لفظ عام طور پر پہلے معانی میں ہی استعمال ہوتا ہے یعنی بغیر فاصلہ کے نازل ہونے کے معانی میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا پھر ہم نے یکے بعد دیگرے مسلسل پیغمبر بھیجے۔ جب بھی کسی امت کے پاس اُس کا پیغمبر آتا تو وہ اُس کی تکذیب کرتی تو ہم بھی ایک کے بعد دوسری کو ہلاک کرتے رہے۔ (سورۂ مومنون: آیت ۴۴)

۱۔ المنطق ص ۲۸۶

لفظ ''تترا''، ''دعویٰ'' کی طرح مصدر ہے اور اس کے معانی ہیں پے در پے اور مسلسل آنا۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر اُس کی طرف سے پے در پے اور کسی زمانی فاصلے کے بغیر آتے رہے۔[۱] اصطلاح میں حدیث متواتر اُس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے ہر دور میں اتنے راوی ہوں کہ عام طور پر اُن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔[۲]

شیعہ اور سنی محققین حدیث عام طور سے کہتے ہیں کہ خبر متواتر کے لیے راویوں کی کسی خاص تعداد کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ تواتر صادق آنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ہر طبقے میں اس کے اتنے راوی ہوں جن کا جھوٹ پر اتفاق عام طور سے محال سمجھا جاتا ہو۔

شہید ثانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

صحیح ترین قول کے مطابق راویوں کی تعداد کسی خاص عدد میں منحصر نہیں بلکہ جو چیز معتبر ہے وہ یہ ہے کہ اتنی تعداد میں راوی ہوں جن کی وجہ سے متواتر کی شرط ثابت ہو جائے (یعنی اُن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو)۔ کبھی یہ شرط دس یا اس سے بھی کم راویوں سے پوری ہو جاتی ہے اور کبھی ایک سو راویوں سے بھی یہ شرط پوری نہیں ہوتی۔ اس مسئلے کا تعلق راویوں کے سچ اور جھوٹ کے میزان سے ہے۔[۳]

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

صحیح نظریے کے مطابق راویوں کی تعداد معین کرنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔[۴] اس نظریے کے برعکس کچھ محققین حدیث نے خبر متواتر کے لیے راویوں کی تعداد کو بھی متعین کیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ ہر طبقے میں چار راویوں کا ہونا ضروری ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ خبر متواتر کے لیے ہر طبقے میں بارہ راوی ہونے چاہئیں۔ کچھ نے یہ تعداد بیس لکھی ہے...

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۸۷۔ ۸۹۔ اصول الحدیث واحکامہ ص ۲۳۔ ۲۴

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۸۹۔ ۹۰

۳۔ البدایہ فی علم الدرایہ ص ۱۳

۴۔ علوم الحدیث ومصطلحہ ص ۱۴۸ بحوالہ نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر ص ۳

حدیث میں تواتر ثابت ہونے کی شرائط

(۱) خبر دینے والوں نے اپنے حواس سے خبر کا ادراک کیا ہو

اس سے مراد یہ ہے کہ خبر دینے والوں نے واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ خبر دینے والے خود تو اس وقت موجود نہ ہوں اور دوسروں کے بیانات سننے کے بعد اندازے اور ظن وتخمین عقلی کے ذریعے کسی واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی خبر دیں مثلاً زید قتل ہوگیا۔ اب جن لوگوں نے اس واقعے کو بچشم خود دیکھا ہو اُن کی خبر، خبر متواتر ہے لیکن اگر کچھ لوگ زید کے گھر پر لوگوں کی بھیڑ یا کچھ دیگر علامات دیکھ کر زید کے قتل کی خبر دیں تو اُن کی خبر، خبر متواتر نہیں ہے ہر چند ممکن ہے کہ قرائن کا مجموعہ خود اُس خبر دینے والے کے لیے حد تواتر اور مفید علم ہو مگر چونکہ اُس کی خبر ''حدس'' یعنی اندازے پر مبنی ہے اور ''حس'' یعنی مشاہدے سے خالی ہے اس لیے وہ مفید تواتر نہیں ہوگی۔

(۲) تمام طبقات میں تواتر موجود ہو

خبر متواتر کے لیے ضروری ہے کہ ہر طبقے میں اُس کے راوی حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہوں لہٰذا اگر پہلے طبقے میں راویوں کی تعداد حد متواتر کے مطابق ہو مگر درمیانے یا آخری طبقے میں ایسا نہ ہو تو اسے خبر متواتر نہیں کہا جائے گا البتہ کسی ایک طبقے میں تواتر نہ ہونے کے باوجود اگر قرائن موجود ہوں تو وہ خبر مفید علم ضرور ہوگی۔

مندرجہ بالا شرائط کے علاوہ بھی کچھ شرائط مثلاً اُن راویوں کی خبر کا استناد علم پر ہو، راویوں کے نسب جدا جدا ہوں وغیرہ جیسی شرائط بھی محدثین نے بیان کی ہیں۔[1]

خبر متواتر کب مفید علم ہوتی ہے

خبر متواتر اگر چہ فی حد ذاتہ اور فی نفسہٖ مفید علم ہوتی ہے مگر تمام سننے والوں کے لیے اُس وقت مفید علم ہوتی ہے جب اس میں مندرجہ ذیل دو شرائط موجود ہوں:

(۱) سننے والا خبر کے مضمون سے ناواقف ہو کیونکہ اگر سننے والا پہلے سے ہی اس خبر کے مضمون سے

[1] مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۱۰۳ ـ ۱۱۱

واقف ہوتو پھر سنائی جانے والی خبر یا تو اُس کا وہی علم ہے جو پہلے سے مشاہدے کے ذریعے اُس کے پاس موجود ہے یا اس کی مثل ہے۔ پہلی صورت میں یہ خبر تحصیل حاصل ہوگی اور دوسری صورت میں خبر اجتماع مثلین (ایک جیسی دو چیزوں کا جمع ہونا) قرار پائے گی اور یہ دونوں محال ہیں۔

(۲) سامع شبہ یا تقلید سے آزاد ہو یعنی خبر متواتر کسی کے لیے اُس وقت مفید ہوگی جبکہ اُس کا سامع پہلے سے اس کے مضمون کے بارے میں شبہ یا تقلید سے آزاد ہوگا۔ اگر سامع کا ذہن پہلے سے شبہ یا تقلید کی طرف مائل ہوتو اس صورت میں بھی خبر متواتر مفید علم نہیں ہوتی مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے معجزات دکھائے تھے۔ ان معجزات کا ظہور متواترات میں سے ہے مگر غیر مسلم انھیں تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح ائمہ طاہرینؑ کی امامت پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نص فرمائی اور آپ کی یہ نصوص خبر متواتر کا درجہ رکھتی ہیں مگر اہل سنت ان کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی متواتر خبر اُن کے لیے مفید علم نہیں ہے بلکہ شبہ یا اپنے بزرگوں کی تقلید اُن کے ماننے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔[۱]

متواتر کی اقسام

متواتر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) متواتر لفظی

(۲) متواتر معنوی

(۱) متواتر لفظی

جب تمام طبقات کے راویوں نے ایک جیسے لفظوں اور جملوں میں روایت کو بیان کیا ہوتو اسے متواتر لفظی کہا جاتا ہے مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ یعنی جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ تراشے اسے اپنا ٹھکانا دوزخ میں سمجھ لینا چاہیے۔[۲]

شہید ثانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو انہی الفاظ کے ساتھ صحابہ کرام کی بڑی تعداد نے روایت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے چالیس یا ساٹھ سے زیادہ صحابہ نے نقل کیا ہے۔[۳]

۱۔ معالم الدین و ملاذ المجتہدین ص ۱۸۵ - ۱۸۶

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ ج ۴، ص ۳۶۴۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۷۸

۳۔ اصول الحدیث ص ۷۹

اسی طرح **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** اور **انی تارک فیکم الثقلین** کی احادیث کو بھی متواتر لفظی کے لیے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۲) متواتر معنوی

بہت سی متواتر روایات ایسی ہیں جن کے الفاظ یکساں نہیں ہیں اور ایک ہی مطلب کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے لیکن جب ہم ان کے تضمنی اور التزامی مفہوم کو دیکھتے ہیں تو سب کا مفہوم اور مدلول مشترک ہوتا ہے۔ ایسی روایات معانی میں متواتر ہوتی ہیں الفاظ میں نہیں اسی لیے ان کو متواتر معنوی کہا جاتا ہے مثلاً امام مہدیؑ کے ظہور کی روایات کا تعلق بھی اسی قسم سے ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت طاہرینؑ سے دسیوں روایات منقول ہیں جن میں امام مہدیؑ کے ظہور سے پہلے اور ظہور کے بعد کے حالات بتائے گئے ہیں جن کے مشترک اور متواتر مفہوم سے آپ کے ظہور کا قطعی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان پیشین گوئیوں میں مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، آسمان پر دھواں چھا جانا، دابۃ الارض کا نکلنا اور اسی طرح کچھ اجتماعی حوادث کا ظاہر ہونا جیسے پوری زمین پر ظلم و جور کا عام ہونا اور برائی و بے حیائی کا بے لگام ہونا، دجال کا خروج اور سفیانی کی سرکشی کی طرف متواتر معنوی کی صورت میں اشارے کیے گئے ہیں۔[۱] جب ہم متواتر روایات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ تر روایات متواتر معنوی کی صورت میں ہیں کیونکہ معصومینؑ نے مختلف اوقات میں مختلف الفاظ میں مطالب کو بیان کیا تھا۔ علاوہ ازیں لوگوں میں نقل بالمعنی کا رجحان بھی تواتر معنوی کا سبب بنا اور کچھ راویوں کی یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے متواتر لفظی کو نقصان پہنچا اور اُس کی جگہ متواتر معنوی نے لے لی۔[۲]

خبر واحد

ہر وہ روایت جس پر متواتر کی تعریف صادق نہ آئے اور اس میں متواتر کی شرائط موجود نہ ہوں اسے ''خبر واحد'' کہا جاتا ہے۔ واضح لفظوں میں ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ وہ روایات جن کے تمام یا بعض طبقات میں اتنے راوی موجود نہ ہوں جن کے جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو وہ اخبار احاد

۱۔ شیخ طوسی، الغیبۃ۔ علی کورانی، معجم احادیث المہدی۔ بحار الانوار ج ۵۱ ۔ ۵۲

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۱۱۵ ۔ ۱۱۷

کہلاتی ہیں۔ اس طرح کی روایت ذاتی طور پر مفید علم نہیں ہوتی۔ جس طرح خبر متواتر میں راویوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں اسی طرح خبر واحد کے راویوں کی تعداد بھی مقرر نہیں ہوتی اس لیے ممکن ہے کہ کسی روایت کا ایک ہی راوی ہو اور وہ خبر واحد کہلائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی روایت کے دس راوی ہوں اور تمام طبقات میں اتنی تعداد موجود ہو مگر راویوں کے ضعیف اور نا قابل اعتبار ہونے کی وجہ سے وہ بھی خبر واحد شمار ہوگی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ معصومینؑ سے پہنچنے والی پچانوے فیصد روایات کا تعلق اخبار احاد سے ہے۔ اسی لیے خبر واحد کی حجیت کی شناخت اور اس کی تقسیمات کا جاننا بڑا مفید اور ضروری ہے۔[۱]

حدیث کی چہارگانہ تقسیم

متقدمین حدیث کے ساتھ قرائن کے استناد کی صورت میں روایات کو صحیح اور ضعیف یا مقبول اور مردود میں تقسیم کرتے تھے مگر علامہ حسن بن مطہر حلی (متوفی ۶۷۷ھ) یا سید ابن طاؤس (متوفی ۶۷۳ھ) — جو علمائے متاخرین میں سے تھے — نے احادیث کو ''صحیح، حسن، موثق اور ضعیف'' کے نام سے چار قسموں میں تقسیم کیا۔[۲]

اس سلسلے میں شیخ بہاؤ الدین عاملی تحریر کرتے ہیں کہ متقدمین کی اصطلاح میں حدیث کی مذکورہ چار قسمیں رائج نہیں تھیں — جیسا کہ اُن کے اقوال کی تحقیق سے واضح ہے — متقدمین کا دستور تھا کہ وہ اُس حدیث کو صحیح کا درجہ دیتے تھے جو اُن کی نظر میں قابل اعتماد ہوتی تھی یا ایسے قرائن کے ساتھ ہوتی تھی جن کی بنیاد پر وہ اُن کے لیے باعث اعتماد و اطمینان ہوتی تھی۔[۳]

متقدمین زیادہ تر روایات کے متن پر توجہ دیا کرتے تھے اور اگر متن کتاب و سنت اور عقل ... کے مطابق ہوتا تو وہ اُن کو صحیح قرار دیتے تھے اگرچہ روایات کی سند میں ضعف ہو اور اگر کوئی روایت اُن قرائن سے خالی ہوتی تو وہ اسے ضعیف اور نا قابل قبول قرار دیتے تھے۔

لیکن متاخرین کے دور میں یہ سارے قرائن یا اُن میں سے کچھ قرائن باقی نہ رہے تو انھوں نے متن کی بجائے سند روایات پر توجہ دینی شروع کی اور یہ دیکھنے لگے کہ راوی کو عادل، ثقہ اور امامی المذہب

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۱۲۵

۲۔ ایضاً ص ۱۳۷ ۔ ۱۳۸

۳۔ مشرق الشمسین ص ۳

ہونا چاہیے۔ چنانچہ روایات کی بنیادی تقسیم اور اصطلاحی طور پر روایات کی یہی چار قسمیں رائج ہیں اس لیے ہم ان میں سے ہر ایک کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

(۱) صحیح

اُس روایت کو صحیح کہا جاتا ہے جس کی سند تمام طبقات میں عادل اور امامی راویوں کے ذریعے معصوم سے متصل ہو۔[۱] یہ تعریف شیعہ محدثین کے نزدیک قابل قبول تعریف ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) معصوم سے نقل کی گئی ہو۔ اگر کسی روایت کے تمام طبقات کے راوی عادل اور امامی ہوں مگر روایت معصوم کی بجائے غیر معصوم مثلاً کسی صحابی سے منقول ہو تو اصطلاحی طور پر اسے ''صحیح'' نہیں کہا جائے گا۔

(۲) تمام طبقات کے راویوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل اور امامی ہوں۔ اگر سلسلۂ اسناد کی ایک کڑی بھی غائب ہو تو اُس روایت کو صحیح نہیں کہا جائے گا۔

اہل سنت محدثین کے ہاں ''صحیح'' کی تعریف

اہل سنت محدثین کی نظر میں صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند عادل اور ضابط راویوں کے توسط سے متصل ہو اور شذوذ وعلت سے پاک ہو۔[۲]

محدثین اہل سنت نے صحیح حدیث کی جو تعریف کی ہے اس میں تین شرائط وجودی اور دو شرائط عدمی ہیں۔ وجودی شرائط یہ ہیں: (۱) سند کا اتصال (۲) راویوں کی عدالت (۳) راویوں کا ضابط ہونا

اور عدمی شرائط یہ ہیں: (۱) روایت شاذ نہ ہو۔ (۲) روایت میں علت نہ ہو۔

''شاذ'' اُس روایت کو کہتے ہیں جو صرف ایک عادل راوی نے بیان کی ہو اور وہ مشہور نہ ہو۔ شاذ، مشہور کی ضد ہے۔ ''علت'' سے مراد ایسی آفت ہے جو حدیث کی صحت کے لیے نقصان کا باعث بنے مثلاً مرسل ہونا یا راوی کا وہمی ہونا وغیرہ۔ کسی راوی کے متعلق وہم میں مبتلا ہونے کی بات بڑی پیچیدہ

۱۔ الدرایہ فی علم الدرایہ ص ۱۹۔ الوجیزۃ فی علم الدرایہ ص ۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۱۳۵۔ ۱۳۶

۲۔ نخبۃ الفکر ص ۱۲۔ فتح المغیث ج ۱، ص ۱۸۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۴۳

ہے کیونکہ وہم عام طور سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ صرف حدیث شناس ہی اسے پہچان سکتے ہیں اگرچہ ایسی روایت ظاہراً صحیح دکھائی دیتی ہے۔

(۲) حسن

''حسن'' اُس روایت کو کہا جاتا ہے جس میں ایک شرط کے سوا صحیح راویت کی تمام شرائط موجود ہوں اور یہ کہ سلسلۂ رواۃ میں سے ایک یا ایک سے زیادہ راوی ایسے ہوں جن کی عدالت کی کتب رجال میں توثیق نہ ہوئی ہو اور علمائے رجال نے صرف اُن کی تعریف وتوصیف پر اکتفا کی ہو۔[۱]

زیادہ واضح الفاظ میں وہ روایت حسن ہے جس کی سند عادل امامی راویوں میں سے ایک یا چند ایک جن کی عدالت کے بارے میں تصریح نہ کی گئی ہو معصوم سے متصل ہو۔

مثال کے طور پر وہ روایت جس کے سلسلۂ سند میں ابراہیم بن ہاشم کا نام آتا ہے عام طور پر محدثین کے نزدیک حسن ہے کیونکہ ابراہیم بن ہاشم مشہور اور جانا پہچانا نام ہے مگر کتب رجال میں اُس کی عدالت کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف اُس کی مدح وتعریف پر اکتفا کیا گیا ہے۔[۲]

اہل سنت محدثین کے ہاں ''حسن'' کی تعریف

امام ترمذی سے پہلے اہل سنت محدثین حدیث کو صحیح اور ضعیف کی دو اقسام میں تقسیم کیا کرتے تھے لیکن امام ترمذی نے حدیثِ حسن کی اصطلاح تجویز کی اور حسن سے مراد وہ حدیث ہے جو صحیح اور ضعیف کے درمیانی درجے پر ہو۔ ترمذی کی اس تجویز کو باقی محدثین نے بھی قبول کیا اور اُس دن سے آج تک اہل سنت محدثین حدیث کو صحیح، حسن اور ضعیف میں تقسیم کرتے ہیں۔[۳]

اہل سنت کے ہاں حسن سے مراد وہ روایت ہے جس کی سند عادل خفیف الضبط طریق سے متصل ہو اور شذوذ اور علت سے پاک ہو۔ ''خفیف الضبط'' لفظ ''تمام الضبط'' کی ضد ہے اور اس سے مراد وہ راوی ہے جس کے ضبط میں ذرا سے خلل نے راہ پائی ہو البتہ وہ مکمل طور پر غیر ضابط نہ ہو۔[۴]

۱۔ الوجیزۃ فی علم الدرایہ ص ۵۔ الہدایہ فی علم الدرایہ ص ۲۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۱۶۰ ۔ ۱۶۱

۲۔ فہرست شیخ طوسی ص ۳۶۔ خلاصۃ الاقوال ص ۴۹

۳۔ علوم الحدیث ومصطلحہ ص ۱۵۸

۴۔ مقدمہ ابن صلاح (علوم الحدیث) ص ۳۱۔ ۳۲۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۲۶ ۔ ۱۲۹

(۳) مُوَثَّق

مؤثق سے مراد وہ روایت ہے جس کے راوی تمام طبقات میں عادل اور ثقہ ہوں اور اس کی سند معصوم سے متصل ہو لیکن اس کا ایک یا چند راوی غیر امامی ہوں[۱] درحقیقت اس طرح کی حدیث کے غیر امامی راوی اخلاقی عیب و نقص سے تو پاک ہوتے ہیں مگر فاسد العقیدہ ہوتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے ایسی تمام روایات جن کے راوی اہل سنت یا غیر امامی شیعہ ہوں، اُس حدیث کو مؤثق کہا جائے گا۔

(۴) ضعیف

وہ حدیث ضعیف کہلاتی ہے جس میں حدیثِ صحیح، حدیثِ حسن اور حدیثِ مؤثق کی شرائط موجود نہ ہوں۔[۲] بالفاظ دیگر ہر وہ روایت جس کی سند متصل نہ ہو یا اس کے راویوں میں عدالت یا ثقاہت نہ پائی جاتی ہو وہ روایت ''ضعیف'' ہے۔ اس سے اہل سنت محدثین کے نزدیک ''ضعیف'' کا معیار بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جن روایات کی سند متصل نہ ہو یا جن کے راوی عادل نہ ہوں یا جن روایات کے متن میں شذوذ یا علت ہو وہ روایات ضعیف ہیں۔[۳]

۱۔ البدایہ فی علم الدرایہ ص ۲۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۱۶۸

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۱۷۷ ۔ ۱۷۸

۳۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۴۱۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۴۴ ۔ ۱۴۵

اصطلاحاتِ حدیث

گزشتہ مباحث میں ہم نے احادیث کی پہلی چار قسمیں اور چند ضروری اصطلاحات بیان کیں۔ ان کے علاوہ ساٹھ دوسری اصطلاحات ہیں جو احادیث کا تعارف کراتی ہیں اور یہ اصطلاحات کتب حدیث میں رائج ہیں۔ علم الحدیث کی کتابوں میں سب سے پہلے ہماری بیان کردہ چار اقسام میں مشترک اصطلاحات کو بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد صرف ضعیف حدیث کی اصطلاحات بیان کی جاتی ہیں۔ بعنوان مثال وہ کہتے ہیں کہ مشہور، غریب، مصحف، مزید، مختلف، محکم، متشابہ، نص، ظاہر، مجمل اور مبین ... جیسی اصطلاحات مذکورہ چار اقسام (صحیح، حسن، موثق اور ضعیف) میں مشترک ہیں اور اس کے برعکس موقوف، مقطوع، مرسل، مضطرب، مدلّس، مقلوب اور مجہول جیسی اصطلاحات حدیث ضعیف سے مخصوص ہیں۔[1]

اس تقسیم بندی پر کچھ اشکالات کی وجہ سے ہم ان کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) سند سے متعلق اصطلاحات

(۲) متن سے متعلق اصطلاحات

(۳) سند اور متن دونوں سے متعلق اصطلاحات

اس تقسیم بندی کی وجہ سے ان اصطلاحات کا سمجھنا اور یاد رکھنا آسان ہو جائے گا۔

ذیل میں ان اصطلاحات کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے:

﴿۱﴾ سند سے متعلق اصطلاحات

سند کی اصطلاحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات کے چار محور ہیں: اتصال سند، انقطاع، حصول اور نقل روایت کی کیفیت اور منابع رجال میں سند کی اصطلاحات

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۰۱ ـ ۲۰۲۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۶۵

(۱-۱) اتصال سند سے متعلق اصطلاحات

(۱) **مسند:** مسند وہ روایت ہے جس کا سلسلۂ اسناد تمام طبقات میں معصوم تک متصل ہو۔[۱] چونکہ اہل سنت صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معصوم مانتے ہیں اس لیے اُن کے مطابق مسند وہ روایت ہے جس کی سند پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہو مگر شیعہ محدثین تمام ائمہ طاہرینؑ کو معصوم مانتے ہیں اس لیے اُن کے مطابق مسند وہ روایت ہے جس کا سلسلہ کسی امام معصوم تک متصل ہو۔

مسند کی اصطلاح میں راویوں کے اخلاق اور عقیدے کے متعلق کچھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ بعض اوقات مسند سے روایات کا وہ مجموعہ مراد ہوتا ہے جو صحابہ کی ترتیب اور اُن سے منقول روایات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہو جیسے مسند احمد بن حنبل۔

(۲) **متصل:** اُس روایت کو متصل کہا جاتا ہے جس کے تمام طبقات میں اتصال موجود ہو البتہ مسند اور متصل میں فرق یہ ہے کہ متصل میں معصوم تک اتصال ضروری نہیں اور اس کی سند موقوف صورت میں غیر معصوم پر بھی منتہی ہو سکتی ہے۔ حدیث متصل کو ''موصول'' بھی کہا جاتا ہے۔[۲]

(۳) **عالی و نازل:** عالی السند وہ روایت ہے جس کی سند اتصال کے ساتھ کم راویوں کے ذریعے معصوم سے متصل ہو اور نازل اُس کی ضد ہے یعنی اس میں راوی زیادہ ہوتے ہیں۔[۳]

(۴) **مضمر:** اُس روایت کو مضمر کہا جاتا ہے جس کی سند کے آخر میں امام معصوم کے نام کی بجائے ضمیر غائب آئی ہو۔ اس کی دو ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ راوی کو امام معین کرنے میں اشتباہ ہوا ہو یا پھر تقیہ کی وجہ سے اُس نے امام کا نام نہ لیا ہو۔[۴]

(۵) **مفرد:** اُس حدیث کو مفرد کہا جاتا ہے جو صرف ایک راوی یا ایک فرقے یا ایک خاص شہر سے نقل کی گئی ہو مثلاً نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ ہم گروہ انبیاء اپنی میراث میں کچھ نہیں چھوڑتے۔ ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس روایت کو حضرت ابوبکرؓ نے دختر رسولؐ حضرت فاطمہ زہراؑ کے مطالبۂ میراث کے جواب میں پیش کیا تھا۔ یہ روایت صرف حضرت ابوبکرؓ نے

۱۔ مقباس الهدایہ ج ۱، ص ۲۰۲ ـ ۲۰۳۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۴۷

۲۔ مقباس الهدایہ ج ۱، ص ۲۰۶۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۴۴

۳۔ الرواشح السماویہ ص ۱۳۶۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۵۵

۴۔ مقباس الهدایہ ج ۱، ص ۳۳۲

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے۔ اُن کے سوا کسی اور نے اس روایت کو بیان نہیں کیا ہے۔ ایسی روایت کو "مفرد" کہا جاتا ہے۔[۱]

(۶) **موقوف:** وہ روایت جس کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام کے کسی صحابی پر ختم ہو وہ موقوف کہلاتی ہے۔[۲] اہل سنت تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں اس لیے اُن کی نظر میں موقوف روایت بہت سارے موارد میں حجت ہے جبکہ شیعی محدثین موقوف روایت کو صرف اُس صورت میں حجت سمجھتے ہیں جب قرائن کے ذریعے معلوم ہو کہ یہ روایت معصوم سے نقل ہوئی ہے ورنہ وہ اسے حجت نہیں مانتے۔

(۷) **مقطوع:** جس روایت کی سند کسی تابعی پر منتہی ہو اُس روایت کو مقطوع کہا جاتا ہے۔[۳] یہ اصطلاح زیادہ تر اہل سنت میں رائج ہے۔[۴] حدیثِ مقطوع، حدیثِ موقوف کی طرح شیعہ محدثین کی نظر میں حجت نہیں ہے۔

(۸) **مشہور:** جو روایت بہت زیادہ نقل ہوئی ہو خواہ اُس کے مقابلے میں کوئی شاذ روایت ہو یا نہ ہو وہ مشہور کہلاتی ہے۔ کسی روایت کا مشہور ہونا اُس کی سند کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں۔[۵] مشہور کی اصطلاح اسلامی علوم کے مختلف شعبوں مثلاً فقہ، تاریخ اور حدیث میں بہت زیادہ توجہ کی حامل رہی ہیں۔

(۹) **مستفیض:** یہ "فاض الماء" سے مشتق ہے اور اس کے معانی ہیں کہ پانی چڑھ گیا۔ محدثین اُس روایت کو مستفیض کہتے ہیں جس کے ہر طبقے میں زیادہ راوی ہوں۔ زیادہ تر محدثین نے کہا ہے کہ وہ حدیث مستفیض ہے جس کے ہر طبقے میں تین سے زیادہ راوی ہوں۔[۶]

(۱۰) **عزیز:** وہ روایت عزیز کہلاتی ہے جس کے دو راوی اور دو طرق ہوں۔ شاید اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایسی روایات بہت کم ہوتی ہیں یا یہ کہ شاید اس وجہ سے کہ وہ دوسرے طریق سے وارد ہوئی ہے جو کہ قوی ہے۔ اسی لیے اسے عزیز کہا گیا ہے۔[۷] اس اصطلاح کا چنداں رواج نہیں ہے۔

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۱۸

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۲۱ ۔ ۳۲۲۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۰

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۳۰

۴۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۴۷۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۵۹

۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۵۴۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۶۵

۶۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۹۔ البدایہ فی علم الدرایہ ص ۱۶

۷۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۷۰

(۱۱) **شاذ یا نادر:** اُس روایت کو شاذ یا نادر کہا جاتا ہے جس کی صرف ایک ہی سند ہو اور اُس کے راوی ثقہ ہوں مگر وہ ایسی روایت کی مخالف ہو جسے ایک گروہ (مشہور) نے نقل کیا ہو مثلاً **واللہ ما نقص من شہر رمضان** خدا کی قسم! ماہِ رمضان کبھی بھی تیس دن سے کم (یعنی ۲۹ دن کا) نہیں ہوتا۔ یہ روایت شاذ ہے۔[1] شاذ کی اصطلاح ایک حد تک رائج ہے۔

(۱۲) **منکر یا مردود:** وہ روایت جس کی سند صرف ایک ہو اور اُس کا راوی غیر ثقہ ہو نیز وہ روایت گروہ یعنی مشہور کی نقل کردہ روایت کے مخالف ہو اسے منکر یا مردود کہتے ہیں۔[2] شاذ اور منکر روایت میں فرق یہ ہے کہ منکر روایت کے برعکس شاذ روایت کے راوی ثقہ ہوتے ہیں۔ منکر کی اصطلاح مروج ہے۔

(۲۔۱) انقطاعِ سند سے متعلق اصطلاحات

سند کا سلسلہ ابتدا میں بھی منقطع ہو سکتا ہے، درمیان میں بھی اور آخر میں بھی منقطع ہو سکتا ہے۔ اس میں سے ایک یا ایک سے زیادہ راوی حذف ہوتے ہیں۔ سند کے منقطع ہونے کی ہر قسم کے لیے مخصوص اصطلاحات مقرر ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) **مُعلق:** جس حدیث کی سند کی ابتدا میں ایک یا زیادہ واسطے مسلسل حذف ہوں اور بعد کے راویوں کی طرف حدیث کا استناد کیا گیا ہو اسے حدیثِ معلق کہا جاتا ہے۔[3] چنانچہ من لا یحضرہ الفقیہ نیز تہذیب الاحکام اور الاستبصار کی بیشتر احادیث معلق ہیں یعنی شیخ صدوق اور شیخ طوسی نے ابتدائی راویوں کو حذف کیا ہے اور روایت کو آخری راوی کے نام سے امام سے نقل کیا ہے۔

(۲) **منقطع:** وہ حدیث جو کسی بھی صورت میں معصوم سے متصل نہ ہو اور سند کے آغاز یا درمیان یا آخر میں ایک یا زیادہ راویوں کو حذف کیا گیا ہو اسے منقطع کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے متصل سند نہ رکھنے والی حدیث کی چھ قسمیں منقطع میں شامل ہو جاتی ہیں لیکن منقطع بالمعنی الاخص — منقطع کی یہ اصطلاح زیادہ تر اسی معانی میں استعمال ہوتی ہے — سے مراد ایسی روایت ہے جس کی سند کے درمیان

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۲۵۳۔ الرواشح السماویہ ص ۱۹۳

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۲۵۴۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۸۰

۳۔ الرواشح السماویہ ص ۱۲۸۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۲۱۵

سے ایک راوی حذف کیا گیا ہو۔[۱] منقطع کی اس کے علاوہ بھی کئی تعریفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ اصطلاح بھی بہت ہی کم استعمال ہوئی ہے۔

(۳) **معضل:** معضل وہ روایت ہے جس میں سند کے درمیان سے ایک یا زیادہ راوی حذف ہوں۔ معضل اور منقطع میں فرق یہ ہے کہ منقطع کی سند میں درمیان سے ایک راوی حذف ہوتا ہے جبکہ معضل میں ایک سے زیادہ راوی درمیان سے حذف ہوتے ہیں۔[۲]

(۴) **مرفوع:** اس کی دو تعریفیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ہر وہ حدیث جو معصوم کی طرف منسوب کی جائے مرفوع ہے خواہ متصل ہو یا منقطع۔ اس تعریف کی رو سے حدیثِ مرفوع، حدیثِ موقوف (جہاں سلسلۂ روایت صحابی پر ختم ہو) اور حدیثِ مقطوع (جہاں سلسلۂ روایت تابعی پر منتہی ہو) کے مدمقابل قرار پائے گی۔

(۲) ایسی روایت جس کی سند کے درمیان یا آخر میں سے ایک یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہوں اور اس کی تصریح لفظ "رفع" کے ساتھ کی گئی ہو اسے مرفوع کہا جاتا ہے مثلاً **روی الکلینی عن علی بن ابراهیم عن ابیه رفعه عن ابی عبدالله** اس مثال میں علی بن ابراہیم کے والد یعنی ابراہیم سے لے کر امام جعفر صادقؑ تک ایک یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہیں اور اس کی وضاحت لفظ "رفع" سے کی گئی ہے۔[۳]

(۵) **مرسل:** یہ لفظ "ارسال الدابۃ" سے ماخوذ ہے جو جانور کو کھلا چھوڑ دینے کا معنی دیتا ہے۔ گویا حدیثِ مرسل میں سند کے حذف کرنے سے حدیث ہر قید و بند سے آزاد ہوگئی ہے۔ لفظ مرسل کا اطلاق دو طرح کی اصطلاحات پر ہوتا ہے:

(۱) مرسل کا عام معنی۔ اس سے ہر وہ حدیث مراد ہوتی ہے جس میں ارسال اور حذف اسناد کیا گیا ہو چاہے اس کے تمام راوی حذف ہوں یا کچھ راوی حذف ہوں۔ اس تعریف کی رو سے مرسل روایت مرفوع، موقوف، مقطوع، معلق، منقطع اور معضل کے مترادف قرار پاتی ہے۔

۱۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۷۱۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۵۶

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۳۵ ۔ ۳۳۷۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۵۹

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۰۷ ۔ ۲۰۸

(۲) مرسل کا خاص معنی۔ اس معنی کے مطابق مرسل اس حدیث کو کہا جاتا ہے کہ کوئی تابعی درمیانی واسطہ یعنی صحابی کا نام لیے بغیر براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرے مثلاً اگر روایت کی سند یوں ہو کہ سعید بن مسیب — جو ایک تابعی ہیں — نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے یوں فرمایا۔[۱]

اس اصطلاح کا پہلا معنی رائج ہے۔

(۶) **مدلّس:** یہ ''دلس'' سے اسم مفعول ہے جس کے معنی تاریکی کے ہیں۔ یہ لفظ ''مدالسہ'' سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی کو فریب دینے کے ہیں۔ تدلیس کرنے والا (مدلس) اپنے عمل سے مخاطب کو تاریکی میں لے جا رہا ہوتا ہے اور اس سے فریب کر رہا ہوتا ہے، اسی لیے فریب کاری کو ''تدلیس'' کہا جاتا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں تدلیس کی دو اقسام ہیں:

(۱) تدلیس اسناد۔ یعنی سند کے عیب کو چھپایا جائے۔

(۲) تدلیس در شیوخ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ الحدیث سے ملاقات اور اُس سے حدیث سننے کے باوجود اُس کے نام کی صراحت نہ کرے یا غیر معروف نام اور کنیت سے اس کا ذکر کرے۔[۲]

(۷) **موضوع:** لفظ وضع، جعل کے معنی میں ہے اور محدثین کی اصطلاح میں موضوع اُس روایت کو کہا جاتا ہے جو سراسر جھوٹی ہو اور اسے معصوم سے منسوب کیا گیا ہو۔ موضوع احادیث کو جعلی احادیث بھی کہا جاتا ہے۔[۳]

(۳۔۱) حصول اور نقل روایت کی کیفیت

(۱) **مکاتب:** وہ حدیث مکاتب کہلاتی ہے جو معصوم کے حکم سے لکھی گئی ہو چاہے امام نے خود ابتدا کرتے ہوئے اُس حکم یا حدیث کو لکھا ہو یا کسی کے خط کے جواب میں لکھا ہو۔ اسی طرح امام نے وہ تحریر خود اپنے دست مبارک سے لکھی ہو یا کسی سے لکھوائی ہو۔[۴]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۳۸۔ ۳۴۱۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۱۰۷۔ ۱۰۸

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۷۶۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۱۸۶

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۹۹۔ ۴۰۰

۴۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۸۳۔ الرواشح السماویہ ص ۱۶۳

(۲) **مدبج:** یہ لفظ "تدبیج" سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے چہرے سے چہرہ ٹکرانا۔ گویا دو راوی روایت حاصل کرتے وقت ایک دوسرے کے چہرے کو نمایاں کر رہے ہوتے ہیں۔[1] اس کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ دو راوی ہم عمر یا اسناد یا مشائخ حدیث سے ملاقات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جب اُن میں سے ایک راوی دوسرے سے روایت کرے تو اسے مدبج کہتے ہیں۔[2]

(۳) **روایۃ الاقران:** دو راوی جو ہم عمر ہوں اور اسناد یا مشائخ حدیث سے ملاقات میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں اور اُن میں سے صرف ایک راوی دوسرے سے روایت کرے تو اُس روایت کو روایۃ الاقران کہا جاتا ہے۔[3]

(۴) **بڑوں کا چھوٹوں سے روایت کرنا:** اگر کوئی راوی عمر میں بڑا ہو یا اُس نے اپنے شیخ کے پاس زیادہ وقت گزارا ہو یا وہ علم میں اور کثرت روایت میں بڑا ہو مگر وہ اپنے سے چھوٹے شخص سے روایت کرے تو اسے "روایۃ الاکابر عن الاصاغر" کہا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی صحابی کسی تابعی سے روایت کرے یا کوئی تابعی کسی تبع تابعی سے روایت کرے۔[4]

(۴۔۱) منابع رجال میں سند کی اصطلاحات

(۱) **مجھول:** اس سے مراد ایسی روایت ہے جس کی سند کے کچھ یا سارے راویوں کا ذکر منابع رجال میں نہ ہو اور اگر ہو تو اُن کی شناخت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے علمائے رجال نے اُن کو مجھول کہا ہو[5] مثلاً بیان کیا گیا ہے کہ عوف بن عبداللہ[6] اور علی بن سلیمان اور بنان بن محمد[7] مجھول ہیں۔

مجھول کی اصطلاح منابع رجال اور کتب رجال میں نسبتاً زیادہ رائج ہے۔

(۲) **مھمل:** اس سے مراد ایسی حدیث ہے جس کی سند کے کچھ یا سارے راویوں کے نام

۱۔ مقباس الھدایہ ج ۱ ص ۳۰۲

۲۔ الوجیزۃ فی علم الدرایہ ص ۹۔ مقدمہ بن صلاح ص ۳۰۹

۳۔ مقباس الھدایہ ج ۱ ص ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۳۰۹

۴۔ الوجیزۃ فی علم الدرایہ ص ۹۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۳۰۷

۵۔ مقباس الھدایہ ج ۱ ص ۳۹۷

۶۔ رجال نجاشی ص ۱۹۲

۷۔ اختیار معرفۃ الرجال ج ۱، ۳۶ اور ۱۹۱

کتب رجال میں آئے ہوں مگر محدثین نے اُن کی تعریف یا مذمت نہ کی ہو یعنی ان کے متعلق مکمل سکوت اختیار کیا ہو[1] مثلاً کہا گیا ہے کہ محمد بن موسیٰ قزوینی اور حسن بن علی بن مہز یار[2] مہمل ہیں۔

(۳) **مشترک:** اس سے مراد ایسی روایت ہے جس کی سند کے کچھ راوی ہم نام ہوں اور ان راویوں میں سے کچھ ثقہ ہوں[3] مثلاً محمد بن قیس اسدی کا نام چار افراد میں مشترک ہے۔ ان میں سے محمد بن قیس اسدی (ابو نصر) اور محمد بن قیس اسدی مولیٰ بنی نصر ثقہ ہیں اور دیگر دو افراد ثقہ نہیں ہیں۔[4]

(۴) **متشابہ:** اس سے مراد ایسی روایت ہے جس کی سند کے راویوں کے نام لکھنے اور بولنے میں تو یکساں مگر اُن کے والد کے نام لکھنے میں یکساں اور بولنے میں مختلف ہوں مثلاً محمد بن عقیل۔ اگر عقیل کی عین پر زبر پڑھا جائے تو اس سے محمد بن عقیل نیشاپوری اور اگر عقیل کی عین پر پیش پڑھا جائے تو اس سے محمد بن عقیل فریانی مراد ہوتے ہیں۔[5] منابع رجال میں یہ اصطلاح ایک حد تک رائج ہے۔

﴿۲﴾ متن سے متعلق اصطلاحات

متن سے تعلق رکھنے والی اصطلاحات کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) وہ اصطلاحات جن کا تعلق متن کی دلالت کی کیفیت سے ہے مثلاً اگر متن حدیث کی دلالت صریح ہو تو اسے ''نص'' اور اگر دلالت غیر صریح اور ظنی ہو تو اسے ''ظاہر'' کہا جاتا ہے۔

(۲) ایسی اصطلاحات جن کا تعلق متن کی قبولیت یا عدم قبولیت سے ہے مثلاً مقبول یا مطروح۔

ذیل میں ہم ان اصطلاحات کی وضاحت کر رہے ہیں:

(۱۔۲) دلالت کی کیفیت سے متعلق متن کی اصطلاحات

(۱و۲) **نص و ظاہر:** جب روایت کی دلالت اتنی واضح ہو کہ اس میں صرف ایک ہی معنی کا احتمال ہو تو اسے ''نص'' کہا جاتا ہے[6] اور اگر روایت کی دلالت نص کی طرح صریح نہ ہو اور اس میں اُس کے

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۹۱۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۱۱۸

۲۔ تاریخ آل زرارہ ج ۱، ص ۹۶۔ ج ۲، ص ۸۱ (حاشیہ)

۳و۴۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۸۸

۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۸۴۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۹۲

۶۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۱۶

خلاف معنی کا احتمال بھی ہو تو اسے "ظاہر" کہا جاتا ہے۔[1] اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں: روایت ہے الاثنان جماعة دو افراد جماعت ہیں۔[2] اس روایت کی دلالت واضح ہے کہ دو افراد سے نماز جماعت قائم ہو سکتی ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل موجود نہیں ہے لہٰذا اسے "نص" کہا جائے گا۔ "ظاہر" کی مثال کے لیے اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیں: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَبِيتَنَّ إِلَّا بِوِتْرٍ جو شخص خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نماز وتر پڑھے بغیر نہ سوئے۔[3] یہ حدیث "ظاہر" ہے کیونکہ نہی میں اس کے ظاہر کے خلاف یعنی استحباب مؤکد کا ارادہ کیا گیا ہے۔

(۳ و ۴) **مجمل و مبیّن:** جب کسی روایت کی دلالت واضح ہو تو اسے مبیّن کہا تا ہے۔ مبین کی اصطلاح نص اور ظاہر دونوں کو شامل کرتی ہے یعنی نص یا ظاہر دونوں کو لفظ مبین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔[4] اور مجمل وہ روایت ہے جس کی دلالت واضح نہ ہو اور اُس کے الفاظ کا مطلب بھی واضح نہ ہو[5] غالباً اجمال کا تعلق اُن مقامات سے ہے جہاں کلام میں اُس کے تمام پہلوؤں اور اُس سے متعلق سوالات کا جواب موجود نہ ہو مثلاً علامہ مجلسی نے امام مہدیؑ کے ظہور کی روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ روایات مجملات کا حصہ ہیں۔ ان کی وضاحت دوسری روایات میں بیان کی گئی ہے۔[6]

(۵ و ۶) **ناسخ و منسوخ:** کسی چیز کے ہٹانے اور زائل کرنے کو لغت میں نسخ کہا جاتا ہے اور اصطلاح میں نئی دلیل آنے کی وجہ سے سابقہ حکم کے ہٹانے کو نسخ کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ناسخ، منسوخ دلیل کے عموم زمانی کو ختم کر دیتا ہے اس لیے پہلی دلیل کو منسوخ اور دوسری دلیل کو ناسخ کہا جاتا ہے۔[7] روایات میں نسخ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات سے مخصوص ہے۔ آپ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے بعد شریعت کا کوئی حکم منسوخ کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اگر اہل بیتؑ کی روایات میں کسی حکم کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے تو اس سے مراد نسخ حقیقی نہیں بلکہ نسخ کی کاشفیت (انکشاف) ہے۔

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۱۶ ۔ ۳۱۷

۲۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱، ص ۳۷۶

۳۔ ایضاً ص ۲۰۰

۴۔ ایضاً ص ۳۱۸ ۔ اصول الحدیث واحکامہ ص ۹۷

۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۱۶ ۔ ۳۱۷

۶۔ بحار الانوار ج ۴، ص ۱۳۲

۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: البیان فی تفسیر القرآن ص ۲۷۷ ۔ التمہید فی علوم القرآن ج ۲، ص ۲۷۷ ۔ ۲۷۸

(۷و۸) **محکم و متشابہ:** لفظ محکم ''احکام'' سے مشتق ہے جس کے معنی استوار اور مستحکم کرنے کے ہیں اور اس سے وہ روایت مراد ہوتی ہے جس کی دلالت واضح ہو اور اس میں مختلف معنی کا احتمال نہ ہو تا کہ کسی ایک معنی کو معین کرنے کے لیے قرینے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس کے مقابلے میں ''متشابہ'' ہے اور اس سے وہ روایت مراد ہوتی ہے جس میں کئی معانی کا احتمال پایا جاتا ہو اور متکلم کا حقیقی مقصود ظاہری معنی کے علاوہ ہو[1] مثلاً علامہ شعرانی نے شاء و اراد و لم یجب... کو محکم روایت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کے افعال سے متعلق باقی متشابہ روایات کو اس کی طرف پلٹانا چاہیے۔[2]

(۹) **مشکل:** وہ حدیث جس میں پیچیدہ اور گہرے مطالب پائے جائیں اور جسے صرف اہل فن اور حدیث شناس علماء ہی سمجھ سکیں اسے حدیثِ مشکل کہا جاتا ہے[3] مثلاً علامہ شبر نے اَعْرِفُوا اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلَ بِالرِّسَالَةِ... کی روایت کو پیچیدہ یعنی مشکل احادیث میں سے قرار دیا ہے۔[4]

(۱۰) **غریب لفظی:** یہ وہ حدیث ہے جس میں ایسے الفاظ ہوں کہ قلیل الاستعمال ہونے کی وجہ سے اُن کے معنی کا سمجھنا دشوار ہو۔ یہاں غریب لفظی کہہ کر ''لفظ'' کی قید اس لیے لگائی گئی ہے تا کہ یہ ''غریب مطلق'' سے جدا ہو سکے۔[5]

(۲۔۲) روایات کو قبول یا رد کرنے سے متعلق اصطلاحات

(۱) **مقبول:** جس حدیث کو قبول کیا گیا ہو اور اُس کی سند کی صحت یا عدم صحت پر توجہ دیے بغیر اُس کے مضمون پر عمل کیا جائے اسے حدیثِ مقبول کہتے ہیں۔ اس کی واضح مثال ''مقبولہ عمر بن حنظلہ'' ہے جس کی سند یوں ہے: محمد بن یعقوب، عن محمد بن یحییٰ، عن محمد بن الحسین، عن محمد بن عیسیٰ، عن صفوان بن یحییٰ، عن داؤد بن الحصین، عن عمر بن الحنظلہ ... اس کی سند میں محمد بن عیسیٰ اور داؤد بن حصین اگرچہ ضعیف ہیں لیکن متن کے مستحکم ہونے کی وجہ سے اس روایت کے متن کو قبول کیا گیا ہے۔[6]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۹۲

۲۔ شرح اصول کافی ج ۴، ص ۲۷۰

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۳۱۶

۴۔ مصابیح الانوار ج ۸، ص ۲۴

۵۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۷۲

۶۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۷۹۔ ۲۸۱۔ البدایہ فی علم الدرایہ ص ۴۴

(۲) **معتبر**: ایسی روایت جس پر سب یا زیادہ تر علماء نے عمل کیا ہو اور صحتِ اجتہادی یا وثاقت یا حسن ہونا اُس کے قابلِ اعتبار ہونے کی دلیل بنا ہو اسے معتبر کہتے ہیں۔[۱] معتبر کی یہ تعریف "مقبول" سے عام ہے کیونکہ معتبر متن قوی ہونے کے ساتھ ضعفِ سند سے بھی پاک ہوتا ہے۔

(۳) **مطروح**: ایسی روایت جس کا متن ایک طرف سے دلیل قطعی کے خلاف ہو اور دوسری طرف اس میں تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہ ہو اسے مطروح یعنی دور پھینکی ہوئی روایت کہا جاتا ہے۔[۲]

مذکورہ بالا تینوں اصطلاحات علم الحدیث میں رائج ہیں۔

﴿۳﴾ سند اور متن دونوں سے متعلق اصطلاحات

وہ اصطلاحات جو اُن کے لیے بیان کردہ تعریفات کے مطابق متن اور سند دونوں کو شامل کرتی ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) **معلل**: یہ اصطلاح دو طرح استعمال ہوتی ہے:

(الف) "متاخرین فقہاء" کے ہاں اس اصطلاح کا اطلاق ایسی احادیث پر ہوتا ہے جن میں شرعی احکام کی علل بیان کی گئی ہوں۔ شیخ صدوق کی کتاب علل الشرائع اس کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے وہ روایات جمع کی ہیں جن میں احکام کے علل بیان کیے ہیں۔

(ب) "محدثین" کی اصطلاح میں ایسی احادیث کو معلل کہا جاتا ہے جن کے ظاہری الفاظ درست ہوں مگر سند یا متن میں کوئی فساد پوشیدہ ہو یا پیچیدگی ہو۔ معلل کا یہ مفہوم "علت" یعنی بیماری سے ماخوذ ہے۔[۳]

(۲) **مُدرج**: اس کا مطلب یہ ہے کہ روایت میں راوی نے اپنا کلام بھی بڑھا دیا ہو اور اس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ شاید یہ بھی روایت کا حصہ ہے۔ ادراج کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں:

(الف) **سند میں ادراج**: اس سے مراد یہ ہے کہ سند میں راوی کے نام کے بعد کچھ

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۲۸۲۔ اصول الحدیث واحکامہ ص ۹۱

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۳۱۴ ۔ ۳۱۵

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۱ ص ۳۶۶ ۔ ۳۶۸۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۸۹

اوصاف کا اضافہ کیا جائے اور یوں لگے کہ توصیف شروع ہی سے سند میں موجود تھی۔

(ب) **متن میں ادراج:** اس کی کیفیت یہ ہے کہ راوی، روایت کے درمیان یا آخر میں حدیث کے استدلال کے عنوان سے اپنی بات شامل کرے یا روایت کے کسی لفظ کی وضاحت کرے اور یہ شبہ ہو کہ شاید یہ بھی معصوم کا کلام ہے۔[1]

(۳) **مصحّف:** لفظ ''تصحیف'' صحیفہ سے ماخوذ ہے جو کتاب کے معنی میں ہے اور لغت میں یہ لفظ کتاب لکھنے کے معنی میں آیا ہے مگر بعد میں اس کا مفہوم وسیع ہو گیا اور اس سے کتابت کی غلطی مراد لی جانے لگی۔[2] مصحف اُس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے اصل لفظ، مشابہ لفظ سے تبدیل ہو جائے مثلاً اصل لفظ ''برید'' ہو اور کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''یزید'' بن گیا ہو یا اصل لفظ ''حریز'' ہو اور کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''جریر'' بن گیا ہو۔ یہ سند میں تصحیف کی مثال ہے۔ اسی طرح متن میں بھی تصحیف ہو جاتی ہے مثلاً حدیث میں لفظ ستًّا تھا اور کتابت کی غلطی کی وجہ سے شَیْئًا بن گیا۔ ذیل کی حدیث کے متن میں یہ تصحیف دکھائی دیتی ہے: **من صام رمضان واتبعه شيئا من شوال**... جو کوئی ماہِ مبارک رمضان کے روزے رکھے اور اس کے ساتھ کچھ شوال کو بھی شامل کرے ...اصل لفظ سِتًّا ہے یعنی حدیث یہ ہے کہ جو کوئی ماہِ مبارک رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے۔[3]

(۴) **مزید:** اُس حدیث کو مزید کہتے ہیں جس کے مضمون میں اس موضوع پر بیان ہونے والی باقی احادیث کی نسبت کچھ اضافہ موجود ہو مثلاً رسول اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے: **جعلت لی الارض مسجدًا و طهورًا** پوری زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا ذریعہ بنائی گئی ہے جبکہ دوسری حدیث میں ہے: **جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ تُرَابُهَا وَ طَهُوْرًا** یہاں لفظ تُرَابُهَا کا اضافہ کیا گیا ہے اور سند میں یہ اضافہ روایت کی سند میں ارسال اور روایت متصل میں قطع کی طرح ہوتا ہے۔[4] مزید کی اصطلاح کسی حد تک محدثین میں رائج ہے۔

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۱۹ ۔ ۲۲۳۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۹۵

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۳۷ (حاشیہ)

۳۔ ایضاً ص ۲۳۷ ۔ ۲۳۸

۴۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۶۵ ۔ ۲۶۶۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۸۶

تیسری قسم

حصول حدیث کے شرائط اور طرق

حصول حدیث کی شرائط سے مراد وہ شرائط ہیں جن کا حدیث حاصل کرتے وقت ہونا ضروری ہے اور حصول حدیث کے طرق سے مراد وہ طریقے ہیں جو حدیث لینے کے لیے محدثین میں رائج ہیں۔ ذیل میں ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں:

حصول حدیث کی شرائط

حدیث حاصل کرنے کے لیے راوی میں دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عاقل ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ممیز ہو۔ ''ممیز'' سے مراد یہ کہ وہ کم سے کم بچپن اور بلوغت کے درمیان کی عمر میں ہو یعنی راوی عاقل ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے برے میں تمیز کرنے کے بھی قابل ہو۔ حدیث کے حصول میں اسلام، ایمان اور عدالت شرط نہیں ہے لہٰذا اگر کافر یا منافق یا فاسق یا نابالغ یا غیر امامیہ فرقے کے فرد نے کسی روایت کو حصول حدیث کے مروجہ طرق میں سے کسی ایک کے ذریعے حاصل کیا ہو تو حصول حدیث کا مفہوم اُس حدیث پر صادق آسکتا ہے۔ البتہ اُس کی بیان کردہ حدیث اُس وقت قبول کی جائے گی جب اُس حدیث کے صدور اور نقل کے وقت اُس کے اندر اسلام، ایمان، بلوغ اور عقل کی شرائط موجود ہوں۔ اس مدعا کی دلیل صدرِ اسلام کے واقعات ہیں مثلاً جبیر بن مطعم نے زمانۂ کفر میں آنحضرتؐ کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ جب اس نے اسلام قبول کیا تو اس نے لوگوں کے سامنے آنحضرتؐ کی اس سنت کو بیان کیا اور سب نے اسے قبول کیا۔[۱]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۵۸ - ۵۹۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۲۸

حصولِ حدیث کے ذرائع

(۱) **سماع:** شیخ الحدیث سے سننا جسے سماع کہا جاتا ہے یعنی راوی اپنے شیخ کے پاس بیٹھا ہو اور شیخ اُس کے سامنے کوئی حدیث پڑھے چاہے وہ لکھی ہوئی حدیث پڑھے یا اپنے حافظے میں محفوظ حدیث پڑھے اور راوی اس کو توجہ سے سنے۔ اگر کوئی راوی شیخ کی بیان کردہ حدیث کو لکھے تو اس کو ''املاء'' کہا جاتا ہے۔[۱]

محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدیث حاصل کرنے کے آٹھ ذرائع میں سے ''سماع'' کا درجہ سب سے بلند ہے اور جو حدیث اس ذریعے سے حاصل اور نقل کی جائے وہ دیگر تمام ذرائع سے زیادہ مستحکم اور قابل اعتماد ہوتی ہے۔ سماع کو حصول حدیث کے ذرائع میں بہت اہم مقام حاصل ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ راوی پر لازم ہے کہ وہ اپنے سماع کو حسب ذیل عبارتوں میں سے کسی ایک کے ذریعے ثابت کرے مثلاً **سمعت فلانا**، **حدث فلان**، حدثنی، حدثنا، اخبرنا اور انبأنا۔[۲]

(۲) **شیخ کو حدیث سنانا:** اس طریقے میں بھی سننے اور سنانے کا عمل ہوتا ہے اسی لیے یہ بھی سماع کی مانند ہے۔ ان دونوں ذرائع میں فرق یہ ہے کہ سماع میں شیخ حدیث سناتا اور راوی سنتا ہے جبکہ اس طریقے میں راوی حدیث سناتا ہے اور شیخ سنتا ہے۔ اس وجہ سے متقدمین اس طریقے کو ''عرض'' (پیش کرنا) کہتے تھے کیونکہ اس صورت میں راوی دراصل شیخ کے سامنے حدیث کو پیش کر رہا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ طریقہ اُس وقت کارآمد ہے جب شیخ سننے کے بعد راوی کی بیان کردہ روایات کی تائید کرے اور انھیں صحیح قرار دے۔[۳]

(۳) **اجازہ:** یہ لفظ ''جواز الماء'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پانی کا گزرنا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گویا شیخ نے اجازت دے کر حدیث کا میدان عبور کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

اصطلاح میں لفظ اجازہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شیخ راوی کو اپنی بیان کردہ یا اپنی لکھی ہوئی احادیث نقل کرنے کی اجازت دے دے۔

اجازہ صریح یا غیر صریح بیان یا اشارے سے دیا جا سکتا ہے۔[۴] واضح رہے کہ ''اجازہ'' کا

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۶۶ ۔ ۶۷۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳۲

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۶۹

۳۔ ایضاً ص ۸۳ ۔ ۸۵۔ تدریب الراوی ج ۲، ص ۲۸

۴۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۱۳ ۔ ۱۱۵

طریقہ جوامع احادیث کی تدوین کے بعد سامنے آیا جب شیخ بطور تبرک اپنے شاگرد کو نقل حدیث کی اجازت دیتا تھا جیسا کہ علامہ مجلسی نے مشائخ حدیث جیسے آقا حسین محقق خوانساری اور شیخ حر عاملی وغیرہ سے حصول برکت کے لیے اجازۂ حدیث حاصل کیا تھا۔

(۴) **مناولہ**: اس سے مراد یہ ہے کہ شیخ اپنی حدیث کی کتاب راوی کے حوالے کر دے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہے کیونکہ ایک مرتبہ[۱] آپ نے ایک سریہ کے سالار کو کچھ ہدایات دے کر روانہ کیا اور فرمایا کہ فلاں منزل پر پہنچنے سے پہلے اس تحریر کو نہ پڑھنا۔ جب وہاں پہنچ جاؤ تو اس کو پڑھ کر اس پر عمل کرنا۔[۲]

''مناولہ'' کی حسب ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) مناولہ کے ساتھ اجازہ ہو یعنی شیخ اپنی حدیث کی کتاب کسی کے حوالے کر دے اور ساتھ ہی اسے اس کتاب سے حدیث نقل کرنے کی تحریری اجازت بھی دے۔

(۲) اجازہ کے بغیر مناولہ۔ یہ مطلق مناولہ ہوتا ہے یعنی شیخ اپنی کتاب کسی کے حوالے کر کے کہے: **ھذا سماعی** یا پھر کہے: **ھذہ روایتی**۔

کچھ محدثین اس طرح کے مناولہ کو کافی نہیں جانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے مناولہ کی بنیاد پر نقل روایت بہت ہی شاذ و نادر اور ناکافی ہے جبکہ مشہور محدثین اسے صحیح اور کافی قرار دیتے ہیں۔[۳]

(۵) **کتابت**: کتابت سے مراد یہ ہے کہ شیخ اپنی روایات کو کسی حاضر مخاطب یا غائب کے لیے تحریر کرے یا کسی موثق شخص کو حکم دے کہ وہ ان روایات کو مخاطب کے لیے تحریر کرے اور تحریر کے آخر میں خود یہ تصریح کرے کہ یہ احادیث میرے حکم سے لکھی گئی ہیں۔

علماء کے نزدیک حدیث کی درجہ بندی میں سماع کے بعد دوسرا نمبر کتابت کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ راوی پر لازم ہے کہ وہ اس تحریر میں ایسا جملہ لکھے کَتَبَ اِلَیَّ فُلَانٌ (فلاں نے اسے لکھ کر میری طرف بھیجا)۔ اس طرح سے کتابت کا ذریعہ باقی ذرائع سے الگ ہو جاتا ہے۔[۴]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۳۵۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۶۵

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۳۶

۳۔ ایضاً ص ۱۳۶ ۔ ۱۴۶

۴۔ ایضاً ص ۱۵۲۔ تدریب الراوی ج ۲، ص ۶۱

(۶) **اعلام:** اعلام سے مراد یہ ہے کہ شیخ اپنے واضح یا غیر واضح بیان یا کتابت کے ذریعے یہ اعلان کرے کہ یہ کتاب، یا حدیث اس سماع پر مبنی ہے جو اُس نے فلاں شیخ سے سنی تھی اور اس تحریر میں اجازۂ روایت کے متعلق کچھ نہ کہے۔ کچھ حضرات اعلان شیخ کے استناد کے ساتھ نقل روایت کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس مشہور محدثین اعلان کو قرأت علی الشیخ کے مساوی قرار دیتے ہیں اور نقل حدیث کے لیے اسے کافی جانتے ہیں۔[۱]

(۷) **وصیت:** وصیت سے مراد یہ ہے کہ شیخ، موت کے وقت یا سفر کے دوران کسی شخص کو یہ وصیت کرے کہ اس کی روایات پر مبنی کتاب کو روایت کرے۔ محدثین کا ایک گروہ اس وصیت کو جائز سمجھتا ہے کیونکہ شیخ کا اپنی کتاب کو کسی کے سپرد کردینا گویا روایت نقل کرنے کی اجازت دینا ہے اور یہ مناولہ یا اعلام کے مساوی ہے لیکن محدثین کی اکثریت اسے کافی نہیں سمجھتی۔[۲]

(۸) **وجادۃ:** وجادۃ بروزن کتابۃ ''وجد'' کے مادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ''پانا''۔

اس سے مراد یہ ہے کہ راوی، شیخ کی کتاب یا بخط شیخ لکھی ہوئی روایات لائے جبکہ راوی شیخ کا معاصر نہ ہو اور اگر معاصر ہو تو اُس سے ملا نہ ہو اور وہ اُس کتاب کا خط شیخ کا خط ہونے پر یقین کرکے اسے روایت کرے۔ وجادہ کتابت کی مانند اجازہ کے ساتھ یا اجازہ کے بغیر ہوتا ہے۔

کتاب فقہ الرضا جو امام علی رضا علیہ السلام سے منسوب ہے وجادہ کے ذریعے نقل ہوئی ہے۔[۳]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۵۸ ۔ ۱۵۹ ۔ مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۵

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۶۲ ۔ ۱۶۳ ۔ تدریب الراوی ج ۲، ص ۵۶

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۱۷۱

چوتھی قسم

نقل اور قبولیتِ روایات کی شرائط

نقل روایت کی شرائط

(۱) **اسناد روایات کا ذکر:** روایات کو اسناد کے ساتھ بیان کرنا مسلمانوں کا خاصہ ہے۔ معصومین مسلمانوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ جہاں روایت کا متن لکھیں وہاں اُس کے اسناد بھی لکھیں اسی لیے مسلمانوں نے اسناد کو بیان کرنے کا خصوصی اہتمام کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ

اِذَا كَتَبْتُمُ الْحَدِيْثَ فَاكْتُبُوْهُ بِاِسْنَادِهٖ فَاِنْ يَكُ حَقًّا كُنْتُمْ شُرَكَاءَ فِي الْاَجْرِ وَاِنْ يَكُ بَاطِلًا كَانَ وِزْرُهٗ عَلَيْهِ جب تم حدیث لکھو تو اس کے اسناد کو بھی ساتھ لکھو۔ اگر وہ سچی ہوئی تو تم ثواب میں شریک قرار پاؤ گے اور اگر وہ جھوٹی ہوئی تو اس کا بوجھ راوی کی گردن پر ہوگا۔[1]

اس سے ملتی جلتی روایت امیرالمومنینؑ سے بھی کی گئی ہے۔[2]

روایات کے ساتھ اسناد لکھنے سے جہاں روایات کے متن کے اعتبار کو تقویت ملتی ہے وہاں جھوٹی روایات کا دروازہ بھی بند ہوجاتا ہے اور اس سے سچ اور جھوٹ کی تمیز آسان ہوجاتی ہے۔ اسی لیے شیعہ اور سنی حدیث کے تمام ادوار میں اسناد بیان کرنے کا خاص مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اتنے افراط سے کام لیا گیا کہ روایات کے متن کی طرف کم ہوگئی۔ چنانچہ متقدمین نے اس بات پر تنقید کی کہ لوگ اسناد تو بیان کرتے ہیں مگر روایت کے متن سے غفلت برتنے لگے ہیں۔[3]

۱۔ ادب الاملاء والاستملاء ص ۱۱۔ الجامع الصغیر ج ۱، ص ۱۲۹

۲۔ کافی ج ۱، ص ۵۲۔ وسائل الشیعہ ج ۲۷، ص ۸۱

۳۔ ضحی الاسلام ج ۲، ص ۱۳۱۔ جهود المحدثین فی نقد الحدیث النبوی الشریف ص ۳۵۰۔ ۳۵۱

(۲) **نص روایات کا بیان اور نقل بالمعنی سے پرہیز:** ہم جانتے ہیں کہ روایت بھی دوسری باتوں کی طرح دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک لفظی اور دوسری معنوی مثلاً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔[۱] چنانچہ حدیث کے الفاظ اور اُن کی ترکیب سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ علم کا حصول تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ اگر ہم الفاظ بدل دیں تو یہ نقل بالمعنی ہوگا یعنی ہم روایت کے مفہوم کو نقل کریں مگر روایت کے الفاظ ہو بہو نقل نہ کریں مثلاً اسی حدیث کو ہم یوں نقل کریں **طلب العلم واجب علی کل مسلم** یا اس کی بجائے ہم اس حدیث کا معنی یوں بیان کریں **طلب العلم فریضة علی کل مؤمن** چنانچہ اس طرح کے لفظی تصرف کو نقل بالمعنی کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بات واضح ہے کہ ہر لفظ کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے اور لفظوں کی ترکیب بھی معنی آفرینی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور جب الفاظ اور اُن کی ترکیب کو بدل دیا جائے تو پھر اُس سے مطلوبہ مفہوم کی پوری ادائیگی نہیں ہوسکتی اور ظاہر ہے کہ مقصود، روایات کے الفاظ کو ہو بہو نقل کرنا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی نص کو اُس کے اصل الفاظ سے نقل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اور اکثر اوقات اُس کے حافظے میں اصل الفاظ باقی نہیں رہتے اس لیے انسان اصل کی بجائے متبادل اور مترادف الفاظ سے اُس مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اس وجہ سے روایات کے جملے کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوجاتے ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرینؑ نے نقل بالمعنی کی اجازت دی تھی۔[۲]

معلوم ہونا چاہیے کہ نقل بالمعنی کے یے حسب ذیل تین شرائط کا ہونا ضروری ہے:

(۱) راوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایت میں موجود الفاظ کے معنی اور اُس کے خلاف دلالت کرنے والے قرائن سے آگاہ ہو یعنی اسے سخن شناس اور ادیب ہونا چاہیے۔

(۲) راوی کو لازماً اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کلام معصوم کے مقصود میں کمی واقع نہ ہو۔

(۳) اس کی بات دلالت کے واضح اور مخفی ہونے کے لحاظ سے اصل روایت کے مشابہ ہو۔[۳]

۱۔ کافی ج ۱، ص ۳۰۔ ۳۱

۲۔ کافی ج ۱، ص ۵۲۔ وسائل الشیعہ ج ۲۷، ص ۸۱

۳۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ تدوین السنۃ الشریف ص ۵۱۶۔ ۵۱۸

(۳) **روایات کو تقطیع کئے بغیر پورا بیان کرنا چاہیے:** اس پابندی کی وجہ یہ ہے کہ ہر روایت مکمل گفتگو پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا آپس میں مربوط ہوتی ہے اور دونوں حصے مل کر معنی کی دلالت کو مکمل کرتے ہیں۔ ایسی دلالت کو ''سیاق'' کہا جاتا ہے اس لیے ناقلینِ حدیث کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ روایت کو ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر پورا بیان کریں۔ کچھ محدثین تقطیع کو مطلقاً ممنوع اور کچھ مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص احادیث کی جانکاری رکھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ جو حصہ حذف ہوا ہے اس میں اور جو حصہ حذف نہیں ہوا اس میں کیا فرق ہے اور تقطیع کی وجہ سے دلالتِ حدیث میں فرق نہ آئے تو اس صورت میں تقطیع جائز ہے۔[۱]

قبولیتِ روایات کی شرائط

جب روایات میں حصول اور ادا کی شرائط موجود ہوں تو اُس کی قبولیت کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ یہ شرائط راوی یا راویوں سے متعلق ہیں یعنی اگر راویوں میں حسب ذیل شرائط موجود ہوں تو اُن کی روایات قبول کی جائیں گی:

(۱) اسلام (۲) عقل (۳) بلوغ (۴) ایمان (۵) عدالت (۶) ضبط

ان شرائط کی تفصیل یہ ہے:

(۱) **اسلام:** تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ راوی مسلمان ہو۔ اس بنیاد پر کافروں کی روایات چاہے وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا خوارج اور مجسمہ کی طرح خود کو مسلمان کہتے ہیں اور جنھیں باقی مسلمان کافر سمجھتے ہیں قابل قبول نہیں ہیں۔ اس شرط کا ثبوت ''آیت نبأ'' سے ملتا ہے جس میں فاسق کی خبر کی تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۲] جب فاسق کی خبر قابل اعتبار نہیں تو پھر کافر کی خبر کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے؟ قرآن کریم نے ظالموں پر اعتماد کرنے سے منع کیا ہے[۳] اور کافر کا شمار بھی ظالم میں ہوتا ہے۔[۴]

ان آیتوں سے بھی مسلمان ہونے کی شرط ثابت ہوجاتی ہے۔

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۳، ص ۲۵۶ ۔ ۲۵۷ (حاشیہ)

۲۔ سورۂ حجرات: آیت ۶

۳۔ سورۂ ہود: آیت ۱۱۳

۴۔ مقباس الہدایہ ج ۲، ص ۱۳ ۔ ۱۴۔ الہدایہ فی علم الدرایہ ص ۶۴

(۲) **عقل:** راوی کا عاقل ہونا شرط ہے اس لیے پاگل، مست، سوئے ہوئے، بیہوش اور بھولنے کی بیماری میں مبتلا شخص کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔[۱] ظاہر ہے کہ جب ایسے افراد کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی اور اُن کو وکیل یا وصی بنانا صحیح نہیں جبکہ ان چیزوں کا تعلق انسان کے ذاتی معاملات سے ہے تو پھر دین وشریعت کے معاملے میں ایسے افراد کی روایات کیسے قبول کی جا سکتی ہیں؟

(۳) **بلوغ:** اس شرط کی رو سے تمام محدثین کے نزدیک غیر ممیز بچے کی روایت نا قابل قبول ہے جبکہ ممیز بچے کی روایت کے قابل قبول ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ ایسے بچے کی روایت کو قبول کرتا ہے جبکہ مشہور محدثین کا نظریہ یہ ہے کہ روایت کی قبولیت کے لیے راوی کا بالغ ہونا ضروری ہے۔[۲]

(۴) **ایمان:** ایمان سے مراد یہ ہے کہ راوی ائمہ اثنا عشر کی امامت پر اعتقاد رکھتا ہو۔ چنانچہ شیعہ محدثین کی اکثریت راوی کے لیے ایمان کی شرط کو ضروری سمجھتی ہے[۳] لیکن شیخ طوسی کا نظریہ یہ ہے کہ اہل سنت یا غیر اثنا عشری راویوں کی روایات اگر شیعہ اصحاب کی روایات کے مخالف نہ ہوں تو وہ قابل قبول ہیں[۴] جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جب ایسے حالات درپیش ہوں کہ روایات میں تمھیں اُن کے متعلق کوئی حکم دکھائی نہ دے تو ایسی روایات تلاش کرو جو حضرت علیؑ سے منقول ہوں اور اُن پر عمل کرو۔[۵]

(۵) **عدالت:** عموم شیعہ محدثین، شیعہ راوی کے لیے عدالت کو شرط قرار دیتے ہیں جبکہ ایک گروہ راوی کے لیے عدالت کو شرط نہیں سمجھتا۔ پھر یہ گروہ دو گروہوں میں تقسیم ہوتا ہے:

(ا) ایک گروہ کہتا ہے کہ جو شخص مجہول الفسق ہو (یعنی جس کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو) اُس کی روایات قابل قبول ہیں۔ اس نظریے کے مطابق ایسے تمام راویوں کی روایات جن کے فاسق ہونے کی کتب رجال میں تصریح نہیں کی گئی قابل قبول ہیں چاہے اُن کی ثقاہت یا عدالت کے متعلق بحث ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۲، ص ۱۹ ۔ ۲۰۔
نووی نے تقریب میں اور سیوطی نے تدریب الراوی میں اور خطیب نے الکفایہ میں اس شرط پر تاکید کی ہے۔

۲۔ مقباس الہدایہ ج ۱، ص ۲۱ ۔ ۲۲

۳۔ ایضاً ص ۲۵ ۔ ۲۶

۴۔ ایضاً

۵۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸، ص ۶۴

(۲) شیخ طوسی کہتے ہیں کہ عدالت ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی راوی کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ جھوٹ سے نفرت کرتا تھا اور جھوٹ نہیں بولتا تھا تو اُس کی روایت لینے کے لیے یہی کافی ہے۔[۱] ہم اصطلاحی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ "ثقاہت" کو قبولیتِ روایت کے لیے کافی سمجھتے تھے۔

(٦) **ضبط:** اس سے مراد یہ ہے کہ راوی ایسے حافظے اور قوتِ تمیز کا مالک ہو کہ وہ روایات کو کسی غلطی، تصحیف اور تحریف کے بغیر بیان کرسکتا ہو۔ اس کا کم از کم معیار یہ ہے کہ راوی کی قوتِ ضبط اور حافظہ اُس کے سہو و اشتباہ سے زیادہ ہو کیونکہ نقل روایت کو سہو و نسیان سے سو فیصد پاک ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔[۲]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۲، ص ۳۳۔ ۴۰

۲۔ ایضاً ص ۴۳۔ ۴۹

پانچواں باب

رجال حدیث سے آشنائی

علم رجال کی تعریفات

علم رجال راویوں کی شناخت اور صفات کا علم ہے۔ یہ علم روایات کی قبولیت اور عدم قبولیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے مثلاً اس میں راویوں کے ایمان اور عدالت کو واضح کیا جاتا ہے۔ اس علم میں راویوں کی توثیق و جرح اور جرح و تعدیل میں تعارض کو دور کرنے پر بحث کی جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ائمہ معصومینؑ کی روایات ہم تک اسناد کے ساتھ پہنچی ہیں۔ سند سے راویوں کا وہ سلسلہ مراد ہوتا ہے جس میں سے ہر راوی نے تاریخی ادوار کی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے راوی کے سامنے معصوم کی روایت بیان کی ہو یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچی ہے۔ اس کی مثال کے لیے کتاب کافی کی یہ روایت ملاحظہ کیجئے:

مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰى عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الْجَبَّارِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْمَاعِيْلَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ النُّعْمَانِ عَنِ ابْنِ مُسْكَانَ عَنْ اَبِيْ بَصِيْرٍ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ لِيْ يَا اَبَا مُحَمَّدٍ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَمْ يُعْطِ الْاَنْبِيَاءَ شَيْئًا اِلَّا وَ قَدْ اَعْطَاهُ مُحَمَّدًا (ص) محمد بن یحییٰ نے ... ابو بصیر سے کی روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے مجھ سے فرمایا: اے ابو محمد! خدائے عزوجل نے جو کچھ تمام انبیاء کو عطا کیا ہے وہ سب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی عطا کیا ہے۔[1]

یہ حدیث کافی کی کتاب الحجت میں ہے اور اس کا تعلق عقائد سے ہے۔ اس حدیث کو ان چھ راویوں نے بالترتیب امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے:

(۱) محمد بن یحییٰ (۲) محمد بن عبدالجبار (۳) محمد بن اسماعیل
(۴) علی بن نعمان (۵) ابن مسکان (۶) ابوبصیر

۱۔ کافی ج ۱، ص ۲۲۷

ظاہر ہے کہ شیخ کلینی کا تعلق چوتھی صدی کے محدثین سے ہے اور وہ امام جعفر صادقؑ سے[1] روایت کر رہے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اور شیخ کلینی کے درمیان ڈیڑھ سو سال کا فاصلہ ہے۔

اس لیے یہاں یہ بات یقینی ہے کہ مرحوم کلینی نے اپنے پیشرو راویوں سے یہ حدیث سنی تھی یا حصول حدیث کے دوسرے ذرائع سے یہ حدیث ہمارے لیے نقل کی ہے۔

اب اگر مرحوم کلینی روایت کے راویوں کے نام اور سلسلۂ سند کو بیان نہ کرتے تو پھر ہمارے لیے اس روایت کے امام سے صادر ہونے پر اطمینان حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ نہ ہوتا مگر یہ کہ ہم یہ کہہ کر خود کو تسلی دیں کہ کوئی بات نہیں۔ چونکہ مرحوم کلینی انتہائی محتاط اور بزرگ محدث تھے تو یقیناً انھوں نے راویوں سے سن کر ہی ہمارے لیے یہ حدیث نقل کی ہوگی۔ جب یہ کہہ کر ہم اپنے آپ کو تسلی دیتے تو دوسرا اعتراض ہمارے سامنے آجاتا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مرحوم کلینی کو راویوں کی عدالت، ثقاہت اور ایمان کی تشخیص میں مغالطہ ہوا ہو۔ جب مرحوم کلینی نے راویوں کے نام اور پورے سلسلۂ سند کو لکھ دیا تو ہمارے لیے آسانی ہوگئی کہ ہم اپنے اجتہادی اور نظری اصولوں کے مطابق راویوں پر تحقیق کریں۔

اب ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ یہ چھ راوی کون تھے؟ اور کس دور میں تھے اور کیا یہ ایک دوسرے کے معاصر تھے؟ اور کیا یہ تمام راوی ائمہ اہل بیتؑ کی امامت کے قائل بھی تھے؟ اور کیا اخلاقی اعتبار سے وہ عادل یا کم از کم سچے تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ روایت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے لیے ہمیں ان سوالات کا جواب معلوم کرنا ہوگا تب کہیں جا کر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے اور اُن راویوں کے درمیان تیرہ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ایسے میں ہم ان سوالوں کا جواب جاننا چاہیں تو کس طرح جانیں؟ یہ وہ مقام ہے جہاں علم رجال ہماری مدد کرتا ہے اور ہمیں راویوں کے کوائف بتاتا ہے۔ یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ راوی کہاں کے رہنے والے تھے، اثنا عشری تھے یا نہیں تھے؟ اور عادل تھے یا نہیں تھے؟ جس طرح آپ ایک لغت سے مشکل الفاظ کے معانی تلاش کرتے ہیں اسی طرح کتب رجال کے ذریعے راویوں کے حالات اور کوائف معلوم کئے جا سکتے ہے۔ البتہ کچھ مشکلات ایسی بھی ہیں جو صرف کتب رجال کی طرف رجوع کرنے سے حل نہیں ہوسکتیں اس لیے اُن کا بیان کیا جانا ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

علمائے رجال راویوں کی تعدیل، توثیق اور جرح کے لیے کون سے الفاظ استعمال کرتے ہیں

۱۔ امام جعفر صادقؑ ۱۱۴ھ میں امام محمد باقرؑ کی شہادت کے بعد امام بنے اور ۱۴۸ھ میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

اور کس بنا پر راویوں کی توثیق کی جاسکتی ہے؟ کیا اس کے لیے امام معصوم کی نص ضروری ہے؟ کیا اصحاب اجماع میں سے ہونے کے لیے ثقاہت اور وثاقت کافی ہے؟ اگر علمائے رجال ایک ہی راوی کے متعلق مختلف رائے رکھتے ہوں یعنی جرح و تعدیل میں تعارض ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ شیعہ اور اہل سنت رجال کے منابع کیا ہیں اور اُن میں آپس میں کیا فرق ہے؟

علم رجال ان سوالات کے بھی تسلی بخش جواب دیتا ہے۔ علم رجال کے کچھ مباحث نظری اور کچھ عملی ہیں۔ جو حصہ عملی ہے اُس کے لیے براہ راست منابع رجال کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چونکہ کتب رجال میں زیادہ تر پہلے حصے پر یعنی نظری مباحث پر گفتگو کی جاتی ہے اس لیے اس باب میں ہم ان مباحث کو بیان کریں گے۔

علم رجال کا موضوع اور اُس کے مباحث

علم رجال کا موضوع راویوں کے کچھ حالات پر تحقیق سے تعلق رکھتا ہے مثلاً اس میں راویوں کے ایمان، عدالت، ثقاہت اور ضبط کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے اور یہی روایت کی قبولیت اور عدم قبولیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے دوسرے حالات پر بحث نہیں کی جاتی مثلاً کتب رجال میں کسی راوی کے متعلق یہ تحقیق نہیں کی جاتی کہ وہ شاعر تھا یا تاجر تھا اور مزید یہ کہ اُس کے پاس کوئی حکومتی عہدہ تھا یا نہیں تھا۔ یہ چیزیں علم رجال کے دائرے سے خارج ہیں۔

علم رجال کے مباحث درج ذیل ہیں:

(۱) جرح و تعدیل کے الفاظ اور اُن کا تعارض

(۲) خاص توثیقات

(۳) عام توثیقات

(۴) منابع رجال کی شناخت

اس باب کی بحثوں کا تعلق انہی چار قسم کے مباحث سے ہے نیز کچھ مقدماتی باتیں بھی اس میں شامل ہیں۔

پہلی بحث

جرح و تعدیل کے الفاظ اور ان کا تعارض

علمائے رجال راویوں کی عدالت یا ثقاہت کو بیان کرنے کے لیے تعدیل و توثیق کے خاص الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نیز وہ راویوں کی اعتقادی اور اخلاقی کمزوری بیان کرنے کے لیے بھی خاص الفاظ استعمال کرتے ہیں جنھیں ''الفاظِ جرح'' کہا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اُن الفاظ کو بیان کرتے ہیں:

﴿۱﴾ توثیق پر دلالت کرنے والے الفاظ

(۱۔۱) **عدل، امامی ضابط:** لفظ ضابط کے ذریعے راوی کی شخصیت یعنی اُس کی قوتِ حافظہ اور حصول ونقلِ روایات کی اور لفظ عدل کے ذریعے راوی کے اخلاق اور پابند واجبات ہونے کی نشاندہی کی جاتی ہے اور لفظ امامی کے ذریعے اُس کے ایمان وعقیدے اور شیعہ اثنا عشری ہونے کو بیان کیا جاتا ہے ان الفاظ کو راوی کے تزکیہ و تعدیل پر بہترین اور واضح ترین سند سمجھا جاتا ہے۔[1]

(۲۔۱) **عدل:** جب یہ لفظ شیعہ منابع رجال میں کسی راوی کے لیے استعمال ہو تو یہ دلالت تضمنی یا التزامی کے تحت اُس کے امامی اور ضابط ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ مطلق عدالت، اسلام اور ایمان کی ایک شاخ ہے اور کسی کافر یا غیر امامی فرقے کے پیروکاروں کو مطلق عادل نہیں کہا جاتا۔ دوسری طرف رجال شیعہ میں راوی کے امامی یا ضابط ہونے کو کم ہی بیان کیا جاتا ہے لہٰذا جب علمائے رجال یہ کہیں کہ فلاں راوی ''عادل'' ہے تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عادل ہونے کے ساتھ شیعہ اثنا عشری اور ضابط بھی ہے۔[2] اس کے باوجود یہ ماننا چاہیے کہ یہ لفظ دلالت کے لحاظ سے پہلے والے لفظ سے زیادہ صریح اور واضح نہیں ہے۔

۱۔ اصول الحدیث واحکامہ ص ۱۵۵

(۱۔۳) **امامی ضابط:** جب کتب رجال میں یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ موجود ہوں یا کسی راوی کے متعلق یہ الفاظ علاحدہ علاحدہ استعمال ہوں تو یہ راوی کی تعریف پر دلالت کرتے ہیں مگر یہ تعریف توثیق کو ثابت نہیں کرتی کیونکہ یہاں روایت کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے راوی کے اخلاق کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔[۱]

(۱۔۴) **ثقہ:** علمائے رجال کی اصطلاح میں لفظ ثقہ عادل کے مترادف ہے۔ یہ لفظ وثوق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اطمینان۔ ثقہ سے مراد وہ راوی ہے جو جھوٹ کی عادت میں مبتلا نہ ہو اور اسے غلطیاں کرنے اور بھولنے والا نہ کہا گیا ہو کیونکہ جھوٹا، غلطیاں کرنے اور بھولنے والے شخص کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی راوی کے ثقہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جھوٹ، غلطی اور بھول چوک کے ساتھ دوسرے گناہوں سے بھی بچتا ہو کیونکہ مثلاً کسی شرابی کی بات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا[۲] لہٰذا جب کتب رجال میں کسی شخص کے لیے مطلقاً ثقہ کا لفظ استعمال ہوا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُس کی عدالت اور ضبط میں کوئی اشکال نہیں۔ البتہ اس سے اُس راوی کا امامی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے یا نہیں اس بارے میں علماء کے بیچ اختلاف ہے۔

(۱۔۵) **ثقة فی الحدیث یا ثقه فی الروایة:** یہ الفاظ بھی ثقہ کے مترادف ہیں اور راوی کے عادل اور ضابط ہونے پر دلالت کرتے ہیں مگر کیا یہ الفاظ امامی ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں یا نہیں؟ یہ غور طلب ہے۔[۳]

(۱۔۶) **حجت:** اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حدیث سے استدلال کرنا درست ہے۔ یہ لفظ اپنے عمومی معنی کے لحاظ سے صحیح، حسن اور موثق بلکہ ضعیف حدیث کو بھی شامل کرتا ہے کیونکہ صحیح حدیث کے علاوہ حدیث کی باقی اقسام سے بھی قرائن کی موجودگی میں احتجاج اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ علمائے رجال کے مطابق حجت، ثقہ کے معنی میں ہے اور یہ لفظ ثقہ کی طرح راوی کے عادل، ضابط اور امامی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔[۴]

۱۔ مقباس الہدایہ ج ۲، ص ۱۴۲

۲۔ ایضاً ص ۱۳۶۔ ۱۳۷

۳۔ ایضاً ص ۱۶۲

۴۔ ایضاً ص ۱۷۰۔ ۱۷۱

(۷۔۱) **عین اور وجہ:** علمائے رجال بعض اوقات ان دونوں الفاظ کو بطور مطلق استعمال کرتے ہیں کبھی وہ کہتے ہیں **من عیون اصحابنا** اور کبھی کہتے ہیں **من وجوہ اصحابنا** فلاں راوی ہمارے اصحاب کی آنکھوں میں سے ہے یا فلاں راوی ہمارے اصحاب کے چہروں میں سے ہے۔ آیت اللہ جعفر سبحانی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ جو شخص منابع رجال کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ دونوں الفاظ لفظ امامی اور لفظ عادل سے بلند تر ہیں اور یہ الفاظ علم وفضل میں درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ راوی امامی گروہ میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم میں آنکھ اور چہرے کو حاصل ہوتی ہے۔[1]

﴿۲﴾ جرح پر دلالت کرنے والے الفاظ

(۱۔۲) جرح کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کے ذریعے راوی کی اخلاقی کمزوریوں کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اُس کی عدالت کی نفی کی جاتی ہے اور اُس کی طرف فسق اور کذب بیانی کی نسبت دی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور سے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں: فاسق، شارب الخمر، کذاب، وضاع الحدیث، یختلق الحدیث کذبا (یعنی وہ جھوٹی احادیث بناتا ہے)۔ بعض اوقات سلبی صورت میں راوی پر جرح کی جاتی ہے اور عام طور سے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں: لیس بعادل، وہ عادل نہیں ہے۔ لیس بصادق وہ سچا نہیں ہے۔ اس طرح کے الفاظ کے ذریعے راوی سے عدالت اور ثقاہت کی نفی کی جاتی ہے۔

(۲۔۲) جرح کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے راوی کا فاسد العقیدہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ شیعہ اثنا عشری مذہب سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے عام طور سے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں: غالی، ناصبی، فاسد العقیدہ۔

(۳۔۲) کچھ الفاظ ایسے بھی رائج ہیں جن میں راوی کے اخلاق یا عقیدے پر براہ راست جرح نہیں کی جاتی بلکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ راوی نقل حدیث کے لیے لازمی شرائط پر پورا نہیں اترتا مثلاً متقدمین لفظ ''ضعیف'' کا اطلاق ایسے راویوں پر کیا کرتے تھے جن کا حافظہ کمزور یا خراب ہوتا تھا۔

۱۔ اصول الحدیث و احکامہ ص ۱۶۲ ۔ ۱۶۳

اگر جرح وتعدیل میں تعارض ہو جائے تو...

منابع رجال کی طرف رجوع کرنے پر کبھی ایک بہت بڑی مشکل بعض راویوں کے متعلق علمائے رجال کے اختلاف کی صورت میں سامنے آتی ہے مثلاً بعض علمائے رجال نے کسی راوی کو ثقہ کہا ہے اور بعض نے اسے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح علمائے رجال میں سے کوئی کسی راوی کو صحیح العقیدہ کہتا ہے اور کوئی اسی کو فاسد العقیدہ کہتا ہے۔ ایسے اختلاف کو اصطلاح میں "تعارض جرح وتعدیل" کہا جاتا ہے۔

علماء نے اس کے حل کے لیے حسب ذیل تین نظریات بیان فرمائے ہیں:

(۱) جرح مطلقاً مقدم ہے۔

(۲) تعدیل مطلقاً مقدم ہے۔

(۳) اگر جرح وتعدیل کو یکجا کرنا ممکن ہو تو دونوں پر عمل کیا جائے ورنہ ترجیحات کی طرف رجوع کیا جائے اور اگر کسی کو ترجیح دینا ممکن نہ ہو تو اُس راوی کے متعلق خاموشی اختیار کرنا چاہیے۔

توثیق کے طریقے

راویوں کی توثیق کے دو طریقے ہیں: ایک "توثیق خاص" اور دوسرا "توثیق عام" کہلاتا ہے توثیق خاص یہ ہے کہ ائمہ طاہرینؑ میں سے کوئی امام یا علمائے رجال کسی مخصوص راوی کو ثقہ قرار دیں۔ توثیق عام یہ ہے کہ کسی مخصوص جماعت کی توثیق کی جائے اور مذکورہ راوی اسی جماعت میں شامل ہو مثلاً کہا جائے کہ اصحاب اجماع، توثیقات عام کا حصہ ہیں۔ اب اگر مذکورہ راوی بھی اُن میں شامل ہے تو اس کی بھی توثیق ہو جائے گی۔ ہم اس بات کو منطق کی زبان میں یوں کہیں گے کہ توثیق خاص، توثیق مطابقی پر دلالت کرتی ہے لیکن توثیق عام کا تمام راویوں کی توثیق پر دلالت کرنا تضمنی ہے لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ ثقاہت کے اثبات کے لیے دلالت مطابقی کی طرح دلالت تضمنی بھی کافی ہے۔[1]

---

[1] معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۴۵

خاص توثیقات

(۱) **معصوم کی طرف سے توثیق :** اگر کوئی معصوم کسی راوی کے ثقہ ہونے کی صراحت کردے تو بلاشبہ اُس کی ثقاہت ثابت ہوجائے گی اور اس طرح کی نص ثابت ہونے کے دو راستے ہیں:

(۱) ذاتی علم کے ذریعے یعنی امام کی محفل میں کسی راوی کی توثیق خود امام کی زبان مبارک سے سن لی جائے مگر امام عصر علیہ السلام کی غیبت میں یہ راستہ ہمارے لیے بند ہو چکا ہے۔

(۲) معتبر روایت کے ذریعے۔ خوش قسمتی سے یہ راستہ ہماری دسترس میں ہے کیونکہ حدیث اور رجال حدیث کے منابع میں اس حوالے سے معتبر روایات موجود ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: علی بن مسیب کا بیان ہے کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے عرض کیا کہ میرا وطن دور ہے اور میں ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ ایسے میں دینی مسائل کس سے پوچھوں؟ امام نے فرمایا کہ تم زکریا بن آدم قمی کی طرف رجوع کرو۔ وہ دین و دنیا دونوں میں ہمارا امین ہے۔ امام نے زکریا بن آدم کو دین و دنیا دونوں میں امین ہونے کی سند عطا فرمائی۔ یہ اُن کے ثقہ ہونے پر بہترین دلیل ہے۔ چونکہ یہ روایت صحیح ہے لہٰذا اس سے زکریا بن آدم کی ثقاہت بدرجہ اتم ثابت ہوجاتی ہے۔[۱]

(۲) **علمائے متقدمین کسی راوی کو ثقہ کہیں:** اس سے بھی کسی راوی کی ثقاہت ثابت ہوتی ہے۔ یہاں متقدمین سے مراد وہ علمائے رجال اور محدثین ہیں جو شیخ طوسی سے پہلے گزرے ہیں مثلاً برقی، ابن قولویہ، کشی، صدوق، مفید، نجاشی اور دیگر علماء۔ اس بنا پر اگر یہ بزرگ علماء کسی کو ثقہ قرار دیں تو اس کی ثقاہت ثابت ہوجائے گی۔

(۳) **علمائے متاخرین کسی راوی کو ثقہ کہیں:** اس سے بھی کسی راوی کی ثقاہت ثابت

۱۔ رجال کشی ص ۴۹۶

ہوجائے گی۔ متاخرین سے مراد شیخ طوسی کے بعد کے علمائے رجال ہیں مثلاً شیخ منتجب الدین رازی (متوفی ۵۸۵ھ) ابن شہر آشوب (متوفی ۵۸۸) علامہ حلی (متوفی ۷۲۶ھ) علامہ مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اور دیگر علمائے متاخرین۔

ثقاہت کے بارے میں علمائے متاخرین کی نص کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ان میں سے کچھ نصوص کا تعلق حِس سے ہے مثلاً علم رجال کے بارے میں شیخ منتجب الدین اور ابن شہر آشوب کا نظریہ۔ یہ بزرگ علماء اگرچہ راویوں کے ہم عصر نہیں تھے مگر اُن کے قریب العصر ضرور تھے۔

(۲) توثیق کی کچھ دوسری نصوص علمائے رجال کے حدس پر مبنی ہے۔ علامہ حلی کے بعد کے علمائے رجال کا یہی نظریہ ہے۔ اس میں میرزا استر آبادی، سید تفرشی، محقق اردبیلی، قہپائی، علامہ مجلسی اور آیت اللہ خوئی جیسے بزرگ علماء شامل ہیں۔

(۴) **علمائے رجال کی طرف سے اجماع کا دعوی:** جس طرح علمائے متقدمین میں سے کوئی عالم کسی راوی کی ثقاہت کی تصریح کرے تو اسے ثقہ سمجھا جائے گا اسی طرح اگر علمائے متقدمین میں سے کوئی عالم یہ دعویٰ کرے کہ فلاں راوی کی ثقاہت پر اجماع ہے تو یہ دعویٰ حجت ہے اور اگر کسی ایسے آدمی کی طرف سے جس کا قول خبر واحد کے باب میں حجت ہو تب بھی حجیت ثابت ہوگی۔[۱]

۱۔ فرائد الاصول ج۱، ص ۷۷۔ ۱۰۴

عام توثیقات

خاص توثیقات کے علاوہ ثقاہت ثابت ہونے کے اور بھی طریقے ہیں کہ راویوں کو عام اور ضمنی صورت میں اور عناوین کلی کے قالب میں پیش کیا جائے جیسا کہ "اصحابِ اجماع" کو ثقہ کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی توثیق کو عام توثیقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

﴿۱﴾ اصحاب اجماع

اصحابِ اجماع کا عنوان ۲۲ ذی مرتبہ راویوں پر محیط ہے۔ اسے توثیقات عام میں سب سے اہم اور وسیع توثیق سمجھا جاتا ہے۔ علم رجال کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عمر کشی (متوفی ۳۲۹ھ) نے پہلی بار اپنی کتاب رجالِ کشی میں اصحاب اجماع پر گفتگو کی تھی۔[۱]

اصحابِ اجماع کے اسمائے گرامی

محمد بن عمر کشی نے اصحابِ اجماع میں حسب ذیل راویوں کے نام بیان کئے ہیں:

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں کے چھ اصحاب کے نام یہ ہیں:

(۱) زرارہ بن اَعیَن (۲) معروف بن خرّبوذ

(۳) برید بن معاویہ (۴) ابوبصیر اسدی

(۵) فضیل بن یسار (۶) محمد بن مسلم

۱۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۵۹

امام جعفر صادقؑ کے یہ چھ اصحاب بھی اس میں شامل ہیں :

(۱) جمیل بن درّاج (۲) عبداللہ بن مسکان

(۳) عبداللہ بن بکیر (۴) حماد بن عثمان

(۵) حماد بن عیسیٰ (۶) ابان بن عثمان

امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کے یہ چھ اصحاب بھی اس میں شامل ہیں :

(۱) یونس بن عبدالرحمان (۲) صفوان بن یحییٰ

(۳) محمد بن ابی عمیر (۴) عبداللہ بن مغیرہ

(۵) حسن بن محبوب (۶) احمد بن محمد بن ابی نصر

اس طرح اصحابِ اجماع کی تعداد ۱۸ ہوجاتی ہے۔ کچھ علماء پہلے گروہ میں ابو بصیر اسدی کی بجائے ابو بصیر مرادی کو شامل کرتے ہیں اور تیسرے گروہ میں حسن بن محبوب کی جگہ حسن بن علی بن فضال کو یا فضالہ بن ایوب کو یا ان کی جگہ عثمان بن عیسیٰ کو شامل کرتے ہیں۔ اگر ہم مذکورہ چاروں افراد یعنی ابو بصیر مرادی، حسن بن علی بن فضّال، فضالہ بن ایوب اور عثمان بن عیسیٰ جن کے بارے میں اختلاف ہے کو بھی اصحابِ اجماع میں شمار کریں تو ان کی تعداد ۱۸ کی بجائے ۲۲ ہوجاتی ہے۔ ائمہ طاہرینؑ کے مذکورہ اصحاب کی روایات کے صحیح ہونے پر علماء کا اجماع ہے لہٰذا انھیں اصطلاحی طور پر ''اصحابِ اجماع'' کہا جاتا ہے۔[۱]

اصحابِ اجماع کی روایات کو ''صحیح'' سمجھنے کا مطلب

اس سلسلے میں رجالِ کشّی کی عبارت یہ ہے : **اجمعت العصابة علی تصحیح ما یصح عنھم**

اس جملے میں **اجمعت العصابة علی تصحیح** کا مفہوم واضح ہے یعنی گروہ علماء نے اُن کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے۔ اس کے بعد کے جملے **ما یصح عنھم** کا مفہوم واضح نہیں۔

اس کے متعلق دو احتمالات ہو سکتے ہیں :

(۱) ان افراد کی نقل اور حکایت کو صحیح سمجھا جائے یعنی اصحابِ اجماع نے ائمہ طاہرینؑ سے جتنی روایات نقل کی ہیں ہم اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم انھیں ثقہ جانتے ہیں۔ اس صورت میں

۱۔ کلیات فی علم الرجال ص ۱۶۸ ۔ ۱۷۰

اصحابِ اجماع، توثیقاتِ عام کے زمرے میں شامل ہوں گے جیسا کہ کچھ علماء کی رائے ہے۔

(۲) اُن کی بیان کردہ روایات صحیح ہیں۔ یعنی اصحابِ اجماع نے ائمہ طاہرینؑ سے جتنی روایات نقل کی ہیں ہم اُن کو ائمہ طاہرینؑ سے صادر شدہ اور صحیح سمجھیں۔ اگر نقل شدہ روایت کی سند متصل نہ ہو یا اُس میں صحت کی دوسری شرائط مثلاً راوی کی عدالت اور ایمان ثابت نہ ہو تب بھی اصحابِ اجماع کی توثیق کی وجہ سے اس کو بلند پایہ روایت قرار دیں کیونکہ اس دعوے کا مطلب یہ ہے کہ اصحابِ اجماع نہ صرف خود ثقہ اور عادل ہیں بلکہ وہ ائمہ طاہرینؑ سے صادر شدہ روایت کے علاوہ کچھ نقل ہی نہیں کرتے۔[۱]

﴿۲﴾ مشائخِ ثقات

علمائے رجال نے کچھ راویوں کو مشائخِ ثقات کے نام سے یاد کیا ہے۔ ذیل میں ہم اُن کا تعارف بیان کرتے ہیں:

(۱۔۲) **محمد بن ابی عمیر** (متوفی ۲۱۷ھ): ان کو محمد بن زیاد بزاز یا ازدی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ وہ بغداد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ سے احادیث سنی تھیں۔ وہ شیعیت کا چہرہ شمار ہوتے تھے اور مخالفین انھیں اپنے دور کا ''اوتاد'' یعنی ولی اللہ سمجھتے تھے۔ محمد ازدی، عباسی حکمرانوں ہارون اور مامون کے زمانے میں گرفتار ہوئے اور اُن پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ وہ مسلسل چار برس تک قید میں رہے۔ اس دوران محمد ازدی کی بہن نے اپنے بھائی کو حکومت کے مزید تشدد سے بچانے کے لیے اُن کی حدیث کی کتابوں کو زمین میں دفن کردیا تھا۔ محمد ازدی کی طویل قید کی وجہ سے اُن کی کتابیں بوسیدہ ہوگئیں۔ جب وہ قید سے رہا ہوئے تو اپنی یادداشت کے زور پر احادیث نقل کیا کرتے تھے اسی لیے شیعہ محدثین اُن کی مرسل روایات کو بھی مسند روایات کا درجہ دیتے ہیں۔[۲]

(۲۔۲) **صفوان بن یحیی بیاع سابری** (متوفی ۲۱۰ھ): نجاشی کہتے ہیں کہ وہ کوفی تھے اور گروہ ثقات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے امام علی رضاؑ سے احادیث نقل کی تھیں اور امام کے ہاں اُن کا بڑا مقام تھا۔ کشی نے انھیں امام موسیٰ کاظمؑ کا صحابی شمار کیا ہے۔ امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ نے انھیں اپنا وکیل

۱۔ کلیات فی علم الرجال ص ۱۶۸۔ ۱۶۹

۲۔ رجال نجاشی ص ۳۲۶۔ فہرست شیخ طوسی ص ۱۶۸

مقرر کیا تھا۔ وہ اپنے طبقے میں تقویٰ کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔

صفوان بن یحییٰ کی مراسیل روایات کو اُس کی مسانید کے برابر سمجھنے اور اُن کے جملہ شیوخ کو ثقہ سمجھنا توثیقات عام کا تقاضا ہے مگر یہ بات اس لیے محلِ اشکال ہے کہ انھوں نے ضعیف راویوں سے بھی روایات نقل کی ہیں۔[۱]

(۳۔ ۲) **احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی** (متوفی ۲۲۱ھ): نجاشی لکھتے ہیں کہ وہ کوفہ کے رہائشی تھے اور انھیں امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ سے ملاقات کا شرف حاصل تھا اور ان دو ائمہ طاہرینؑ کی نظر میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ اس کے بعد نجاشی نے ان کی کتابوں کو شمار کیا ہے۔[۲]

شیخ طوسی فرماتے ہیں کہ بزنطی اُن تین فقہاء میں سے ہیں جو صرف ثقہ افراد ہی سے روایات نقل کرتے تھے۔[۳] آیت اللہ ابو القاسم خوئی کی تحقیق کے مطابق کتب اربعہ میں بزنطی سے ۷۸۸ سے زیادہ روایات نقل کی گئی ہیں۔ آیت اللہ خوئی نے اُن کے مشائخ کی تعداد ۱۱۵ بیان کی ہے۔ ان میں سے ۵۳ ثقہ اور باقی مشائخ میں سے کچھ مہمل، کچھ مجہول اور کچھ ضعیف تھے۔[۴]

بزنطی نے ان ضعیف افراد سے روایت کی ہے:

مفضل بن صالح، حسن بن علی بن ابی حمزہ، عبداللہ بن محمد شامی اور عبدالرحمان بن سالم وغیرہ۔
معلوم ہوتا ہے کہ آیت اللہ خوئی، شیخ طوسی کے اس بیان سے متفق نہیں ہیں کہ بزنطی نے غیر ثقہ افراد سے روایت نقل نہیں کی تھی۔[۵]

(۴۔ ۲) **احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی**: یہ اُن محدثین میں سے ہیں جو محمد بن ابی عمیر کی طرح ثقات کے علاوہ کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے تمام مشائخ ثقہ تھے اور اُن کی مرسل روایات بھی ثقہ کے حکم میں ہیں۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے احمد بن محمد بن خالد برقی کو شہر قم سے اس لیے باہر نکالا تھا کہ وہ ضعیف راویوں سے روایات نقل کیا کرتے تھے۔

۱۔ کلیات فی علم الرجال ص ۲۵۱ ۔ ۲۵۸

۲۔ رجال نجاشی ص ۷۵

۳۔ کلیات فی علم الرجال ص ۲۵۹

۴۔ معجم رجال الحدیث ج ۳، ص ۲۳ ۔ ۲۴

۵۔ کلیات فی علم الرجال ص ۲۵۹ ۔ ۲۶۳

برقی کے متعلق بعد میں اُن کا نظریہ بدل گیا۔ انھوں نے برقی سے معذرت کی اور پابرہنہ اُن کے تشیع جنازہ میں شریک ہوئے۔ علامہ حلی فرماتے ہیں کہ جب احمد قمی نے برقی کو ضعیف روایات بیان کرنے پر قم سے نکال دیا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ خود ضعیف راویوں سے روایت نہیں کرتے تھے۔[1]

(۵ ۔ ۲) **بنو فضال:** یہ گروہ حسب ذیل راویوں پر مشتمل ہے:

علی بن حسن بن علی بن فضال۔

اُن کے دو بھائی احمد اور محمد۔

اُن کے والد حسن بن علی بن فضال۔

شروع میں ان لوگوں کا عقیدہ صحیح تھا مگر بعد میں وہ ''فرقہ فطحیہ'' میں شامل ہو گئے۔[2]

جب یہ لوگ صحیح عقیدہ رکھتے تھے تب انھوں نے ائمہ طاہرینؑ سے روایات سنی تھیں اور اُن کو نقل کیا تھا۔ اُن کے انحراف کے بعد شیعہ محدثین نے امام حسن عسکریؑ سے اس بارے میں پوچھا تو امام نے فرمایا: **خذوا ماروووا و ذروا ماراوا** یعنی اُن کی بیان کردہ روایات کو لے لو اور اُن کی خود ساختہ آراء کو چھوڑ دو۔[3]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے تصریح کی ہے کہ بنو فضال کی روایات قابل عمل ہیں اگرچہ وہ خود فاسد العقیدہ ہیں۔

﴿۳﴾ کتاب کامل الزیارات کی اسناد میں موجود راوی

ابو القاسم جعفر بن محمد بن قولویہ (متوفی ۳۶۷ھ یا ۳۶۹ھ) شیخ مفید کے استاد تھے۔ اُن کا شمار شیعہ فقہ و حدیث کے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ نجاشی نے انھیں ثقاتِ اصحاب اور بزرگانِ فقہ و حدیث میں سے قرار دیا ہے۔[4] نجاشی کے بعد تمام علمائے رجال نے اُن کی ثقاہت، عظمت اور اُن کے علمی و

۱۔ خلاصۃ الاقوال ص ۱۴۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۶۹ ۔ ۷۰۔ کلیات فی علم الرجال ص ۲۷۵

۲۔ رجال خاقانی ص ۲۱۵۔

فطحیہ شیعوں کا ایک فرقہ تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ کی بجائے اُن کے بھائی عبداللہ افطح کو امام مانتا تھا۔

(اصول الحدیث و احکامہ ص ۲۶۹ بحوالہ فرق الشیعہ ص ۸۸ ۔ ۸۹)

۳۔ خاتمہ المستدرک ج ۴، ص ۲۶۹۔ ص ۴۵۰۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۶۷

۴۔ رجال نجاشی ص ۱۲۳

معنوی مقام کی گواہی دی ہے۔ کتاب ''کامل الزیارات'' انہی کی تالیف ہے جو شروع دن سے آج تک شیعہ حدیث کا اہم ماخذ اور شیعہ علماء کا قابل وثوق مرجع سمجھی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی روایات کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی دلیل ابن قولویہ کی وہ بات ہے جو انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں تحریر کی ہے کہ

میں نے اس کتاب میں اُن روایات کو نقل کیا ہے جنھیں ہمارے ثقہ اصحاب نے بیان کیا ہے۔ میں نے پوری کتاب میں شاذ اور غیر مشہور راویوں سے کوئی روایت نقل نہیں کی ہے۔[1] اس تحریر اور ثقہ شہادت کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں جتنے بھی اسناد بیان کئے گئے ہیں وہ سب ثقہ تھے۔

﴿۴﴾ تفسیر علی بن ابراہیم قمی کے راوی

علی بن ابراہیم قمی مشہور شیعہ محدث گزرے ہیں۔ نجاشی نے کہا ہے کہ علی بن ابراہیم ثقہ، ضابط قابلِ اعتماد اور صحیح العقیدہ عالم تھے۔ انھوں نے سماع کے ذریعے احادیث حاصل کی تھیں۔ انھوں نے بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں اور کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔[2]

اُن کی عظمت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ محمد بن یعقوب کلینی کے استاد تھے۔ کلینی نے الکافی میں ۷۰۶۸ روایات انہی سے نقل کی ہیں۔[3] علی بن ابراہیم کی جو کتاب زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہی وہ اُن کی تفسیر ''تفسیر قمی'' ہے۔ یہ روائی تفسیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں جتنے بھی راویوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں اُن سب کی علی بن ابراہیم نے توثیق کی ہے اسی لیے سب کی ثقاہت کو تسلیم کیا جاتا ہے اگرچہ اس دعوے پر اشکال بھی کیا گیا ہے۔[4]

﴿۵﴾ مشائخ اجازہ

حدیث کے کچھ راوی اصل روایت کو یا اپنی کتاب کو نقل کرنے کی دوسروں کو اجازت دیتے ہیں، ایسے محدثین کو مشائخ اجازہ کہا جاتا ہے۔ اجازۂ حدیث اس شخص کے روایت احادیث میں بلند مرتبہ

۱۔ کامل الزیارات ص ۴

۲۔ رجال نجاشی ص ۲۶۰

۳۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۵۴

۴۔ ایضاً۔ کلیات فی علم الرجال ص ۳۱۳۔۳۱۶

ہونے پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ مشائخ اجازہ ، ثقات میں شمار ہوتے تھے چنانچہ اُن کے متعلق کسی نئی توثیق کی ضرورت نہیں یہاں تک کہ اگر اُن کا نام منابع رجال میں موجود نہ ہو تب بھی انھیں ثقہ سمجھا جائے گا۔ اس بنا پر شیخ کلینی ، شیخ صدوق اور شیخ طوسی ... وغیرہ مشائخ اجازہ ثقہ قرار پاتے ہیں۔

آیت اللہ خوئی اس نظریے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ثقاہت اور شیخ اجازہ ہونا لازم وملزوم نہیں۔ اجازہ ، حصول حدیث کے باقی طریقوں مثلاً سماع اور قرائت ... کی مانند ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ راوی اس حدیث یا کتاب کی طرف استناد کرنے میں سچا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس کا شیخِ حدیث بھی ثقہ ہے۔

کچھ مشائخ اجازہ ایسے بھی گزرے ہیں جو ثقہ نہیں تھے مثلاً حسن بن محمد بن یحییٰ اور حسین بن حمدان حصینی۔ یہ دونوں مشائخ اجازہ تھے مگر اس کے باوجود نجاشی نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

۱۔ معجم رجال الحدیث ج ۱، ص ۷۳

چوتھی بحث

شیعہ رجال کے منابع

شیعہ منابع رجال کو تاریخی ادوار اور اثرات کے لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا گروہ: شیعہ رجال کے اولین منابع۔ یہ منابع تیسری صدی سے پانچویں صدی کے درمیان منظر عام پر آئے اور اس گروہ میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) رجال کشی
(۲) فہرست نجاشی
(۳) رجال شیخ طوسی
(۴) فہرست شیخ طوسی
(۵) رجال برقی
(۶) رسالہ ابو غالب زراری
(۷) رجال ابن غضائری

دوسرا گروہ: شیعہ رجال کے ثانوی منابع۔ یہ منابع چھٹی صدی سے آٹھویں صدی کے درمیان منظر عام پر آئے اور اس گروہ میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) فہرست شیخ منتجب الدین
(۲) معالم العلماء ابن شہر آشوب
(۳) رجال ابن داؤد
(۴) خلاصۃ الاقوال علامہ حلی

تیسرا گروہ: یہ شیعہ رجال کے آخری منابع پر مشتمل ہے۔ اس میں دسویں صدی سے موجودہ صدی تک کی کتب رجال شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) مجمع الرجال قہپائی
(۲) نقد الرجال تفرشی
(۳) جامع الرواۃ اردبیلی
(۴) رجال سید بحر العلوم
(۵) تنقیح المقال مامقانی
(۶) قاموس الرجال شوستری
(۷) معجم رجال الحدیث ابو القاسم خوئی

شیعہ رجال کے اولین منابع

(۱) **رجال کشّی** (متوفی ۳۲۹ھ): ابو عمرو محمد بن عمر بن عبدالعزیز المعروف کشی کی علم رجال پر کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ رجال شیعہ پر یہ پہلی کتاب تھی۔ یہ کتاب **معرفۃ الرجال** اور **معرفۃ الناقلین عن الائمۃ الصادقین** کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی نے کشی کے علمی مقام کے پیش نظر اس کتاب کی تلخیص لکھی جس کا نام انھوں نے **اختیار معرفۃ الرجال** رکھا۔

یہ کتاب میر داماد کی تصحیح و تعلیق اور سید مہدی روحانی کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں حدیث یاد کرنے کی فضیلت پر گیارہ احادیث تحریر ہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر امام حسن عسکریؑ کے دور تک کے شیعہ راویوں کا تاریخی لحاظ سے تذکرہ کیا گیا ہے اور ہر راوی کی چند روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ عبد اللہ مامقانی کی کتاب مقباس الہدایہ فی علم الدرایہ کے مطابق اس کتاب میں ۱۱۵۱ راویوں کے حالات پر بحث کی گئی ہے۔

(۲) **رجال نجاشی** (متوفی ۴۵۰ھ): اس کتاب کا پورا نام **فہرس اسماء مصنفی الشیعۃ** ہے اس کتاب کو فہرست یا رجال نجاشی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ابو العباس احمد بن علی بن احمد بن عباس نجاشی اسدی کوفی کی تالیف ہے جو نامور شیعہ محدث اور علم رجال کے ماہر تھے۔

اُن کی علمی جلالت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کی کتاب کو رجال شیعہ کے اولین منابع میں سے بہترین منبع کا درجہ حاصل ہے اور راویوں کے متعلق اُن کی رائے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔

رجال نجاشی میں صرف شیعہ رجال پر بحث کی گئی ہے اور اہل سنت کے صرف اُن راویوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے شیعہ راویوں سے احادیث نقل کی تھیں یا شیعی علوم کی خدمت کے لیے کوئی کتاب لکھی تھی مثلاً اس کتاب میں مدائنی اور طبری کا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ نجاشی نے اکثر راویوں پر جرح و تعدیل کی ہے البتہ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں انھوں نے راوی کی تعریف اور مذمت کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ یہ کتاب سید موسیٰ شبیری زنجانی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوئی ہے اور اس میں ۱۲۶۹ راویوں پر تحقیق پیش کی گئی ہے۔

(۳) **رجال شیخ طوسی** (متوفی ۴۶۰ھ): شیخ طوسی کی یہ کتاب اور اُن کی کتاب فہرست کے متعلق خود انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ شیخ فاضل کی درخواست پر لکھی گئی ہیں۔

یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ۶۴۲۹ راویوں پر بحث کی گئی ہے۔ شیخ طوسی نے اس کتاب میں بالترتیب راویان صحابہ، راویان امیرالمومنینؑ اور راویان امام حسن مجتبیٰؑ ... کا تذکرہ کیا ہے اور قارئین کی سہولت کے لیے انھیں حروف تہجی کے مطابق تحریر کیا ہے۔ آخری باب میں انھوں نے اُن راویوں کے نام بیان کئے ہیں جنھوں نے کسی امام سے روایت نقل نہیں کی۔ انھوں نے ہر باب کے آخر میں حرف ''یا'' (آخری راوی) کے بعد دو حصوں میں صاحبان کنیت راویوں نیز خواتین راویوں کا تذکرہ کیا ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ طوسی چاہتے تھے کہ اس کتاب میں ائمہ طاہرینؑ سے روایت کرنے والے تمام راویوں کا ان کے مذہب سے قطع نظر تعارف کرائیں اسی لیے انھوں نے راویان پیغمبرؐ میں معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن عاص کا ذکر بھی کیا ہے اور اصحاب امیرالمومنینؑ کے ضمن میں ابن زیاد کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ کتاب جواد قیومی اصفہانی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

(۴) **فہرست شیخ طوسی:** یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں ۹۱۲ راویوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب میں سب سے پہلے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اور آخر میں ابن عصام کا ذکر ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ صاحبانِ کتاب کا تعارف کرایا جائے یا اصول کی پہچان کرائی جائے۔ شیخ طوسی نے ہر ایک کا نام ذکر کرنے کے بعد عموماً اس پر جرح وتعدیل بھی کی ہے اسی لیے اس کتاب کو رجال کے مآخذ کا درجہ حاصل ہے۔ شیخ طوسی نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب سے پہلے ''فہرست'' کے نام سے جو کتابیں چھپی ہیں وہ ناقص ہیں اور اس کتاب میں اُن کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ابوالحسین احمد بن حسین بن عبیداللہ (المعروف ابن غضائری) کی دو کتابوں کا ذکر بھی ہے جن میں سے ایک کا تعلق اصول سے اور دوسری کا تعلق مصنفات سے ہے۔[۱]

یہ کتابیں اگرچہ نسبتاً جامع تھیں مگر اُن کے ورثاء کی کوتاہی کی وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ فہرست طوسی جواد قیومی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہو چکی ہے۔

(۵) **رجال برقی** (متوفی ۲۷۴ھ یا ۲۸۰ھ): ابوجعفر احمد بن محمد بن خالد بن عبدالرحمان بن محمد برقی تیسری صدی کے شیعہ علماء میں سے تھے۔ وہ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے دادا محمد بن علی کو

۱۔ فہرست شیخ طوسی ص ۳۱

حضرت زید شہید کی حمایت کے جرم میں حاکم کوفہ یوسف بن عمر نے گرفتار کر کے قید کر دیا تھا۔ بعدازاں انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد برقی اپنے بھائی عبدالرحمان کے ساتھ بھاگ کر قم کے نزدیک ایک گاؤں ''برق رود'' آ گئے۔

رجال برقی کی تالیف رجال شیخ کے طرز پر کی گئی ہے۔ برقی نے رسول خدا ﷺ سے لے کر امام زمانہ تک کے جملہ راویوں کا بالترتیب تعارف پیش کیا ہے اور آخر میں رسول خدا ﷺ کے اُن بارہ اصحاب کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے مسجد نبوی میں جمعہ کے دن حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کھڑے ہو کر اُن کی خلافت پر اعتراض کیا تھا۔

اس کتاب میں مجموعی طور پر ۱۷۰۷ راویوں پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب جواد قیومی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

(۶) **رسالہ ابو غالب زراری** (متوفی ۳۶۸ھ) : احمد بن محمد بن ابو طاہر بن بکیر بن اَعیَن کو زراری، بکیری اور شیبانی بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پا گئے اور نجف اشرف میں مدفون ہیں۔ اُن کا تعلق خاندان اعین سے تھا اس لیے اس رسالے میں مؤلف نے اپنے خاندان کے محدثین کا تعارف کرایا ہے۔

زراری نے یہ رسالہ اپنے نواسے محمد بن عبداللہ کے لیے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے ۲۰ سے زائد مشائخ کا نام لیا ہے اور آخر میں رقم ۱۲۲ پر جن مؤلفین سے روایت کی ہے اُن کے نام لکھے ہیں۔ یہ رسالہ محمد رضا حسینی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کو ''تاریخ آل زرارہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

(۷) **رجال ابن غضائری** (متوفی ۴۵۰ھ) : ان کا نام احمد بن حسین بن عبیداللہ ہے مگر یہ ابن غضائری کے نام سے مشہور تھے۔ وہ چوتھی اور پانچویں صدی کے ایک معروف شیعہ عالم تھے۔ اُن کے والد حسین بن عبیداللہ اسدی واسطی (متوفی ۴۱۱ھ) مشہور شیعہ بزرگ اور مشائخ میں سے تھے۔ شیخ طوسی نے انھیں کثیر السماع (بہت زیادہ احادیث سننے والا) اور ''عارف بالرجال'' (علم رجال کا ماہر) کے ناموں سے یاد کیا ہے۔[۱]

ابن غضائری کی تاریخِ وفات معلوم نہیں البتہ اُن کی مختصر عمر (جو کہ چالیس سال سے بھی کم تھی)

۱۔ رجال شیخ طوسی ص ۴۲۵

اور اُن کے والد کی تاریخِ وفات کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انتقال ۴۵۰ھ میں ہوا ہوگا۔[1]

ابن غضائری کی اس کتاب کو ''کتاب الجرح'' اور ''کتاب الضعفاء'' بھی کہا جاتا ہے جبکہ اس کا مشہور ترین نام رجال ابن غضائری ہے۔ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب عبیداللہ ابن غضائری کی ہے یا اُن کے پوتے احمد بن حسین کی ہے۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب ابن غضائری کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مؤلف نے اس کتاب میں راویوں کی تضعیف میں بہت افراط سے کام لیا ہے اور بہت کم راویوں کی توثیق کی ہے۔ چنانچہ سید داماد اس کے متعلق کہتے ہیں: بہت ہی کم راوی ایسے ہیں جو ابن غضائری کی جرح سے محفوظ رہے ہوں اور بہت کم ثقہ ایسے ہیں جو اُس کی قدح سے بچ گئے ہوں۔[2]

یہ کتاب سید محمد رضا حسینی جلالی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اس میں صرف ۲۲۵ راویوں پر بحث کی گئی ہے۔

شیعہ رجال کے ثانوی منابع

(۱) **فہرست شیخ منتجب الدین** (متوفی ۶۰۰ھ): اس کتاب کا پورا نام **فہرست اسماء علماء الشیعة و مصنفیهم** ہے (یعنی شیعہ علماء اور اُن کی تصنیفات کی فہرست)۔ یہ کتاب منتجب الدین علی بن عبیداللہ رازی کی تالیف ہے۔ مؤلف نے کتاب کے مقدمہ میں تالیف کی غرض یوں بیان کی ہے: ایک دن سید عزالدین یحییٰ نقیب کے سامنے شیخ طوسی کی کتاب فہرست کا ذکر چھڑا تو انھوں نے فرمایا کہ شیخ طوسی نے اپنے زمانے تک کے تمام شیعہ مشائخ اور اُن کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے مگر اس کے بعد اس موضوع پر کوئی کتاب تالیف نہیں ہوئی۔ میں اُن کا اشارہ سمجھ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں شیخ طوسی کے کام کو آگے بڑھاؤں گا اور میں شیخ طوسی سے لے کر آج تک کے تمام علماء و مشائخ کا تذکرہ لکھوں گا۔[3]

چنانچہ انھوں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا اور فہرست نامی کتاب لکھی۔ اس میں انھوں نے ۴۸۰ھ سے ۶۰۰ھ تک کے علماء اور مشائخ کی فہرست لکھی۔ اس کتاب میں ۵۵۳ شیعہ علماء کے نام موجود ہیں اور یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہوئی ہے۔

۱۔ رجال ابن غضائری ص ۱۵ - ۱۶

۲۔ سماء المقال ص ۲۲

۳۔ فہرست شیخ منتجب الدین ص ۵ - ۶

مؤلف نے اس کتاب میں شیعہ علماء کے نام کے ساتھ اُن کی کتابوں کا بھی تعارف کرایا ہے اور اُن کی علمی شخصیت مثلاً فقیہ، ادیب، مناظر ... وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے۔ پھر اُن پر جرح و تعدیل کی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر تعدیل ہی کی ہے۔

یہ کتاب سید جلال الدین محدث ارموی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

(۲) **معالم العلماء ابن شہر آشوب** (متوفی ۵۸۸ھ): اس کتاب کا پورا نام **معالم العلماء فی فهرست کتب الشیعة و اسماء المصنفین** ہے۔ یہ کتاب محمد بن علی بن شہر آشوب مازندرانی (۴۸۹ھ تا ۵۸۸ھ) کی تالیف ہے۔ مرحوم نے ۹۹ برس کی عمر پائی تھی۔[۱]

اس کتاب میں ۱۰۲۱ شیعہ علماء کا تذکرہ موجود ہے جس میں شیخ طوسی کے دور سے لے کر مؤلف کے زمانے تک کے علماء شامل ہیں جیسا کہ ہم نے فہرست منتجب الدین کے تعارف میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح یہ کتاب بھی اسی مقصد کے پیش نظر معرض وجود میں آئی۔ اس میں رجال شیعہ اور اُن کی تالیفات کو بیان کیا گیا ہے۔ مؤلف نے کتاب کے آخر میں ایک پورا باب اہل بیت طاہرینؑ کے مشہور شعراء کے ذکر کے لیے مخصوص کیا ہے۔ یہ کتاب ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

(۳) **رجال ابن داود** (متوفی ۷۰۷ھ): تقی الدین حسن بن علی بن داؤد حلی ۶۴۷ھ کو حلہ شہر میں پیدا ہوئے اور ۷۰۷ھ میں انتقال کر گئے۔ اس کتاب میں رجال کے متعلق شیخ طوسی، کشی، نجاشی، برقی اور ابن غضائری کے نظریات کو نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب سے لکھی گئی ہے۔[۲] یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں موثق اور مہمل راویوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں مجروح اور مجہول راویوں پر بحث کی گئی ہے۔ مؤلف کے نظریے کے مطابق آغاز موثق راویوں سے ہونا چاہیے۔ مؤلف نے آغاز میں اپنے اسناد کو شیخ طوسی، شیخ صدوق اور شیخ مفید ... تک بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

(۴) **خلاصة الاقوال علامه حلی** (متوفی ۷۲۶ھ): علامہ حلی کا پورا نام حسن بن یوسف بن مطہر حلی ہے۔ آپ ۶۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۶ھ میں وفات پا گئے۔ آپ ایک جلیل القدر شیعہ عالم اور شہرۂ آفاق علمی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے مختلف اسلامی علوم بالخصوص فقہ، کلام اور رجال

۱۔ مقدمہ معالم العلماء بقلم سید محمد صادق آل بحر العلوم ص ۱-۶

۲۔ ابن داؤد کے حالات جاننے کے لیے دیکھیے: مقدمہ رجال ابن داؤد، بقلم سید محمد صادق آل بحر العلوم ص ۵ - ۱۲

پرگراں قدر کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ حلی نے رجال پر ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی تھی جس کا نام **کشف المقال فی معرفة الرجال** رکھا اور آپ اسے ''رجال کبیر'' کے نام سے یاد کرتے تھے مگر افسوس کہ یہ کتاب زمانے کے دستبرد کا شکار ہوگئی۔ اس وقت ''خلاصة الاقوال'' کے نام سے اس کی تلخیص موجود ہے علامہ نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کرکے پہلے حصے میں ثقہ راویوں کا اور دوسرے حصے میں متوقفین (یعنی جن راویوں پر رک جانا چاہیے) کا ذکر کیا تھا۔ اس سے اِن کی مراد وہ افراد تھے جن کی بیان کردہ احادیث پر عمل کرنا صحیح نہیں۔ یہ کتاب جواد قیومی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

شیعہ رجال کے اولین منابع

مجمل خصوصیات	جلد	ولادت/وفات	مؤلف	کتاب
۱۱۵۱ راویوں پر تحقیق	۲	۳۴۰	محمد بن عمر بن عبدالعزیز کشی	رجال کشی
۱۲۶۹ راویوں پر تحقیق	۱	۴۵۰	ابو العباس احمد بن علی نجاشی	رجال نجاشی
۲۶۲۹ راویوں پر تحقیق	۱	۴۶۰	شیخ طائفہ محمد بن حسن طوسی	رجال شیخ طوسی
۹۱۲ راویوں پر تحقیق	۱	۴۶۰	شیخ طائفہ محمد بن حسن طوسی	فہرست شیخ طوسی
۱۷۰۷ راویوں پر تحقیق	۱	۲۷۴ یا ۲۸۰	ابوجعفر احمد بن محمد بن خالد برقی	رجال برقی
آل زرارہ کے راویوں پر تحقیق	۱	۳۶۸	ابو غالب احمد بن محمد بن اعین زراری	رسالہ ابو غالب زراری
۲۲۵ راویوں پر تحقیق	۱	۴۵۰	احمد بن حسین بن عبید اللہ غضائری	رجال ابن غضائری

شیعہ رجال کے ثانوی منابع

مجمل خصوصیات	جلد	ولادت/وفات	مؤلف	کتاب
۵۵۳ شیعہ علماء کا تعارف	۱	۶۰۰	منتجب الدین اعلی بن عبید اللہ رازی	فہرست شیخ منتجب الدین
۱۰۲۱ شیعہ علماء کا تعارف	۱	۵۸۸	ابن شہر آشوب مازندرانی	معالم العلماء
موثق و مجروح راویوں تعارف	۱	۷۰۷	تقی الدین حسن بن علی بن داؤد حلی	رجال ابن داؤد
علامہ حلی کی رجال کبیر کی تلخیص	۱	۷۲۶	حسن بن یوسف بن مطہر علامہ حلی	خلاصۃ الاقوال

شیعہ رجال کے آخری منابع

(۱) **مجمع الرجال قہپائی** (متوفی ۹۹۳ھ) : عنایت اللہ علی قہپائی کی اس کتاب کا پورا نام **مجمع الرجال الحاوی لذکر المترجمین فی الاصول الخمسة الرجالیة** ہے۔ انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے:

علم رجال کے پانچ بنیادی منابع یعنی رجال کشی، رجال شیخ طوسی، فہرست شیخ طوسی، رجال نجاشی اور رجال ابن غضائری کے مطالعہ کے بعد مجھے لگا کہ ان کتابوں میں مضامین جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جس سے قارئین کو رجال پر تحقیق میں بڑی زحمت اٹھانی پڑتی ہے چنانچہ میں ان کتابوں کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے اور تمام راویوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے ہیں تاکہ قارئین کو تحقیق میں سہولت ہو۔ اس کتاب میں ہر راوی کے بارے میں مذکورہ پانچوں کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے میں نے یہاں یکجا کردیا ہے۔ نیز یہ کہ مذکورہ کتابوں کے پورے نام لکھنے کی بجائے اشارے مقرر کئے ہیں مثلاً "کشی" کے لیے "کش" اور ابن غضائری کے رجال کے لیے "غض"... لکھا ہے۔

انھوں نے اپنی اس کتاب کا نام مجمع الرجال رکھا تھا۔[۱] اس لیے اسے الگ کتاب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ مرحوم قہپائی نے سابقہ پانچ کتابوں کو یکجا کیا تھا۔[۲]

یہ کتاب سید ضیاء الدین اصفہانی کی تحقیق کے ساتھ سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) **نقد الرجال** : اس کتاب کے مؤلف سید مصطفیٰ یعنی تفرشی ہیں جو تقریباً گیارہویں صدی میں گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کے "مقدمہ" میں لکھا ہے:

جب میں نے کتب رجال کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ ان میں ترتیب کا بہت فقدان ہے اور مقصود مؤلف آسانی سے ہاتھ نہیں آتا نیز ان میں تکرار اور اشتباہ بھی موجود ہے۔ اگرچہ ان میں سے کچھ کتابوں کی ترتیب بہتر ہے مگر اُن میں اغلاط بھی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے کسی کتاب میں بھی راویوں کے تمام ناموں کی جامع فہرست موجود نہیں ہے اسی لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور اسے حروف تہجی کی ترتیب پر منظم کیا ہے۔[۳]

۱۔ مجمع الرجال ج۱، ص ۲۔۳

۲۔ الذریعہ ج ۲۰، ص ۲۹

۳۔ نقد الرجال ج۱، ص ۳۳۔۳۴

مؤلف نے راویوں کی مکمل شخصیت بتانے کے لیے منابع حدیث کی طرف بھی رجوع کیا ہے اور اُن کی روایات کی روشنی میں راویوں کی شخصیت کی قدر و قیمت کو معین کیا ہے۔

اس کتاب کا خاتمہ چھ فوائد پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے شیخ طوسی اور شیخ صدوق کی سند سے ائمہ اطہارؑ کی کنیت، القاب اور ولادت و شہادت کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ کتاب موسسۃ آل البیتؑ کی تحقیق کے ساتھ پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۳) **جامع الرواۃ اردبیلی** (متوفی ۱۱۰۱ھ): محمد بن علی اردبیلی غروی کی اس کتاب کا پورا نام **جامع الرواۃ و ازاحۃ الاشتباھات عن الطرق والاسناد** ہے۔ یہ علم رجال کے موضوع پر ایک گراں قدر کتاب ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔

مؤلف اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

جہاں کتب رجال کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت مسلّم ہے اور روایات کی صحت جانچنے کے لیے اُن کتابوں کی اہمیت ہے وہاں ان میں یہ نقص بھی نظر آتا ہے کہ راویوں کے نام مطلقاً لکھ دیئے گئے ہیں، ان کو کسی دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے کسی امتیاز کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ راوی کس کا بیٹا یا کس کا باپ ہے اور کس کا استاد یا کس کا شاگرد ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی عام ہیں اس لیے راوی کے نام کو مشخص کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ اس طرح بہت سے راوی مجہول قرار پاتے ہیں اور عملی طور پر اُن کی روایات رائیگاں چلی جاتی ہیں۔

اردبیلی نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تمام منابع رجال کے ساتھ منابع احادیث کی طرف بھی رجوع کیا ہے تاکہ مختلف راویوں کی روایات کی تعداد سے اُن کی شناخت میں آسانی ہو اور اُن کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات مل سکیں۔ یہ طریقہ اُن کی اپنی ایجاد ہے ورنہ اس سے پہلے منابع رجال میں ایسا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ مؤلف نے اپنی کتاب کی تالیف میں رجال استر آبادی اور رجال تفرشی پر زیادہ انحصار کیا ہے۔

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۴) **الفوائد الرجالیہ**: سید مہدی بحر العلوم طباطبائی (متوفی ۱۲۱۲ھ) کی اس کتاب کو غالباً ''رجال بحر العلوم'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سید مہدی کی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) اہم ترین شیعہ رجالی گھرانوں مثلاً آل ابی رافع، آل ابی شعبہ اور آل اعین وغیرہ پر تحقیق۔

(۲) اصحاب پیغمبرؐ اور ائمہ طاہرینؑ سے روایت کرنے والوں کے نام اور اُن کے متعلق متقدمین علمائے رجال کی آراء اور تنقید و تحقیق۔

(۳) کتاب کا تیسرا حصہ رجال پر مشتمل ہے اور اسی حصے کی وجہ سے کتاب کا نام الفوائد الرجالیہ رکھا گیا ہے۔ اس حصے میں رجالِ ارشاد، راوی کی عدالت، کتبِ اربعہ کے مولفین کا طریق کار اور حضرت امام زمانہؑ کے وکلا کے حالات زندگی پر بحث کی گئی ہے۔[1]

یہ کتاب محمد صادق بحر العلوم اور حسین بحر العلوم کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں چھپی ہے۔

(۵) **تنقیح المقال فی علم الرجال:** اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ عظیم محقق شیخ عبداللہ مامقانی (متوفی ۱۳۵۱ھ) کی کتاب تنقیح المقال منابع رجال میں ایک زبردست تحقیقی اضافہ ہے اور مؤلف کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مؤلف اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

میں نے اپنی کتاب ''مقباس الہدایہ فی علم الدرایہ'' لکھتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ عنقریب رجال کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھوں گا چنانچہ چند برسوں کی محنت شاقہ اور جملہ منابع رجال کو سامنے رکھ کر میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔[2]

مؤلف نے اپنی کتاب کے مبسوط مقدمے میں علم رجال کے کچھ مباحث پر تحقیق کی ہے مثلاً انھوں نے کتب رجال کی طرف رجوع کے طریق کار، ائمہ طاہرینؑ کی ولادت اور وفات پر گفتگو کی ہے اور اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ مشائخ اجازہ کو کسی توثیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ فقہی منابع کی جرح و تعدیل پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ مامقانی نے یہ کتاب ایک نئے طرز پر لکھی ہے یعنی انھوں نے کتاب کے اصلی مباحث شروع کرنے سے پہلے اس میں **نتائج التنقیح فی تمییز السقیم من الصحیح** کے نام سے ایک رسالہ شامل کیا ہے جس میں انھوں نے اپنی کتاب میں موجود ۱۳۳۶۵ راویوں کی مکمل فہرست دی ہے اور آخر

۱۔ الفوائد الرجالیہ ج ۱، ص ۸۔۹

۲۔ تنقیح المقال فی علم الرجال ج ۱، ص ۱

میں اپنے نظریات کے مطابق ہر راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

انھوں نے رجال کی تحقیق کے دوران پہلے "الضبط" کے عنوان سے راویوں کے ناموں کو لکھا ہے اور اس کے بعد "الترجمة" کے عنوان سے راویوں کے حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں۔ یہ کتاب 30 x 60 سینٹی میٹر کی تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے جسے قطع رحلی کہا جاتا ہے۔

(۶) **قاموس الرجال:** اس کتاب کے مؤلف شیخ محمد تقی شوستری معاصر محققین میں سے ہیں۔ انھوں نے حصول علم کے لیے ان تھک محنتیں کیں۔ **بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة** (۱۴ جلدیں) **النجعة فی شرح اللمعة** (۱۱ جلدیں) اور **الاخبار الدخیلة** (۴ جلدیں) اُن کے یادگارِ علمی آثار ہیں۔

قاموس الرجال علم رجال پر ایک مکمل تحقیقی کتاب ہے۔ اس میں مؤلف نے صرف علمائے رجال کے نظریات ہی بیان نہیں کئے بلکہ راویوں کی زندگی کے ہر پہلو پر تحقیق کی ہے اور راویوں کی ثقاہت کے معیارات مقرر کئے ہیں۔ دراصل یہ کتاب علامہ مامقانی کی تنقیح المقال پر تعلیق ہے جو بذاتِ خود علم رجال کی ایک مستقل کتاب شمار ہوتی ہے۔

چنانچہ مؤلف کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

اگرچہ علامہ مامقانی کی کتاب اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے کیونکہ اس میں تمام منابع اور آراء کو جمع کیا گیا ہے نیز علمائے رجال کی عبارتوں کو نقل کرنے کی وجہ سے اسے علم رجال کی بہترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے مگر اس پر کچھ اعتراضات بھی کئے گئے ہیں[1] اور میں نے ان اعتراضات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

آخر میں مؤلف لکھتے ہیں:

چونکہ اس کتاب کی مزید تصحیح و تہذیب کی ضرورت تھی اس لیے میں نے یہ تعلیقات لکھیں اور اس کا نام **تصحیح تنقیح المقال** رکھا پھر کچھ اہل علم و فضل حضرات کے مشورے پر اس کا نام بدل کر قاموس الرجال رکھ دیا...[2]

یہ کتاب گیارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۔ قاموس الرجال ج ۱، ص ۸ ۔ ۹

۲۔ ایضاً ص ۱۲

(۷) **معجم رجال الحدیث**: آیت اللہ سید ابو القاسم خوئی کی اس کتاب کا پورا نام یہ ہے: **معجم رجال الحدیث و تفصیل طبقات الرواۃ**۔ یہ اس دور میں شیعہ رجال کا آخری اور مکمل ترین ماخذ ہے اور اس کی ۲۴ جلدیں ہیں۔

آیت اللہ مرحوم نے ابتدائی مباحث میں اجمالی طور پر علم رجال کی اہم ترین بحثوں کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں رجال کے شیعہ اصول، کتب اربعہ کی روایات کی صحت کا میزان، توثیقات عامہ اور توثیقات خاصہ ... جیسے موضوعات پر تحقیق و تنقید کی ہے۔

اس کتاب کی جو خصوصیت اسے باقی کتب رجال سے ممتاز و منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم آیت اللہ خوئی نے باقی علمائے رجال کی طرح راویوں کی مکمل فہرست دی ہے لیکن ہر راوی کے متعلق یہ تفصیل بیان کی ہے کہ کتب اربعہ میں اُس سے کتنی روایات منقول ہیں اور جہاں ضروری سمجھا وہاں اُن کی روایات بھی نقل کی ہیں۔

آیت اللہ مرحوم سمجھتے تھے کہ اس طرح راوی کا طبقہ مشخص ہونے کے ساتھ اُس کے مقام کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔[۱]

اس کتاب میں ۱۵۷۰۶ راویوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۱۔ آیت اللہ خوئی نے کتاب کے مقدمہ میں اپنی کتاب کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔
(معجم الرجال الحدیث ج ۱، ص ۱۲ - ۱۵)

شیعہ رجال کے آخری منابع

کتاب	مؤلف	وفات	جلد	اجمالی خصوصیات
مجمع الرجال	عنایت اللہ قہپائی	۹۹۳	۷	اس میں رجال کے اولین منابع یکجا کیے گئے ہیں
نقد الرجال	سید مصطفیٰ حسینی تفرشی	گیارہویں صدی	۵	اس میں رجال کی قدیم کتابوں کی اصلاح کی گئی ہے
جامع الرواۃ	محمد بن علی اردبیلی غروی	۱۱۰۱	۲	اس کا دارومدار رجال استرآبادی اور رجال تفرشی پر ہے
الفوائد الرجالیہ	سید محمد مہدی بحر العلوم	۱۲۱۲	۴	اس میں مباحث کو تین جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے
تنقیح المقال	شیخ عبداللہ مامقانی	۱۳۵۱	۳	اس میں ۱۳۳۶۵ راویوں پر گہری تحقیق کی گئی ہے
قاموس الرجال	شیخ محمد تقی شوستری	معاصر	۱۱	یہ کتاب تنقیح المقال کا حاشیہ ہے
معجم رجال الحدیث	سید ابو القاسم خوئی	معاصر	۲۴	اس میں ۱۵۷۰۶ راویوں پر بحث کی گئی ہے

چھٹا باب

فقہ الحدیث کا مفہوم

فہم یا غور و فکر سے حاصل ہونے والے فہم کو عربی زبان میں فقہ کہتے ہیں[۱] اور فقہ الحدیث کا مطلب فہم حدیث یا حدیث کی سمجھ بوجھ ہے۔ علم حدیث میں جہاں مصطلح الحدیث اور رجال الحدیث کی اصطلاحات مستعمل ہیں وہاں فقہ الحدیث کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح سے علوم حدیث کی ایک اہم شاخ مراد ہوتی ہے۔ اس کے متعلق احتمال ہے کہ یہ لفظ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس مشہور حدیث سے ماخوذ ہے جس میں آپ کا ارشاد پاک ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا وَبَلَّغَهَا مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى غَيْرِ فَقِيهٍ خدا خوش رکھے اُس بندے کو جس نے میری بات سنی، اُس کو یاد رکھا اور اُس آدمی تک پہنچا دی جس نے میری بات نہیں سنی تھی۔ بہت سے آدمی فہم و دانش کو اپنے سے ذہین فہیم لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں اور بہت سے آدمی اپنے سے فہم میں کم تر لوگوں تک بات پہنچاتے ہیں۔[۲]

اس روایت میں صرف حدیث سن لینے کو کافی پر نہیں سمجھا گیا ہے بلکہ حدیث سن کر سمجھنے یعنی اُس کے فہم پر زور دیا گیا ہے اور حاملِ حدیث کو حاملِ فقہ کہا گیا ہے۔

''فقہ الحدیث'' دراصل تفسیر حدیث کو سمجھنے کے معنی میں ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے ابہامات کی تفہیم کے لیے علم تفسیر کی ضرورت ہے اسی طرح فہم حدیث یعنی حدیث کی مشکلات اور ابہامات کو سمجھنے کے لیے علم فقہ الحدیث کی ضرورت ہے۔ فقہ الحدیث میں مزید ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تفسیر قرآن میں نہیں ہوتی وہ یہ کہ اس علم میں رجال حدیث کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے پر بحث کی جاتی ہے

۱۔ الصحاح ج ۶، ص ۲۲۴۳۔ النہایہ فی غریب الحدیث ج ۳، ص ۴۶۵۔ الفروق اللغویہ ص ۴۱۲

۲۔ بحار الانوار ج ۴۷، ص ۱۴۸۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵، ص ۱۸۳

جبکہ قرآن کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مجموعی طور پر ''فقہ الحدیث'' کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:
یہ اُن اصول اور قوانین کا علم ہے جن سے روایات کے متن کو سمجھنے اور اُن کے مدلول کو جاننے میں مدد ملتی ہے اور اُن کی وجہ سے حدیث کی تفسیر اور تشریح سامنے آتی ہے۔ فقہ الحدیث کی یہ تعریف روایات فہمی کے اصولوں سے جانکاری کے علاوہ اُن کی تفسیر اور تشریح پر بھی مشتمل ہے۔

اس باب میں ہم فہم حدیث کے پانچ اصولوں کو مختصراً بیان کریں گے۔

﴿۱﴾ الفاظ کے مفاہیم

راغب اصفہانی مفردات القرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: علوم قرآن میں سب سے پہلے اُن علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں بھی سب سے پہلے مفرد الفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہٰذا قرآن کے مطالب و معانی کی تحقیق کے لیے مفردات قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لیے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لیے کہ قرآن مجید کے مستعمل الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لب لباب اور مغز ہیں۔ احکام و مسائل اور حکم اور مصالح کے استنباط میں فقہاء اور حکماء نے انہی الفاظ کو مبنی قرار دیا ہے اور شعر و سخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔[۱]

الفاظ کے معانی کو سمجھنا کتنا اہم ہے اس کے لیے لفظ یَدٌ کی مثال دیکھیے۔ قرآن کریم نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد اقدس الٰہی ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ چور مرد ہو یا عورت اُن کے کیے کے بدلے دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ اللہ کی طرف سے اُن کی عبرت ناک سزا ہے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳۸) اب سوال یہ ہے کہ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ کیونکہ لفظ یَدٌ یعنی ہاتھ کا اطلاق انسان کے پورے بازو پر بھی ہوتا ہے اور کہنیوں سے لے کر انگلیوں تک کو بھی لفظ ''ہاتھ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہتھیلی کو بھی ''ہاتھ'' کہا جاتا ہے اور انگلیوں کے سرے سے لے کر اس کے پوروں کو بھی ہاتھ کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں قرآن کے حکم پر

۱۔ مفردات القرآن (اردو) صفحہ ۴، مطبوعہ شیخ شمس الحق، اقبال ٹاؤن لاہور

عمل کیا جائے تو کیسے کیا جائے؟ [1]

علمائے اہل سنت میں یہ اختلاف امام محمد تقیؑ کے زمانے تک جاری رہا اور وہ کسی معقول فیصلے سے قاصر رہے۔ ایک دفعہ معتصم عباسی کے دربار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو امام محمد تقیؑ نے فرمایا کہ چور کی انگلیاں کاٹی جائیں اور اس کی ہتھیلی کو باقی رکھا جائے۔ اس کے لیے آپ نے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ○ اور سجدے کی جگہیں اللہ کے لیے ہیں پس کسی کو اللہ کے ساتھ مت پکارو۔ (سورۂ جن : آیت ۱۸) اس آیت سے آپ نے ثابت کیا کہ ''قطع ید'' سے مراد انگلیوں کا کاٹنا ہے۔ [2]

غیر فقہی مباحث میں بھی الفاظ کے معانی کی تفہیم معانی کی تعیین میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا واضح نمونہ لفظ ''ولی'' ہے۔ چنانچہ شیعہ مفسرین، محدثین اور متکلمین حضرت علیؑ کی ولایت کے لیے آیۂ ولایت (سورۂ مائدہ : آیت ۵۰) سے استدلال کرتے ہیں اور **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** کی حدیث سے حضرت علیؑ کا اولی بالتصرف ہونا اور آپ کے حاکم اور امام ہونے کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل سنت علماء ولی کے معنی ہم پیمان، دوست، مددگار، انجام ... وغیرہ کرتے ہیں۔ [3] اس غلط تفسیر کے مطابق حدیث غدیر اور آیۂ ولایت سے امام علیؑ کی امامت کے اثبات میں مدد نہیں مل سکتی۔

الفاظ کے معانی کے تعین کے لیے حسب ذیل نکات کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

(۱۔۱) الفاظ کے مادّے اور مشتق پر توجہ

الفاظ کی مثال ایک مضبوط درخت کی شاخوں اور پتوں کی سی ہے جو ایک ہی تنے اور جڑ سے جڑی ہوتی ہیں۔ اسی بنیاد پر علمِ صرف وجود میں آیا جس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر لفظ کا ایک مصدر ہوتا ہے اور اس سے فاعل، زمان اور کیفیت کو دیکھ کر صیغے بنائے جاتے ہیں اور اسی مصدر کو مختلف افعال اسم فاعل، اسم مفعول، صفت مشبہہ، اسم زمان، اسم مکان، اسم آلہ اور اسم تفصیل میں ڈھالا جاتا ہے۔ صیغے مختلف ہوتے ہیں لیکن اگر ان سب کی بناوٹ پر توجہ دی جائے تو وہ سب کے سب ایک ہی جڑ کے

۱۔ معالم الدین و ملاذ المجتہدین ص ۱۵۷ ۔ ۱۵۸

۲۔ تفسیر نور الثقلین ج ۵، ص ۴۳۹

۳۔ الہدایہ ص ۱۵۲۔ معانی الاخبار ص ۶۹ ۔ ۷۰۔ رسائل المرتضیٰ ج ۳، ص ۱۳۱

پھول پتے اور شاخیں ہوتے ہیں اور ایک ہی مصدر سے مشتق ہوتے ہیں۔ اسی لیے الفاظ کے مصادر پر خوب توجہ دینی چاہیے کیونکہ مفہوم سمجھنے میں یہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں شیخ طوسی نے موجبات وضو بیان کرنے والی روایات کے بعد معصوم سے یہ روایت نقل کی ہے:

رَاَیْتُ اَبِی صلوٰۃ اللہ علیہ وَقَدْ رَعَفَ بَعْدَ مَا تَوَضَّأَ دَمًا سَائِلًا فَتَوَضَّأَ یعنی میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ وضو کرنے کے بعد اُن کی نکسیر پھوٹی تو انھوں نے وضو کا اعادہ کیا۔[1]

ظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نکسیر پھوٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ یہ روایت مشہور نظریے بلکہ فقہائے شیعہ کے اجماع کے خلاف ہے۔ شیخ طوسی نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے لفظ کے مادّے کا سہارا لیا اور کہا کہ یہاں لفظ تَوَضَّأَ اصطلاحی وضو کے معنی میں نہیں بلکہ دھونے کے معنی میں ہے کیونکہ اس لفظ کا مادہ مجرد ''وضائت'' ہے جس کا مطلب ہے خوبصورتی۔ اور جو شخص اپنے ہاتھوں کو دھو کر صاف کرے تو کہا جاتا ہے وَضَّاهَا یعنی اُس نے اپنے ہاتھوں کو دھو کر خوبصورت بنایا ہے جبکہ توضا اصطلاحی طور پر ''وضوء'' سے مشتق ہے جس سے مراد مخصوص طریقے سے اعضاء کا دھونا ہے۔[2]

(۲۔۱) گوہرِ معانی پر توجہ

معنوی اشتراک کی وجہ سے لفظوں کا مفہوم مشترک ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ اُن کے گوہر معانی ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ جو لاہوتی اور ماورائے حس و مادہ مفاہیم کو بیان کرتے ہیں وہ بھی گوہر معانی کے حامل ہوتے ہیں اس لیے وہ مادی مصادیق پر بھی اور ماورائے مادہ مصادیق پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب آیات و روایات میں عالم قبر اور عالم آخرت کی کیفیت بیان کی جاتی ہے تو سراج (چراغ) میزان (ترازو) ظل (سائبان) جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں یا خدا شناسی اور عالم ملکوت کی آیات و روایات میں نور، سمیع، بصیر، غضب، رضا، عرش، جناح (فرشتوں کے پر)، خزینہ (خدا کا خزانہ) جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔ ان الفاظ کے متعلق تین طرح کے مکاتب فکر پائے جاتے ہیں:

(۱) مکتب تعطیل

اس مکتب کے لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں لاہوتی مفاہیم کی تشریح کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہ ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان مفاہیم کے وجود پر ایمان رکھیں اور ان کی حقیقت خدا جانتا ہے۔

---

۱ و ۲۔ تہذیب الاحکام ج ۱ ص ۱۳۔ ۱۴

وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ قبر اور قیامت کے حوالے سے جس چراغ کا ذکر آیا ہے اُس کا مقصد کیا ہے؟، اعمال کی ترازو اور جنتیوں یا جہنمیوں کے لیے سائبان کی کیفیت کیا ہوگی؟ اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ خدا کو نور، سمیع و بصیر کس حوالے سے کہا گیا ہے؟ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا کے غضب کی نوعیت کیا ہے؟ اور ہم اُس کے خزانوں کے متعلق بھی کچھ نہیں جانتے۔ فرشتوں کے دو دو، تین تین اور چار چار "پَروں" سے کیا مراد ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہم اُن کی کوئی تفسیر کے مجاز ہیں البتہ ہم عالم حقیقت میں اُن مفاہیم کے وجود کو مانتے ہیں۔

(۲) مکتب تشبیہ

اس مکتب کے لوگ ان تمام الفاظ کے مادی معانی مراد لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کے لیے نور اور سمیع و بصیر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں تو وہ اس دنیا کی روشنی یا سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کے معانی میں ہیں اور قیامت میں اعمال کی ترازو بھی ویسی ہی ہوگی جیسی دنیا میں ہوتی ہے۔

(۳) مکتب اعتدال

یہ مکتب کہتا ہے کہ تعطیل کی تردید کرتے کرتے تشبیہ کے گڑھے میں نہیں گرنا چاہیے بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے اور بحرِ معانی میں غوطہ زن ہو کر گوہر معانی کو ڈھونڈنا چاہیے کیونکہ نور جیسے الفاظ کے مختلف وجودی مراتب ہوتے ہیں جو شمع کی روشنی سے لے کر نورِ الٰہی تک کا احاطہ کرتے ہیں مگر شمع یا سورج ہونا ماہیتِ نور کے مقوّم کا حصہ نہیں کہ اس سے "خدا کے لیے" اس کا مادی مفہوم مراد لیا جا سکے۔ "نور" گوہر معانی کا حامل لفظ ہے جو مادہ اور ماورائے مادہ عناصر سے قطع نظر "نور کے متعدد مصادیق" پر صادق آتا ہے۔ اس گوہر معانی کی تعریف یہ ہے: **الظاهر لنفسه المظهر لغيره** (نور وہ ہے جو اپنی ذات میں روشن ہو اور اپنے غیر کو روشن کرنے والا ہو)۔ یہ مفہوم اتنا جامع ہے کہ مادی دنیا میں چراغ کی روشنی سے لے کر سورج تک کی تمام روشنیوں کو شامل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مادی مفہوم تلاش کیے بغیر اس مفہوم میں خدا کا نور ہونا بھی شامل ہے۔ نور کی یہ تعریف خدا کی ذات پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے کیونکہ وہ ذات خود آشکار ہے اور اپنے غیر کو بھی آشکار کرتی ہے۔

اسی طرح میزان کا مفہوم یہ ہے: **ما يوزن به** یعنی وہ چیز جس کے ذریعے کسی چیز کا وزن کیا جائے۔ دنیوی میزان دو پلڑوں اور ڈیجیٹل نظام پر مبنی ہوتا ہے اور قیامت کے دن ایک "انسانِ کامل" کو میزان قرار دیا جائے گا اور اُس کے اخلاق و کردار کے معیار پر لوگوں کے اعمال کو پرکھا جائے گا۔

اسی لیے اگر روایات میں یوں آیا ہے کہ رسول اکرم اور اہل بیت علیہم السلام لوگوں کے اعمال کا میزان ہیں تو ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ لفظ میزان اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔[1]

(۳-۱) الفاظ کے معانی کے لیے زمانہ صدور پر توجہ

بعض الفاظ کا مفہوم زمانہ صدور میں کچھ ہوتا ہے پھر سماجی و ثقافتی تبدیلیوں کے سبب پہلے مفہوم سے دور ہوجاتا ہے۔ کسی لفظ کا مفہوم زمانہ صدور میں محدود ہوتا ہے اور بعد میں وسیع ہوجاتا ہے اور کسی لفظ کا مفہوم زمانہ صدور میں وسیع ہوتا ہے اور بعد میں محدود ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور زندہ زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ معانی میں ایسی تبدیلیوں سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ دینی متون میں استعمال ہونے والے الفاظ چاہے قرآن کے ہوں یا حدیث کے ان کا صحیح مفہوم جاننے کے لئے اس زمانے کے اسالیب کا ذوق آشنا ہونا چاہیے تاکہ جان سکے کہ جب یہ الفاظ ادا ہورہے تھے اس وقت اس کے معنی کیا تھے۔ بعض اوقات لغت کی کتابوں سے بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی اس لیے ضروری ہے کہ ان الفاظ کے معانی میں ہونے والی تبدیلیوں پر تحقیق کی جائے۔

آیۂ ''نفر'' میں کہا گیا ہے کہ ''تفقہ فی الدین'' کے لیے ہر گروہ کے کچھ افراد کو سفر کرنا چاہیے ارشاد اقدس الٰہی ہے: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے نکل کھڑے ہوتے مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ نافرمانی سے بچتے۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۲۲)

نیز رسول مقبول ﷺ کی مشہور حدیث میں چالیس حدیثیں حفظ کرنے کے متعلق کہا گیا ہے: مَنْ حَفِظَ مِنْ أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيثًا مِمَّا يَحْتَاجُونَ إِلَيْهِ مِنْ أَمْرِ دِينِهِمْ بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقِيهًا عَالِمًا میری امت میں سے جو شخص چالیس ایسی احادیث حفظ کرے جن کی اسے دینی معاملات میں ضرورت ہو تو خدا قیامت کے دن اسے فقیہ اور عالم محشور کرے گا۔[2]

۱۔ بحار الانوار ج ۷، ص ۲۹۱۔ المیزان ص ۱۸۵

۲۔ عیون اخبار الرضا ج ۱، ص ۴۱۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۱۵۳

دور حاضر میں بلکہ چند صدیاں پہلے تک لفظ فقہ اور تفقہ احکام شریعت میں اجتہاد کی صلاحیت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اگر اس بنیاد پر مذکورہ بالا آیت اور حدیث میں ''تفقہ اور فقہ'' کے یہی معنی مراد لیے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ علمی اور دینی مراکز کی طرف سفر کریں تاکہ دینی احکام میں اجتہاد کے قابل ہوسکیں!! اور حدیث نبوی کا یہ مفہوم ہوگا کہ میری امت میں سے جو شخص چالیس ضروری احادیث یاد کرے گا وہ قیامت کے دن اصطلاحی مجتہد کی صورت میں اٹھایا جائے گا!!!

لیکن جب ہم ان الفاظ کے زمانۂ صدور کے معانی کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان سے مراد دینی بصیرت اور سمجھ بوجھ ہے اور ان سے کوئی خاص دینی شعبہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ عقائد، اخلاق اور احکام سب کو شامل کرتے ہیں۔ اس سے صرف احکام میں اجتہاد مقصود نہیں ہے۔

شیخ بہاؤالدین عاملی مذکورہ حدیث نبوی کے متعلق فرماتے ہیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حدیث بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقِيهًا عَالِمًا میں ''فقہ'' کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس سے مراد احکام شرعیہ علمیہ کو ادلۂ تفصیلی (فقہ کے اصطلاحی معنی) سے جاننا مراد نہیں کیونکہ یہ فقیہ کے نئے معنی ہیں۔ اس کی بجائے حدیث میں جس فقہ کی بات کی گئی ہے اس سے دینی معاملات میں بصیرت مراد ہے اور احادیث میں لفظ ''فقہ'' زیادہ تر انہی معانی میں ہی استعمال ہوا ہے۔[۱]

(۴۔۱) روایات کی مخصوص اصطلاحات پر توجہ

احادیث میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جہاں اُن کے لغوی معانی مراد نہیں بلکہ خاص معانی مراد ہیں کثرت استعمال کی وجہ سے اُن کے ثانوی اور اصطلاحی معانی کو حقیقتِ شرعیہ کہا جا سکتا ہے۔ ان مفاہیم کو لغت ناموں یا عرف سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُن کے حقیقی معانی کو سمجھنے کا ایک یہی راستہ ہے کہ عصر صدور میں اُن الفاظ کے معانی تلاش کئے جائیں مثلاً قرآن و حدیث میں لفظ ''ایمان'' اور ''نفاق'' کے درمیان واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ایمان سے اسلام اور اقرار شہادتین سے بلند تر درجہ مراد ہے یعنی ایمان یہ ہے کہ انسان غیب پر دل سے عقیدہ رکھے جیسا کہ اس آیت میں ارشاد باری ہے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

۱۔ اربعین شیخ بہائی ص ۱۰

یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ (سورۂ حجرات : آیت ۱۴)

اور قرآن کی منطق میں اُس شخص کو ''منافق'' کہا گیا ہے جو دل سے کافر ہو اور ظاہراً مومن کہلاتا ہو جبکہ روایات کی اصطلاح میں ایمان کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ انسان ائمہ طاہرینؑ کی امامت پر ایمان رکھتا ہو اور جو لوگ ائمہ طاہرینؑ کی امامت کے قائل نہیں وہ منافق ہیں۔[1]

﴿۲﴾ جملوں کی ترکیب پر تحقیق

معانی کے تعین میں الفاظ کے بنیادی کردار کے بعد الفاظ کے باہمی ترکیب وارتباط کی باری آتی ہے اور یہی جملوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ عربی زبان میں جملوں کی بناوٹ اور ترکیب کے کئی طریقے ہیں اور جملوں کی بندش کا ہر طریقہ معانی کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے علم نحو اور اُس کے قوانین جاننا بہت ضروری ہے۔

یہ بات صرف احادیث سے مخصوص نہیں بلکہ قرآن کریم پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے یہ آیت ملاحظہ کیجئے ... وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا خدا اور علم میں پختہ کار لوگوں کے سوا (آیات متشابہات کا) حقیقی مفہوم کوئی نہیں جانتا۔ وہ کہتے ہیں ہمارا ان پر ایمان ہے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ (سورۂ آل عمران : آیت ۷)

اس آیت کی ترکیب کے متعلق مفسرین نے طویل بحثیں کی ہیں۔ کچھ مفسرین اور نحوی حضرات الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کو لفظ ''اللہ'' پر معطوف قرار دیتے ہیں اور یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ آیات متشابہات کی تاویل اللہ کے ساتھ راسخون فی العلم بھی جانتے ہیں جبکہ کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ نحوی قواعد کے خلاف ہے اور وہ اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ آیات متشابہات کی تاویل صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اُن کے مطابق اس آیت سے راسخون فی العلم کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بھی آیات متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔ اسے کسی دوسری دلیل سے ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔[2]

۱۔ مصباح الفقاہۃ ج ۵، ص ۹۵۔ بحار الانوار ج ۲۹، ص ۳۳

۲۔ الاتقان فی علوم القرآن ج ۳، ص ۵۔ مفاتیح الغیب ج ۷، ص ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ التمہید فی علوم القرآن ج ۳، ص ۳۸۔ ۴۲۔ تفسیر المیزان ج ۳، ص ۵۶

ایک مشہور روایت ہے : اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ ظاہری طور پر صُوْرَتِہٖ کی ضمیر کا مرجع "اللہ" دکھائی دیتا ہے چنانچہ مجسمہ (اللہ کے لیے جسم کا عقیدہ رکھنے والے) اس حدیث سے تمسک کرتے ہیں اور اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ پس اللہ کے لیے بھی قد و قامت ثابت ہے۔ سید مرتضیٰ اس روایت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس میں ضمیر "ہ" اللہ تعالیٰ کی بجائے حضرت آدمؑ کی طرف جاتی ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اس صورت پر پیدا کیا جس کے ساتھ قبضِ روح ہوتی ہے یعنی آدمی کی صورت زندگی کے آغاز سے اختتام تک ثابت ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ضمیر "ہ" کا مرجع اگرچہ "اللہ" ہی ہے مگر یہ حقیقی نہیں مجازی اضافت ہے جیسا کہ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (سورۂ حجر : آیت ۲۹۔ سورۂ ص : آیت ۷۲) کی آیت میں ہے۔ چنانچہ اس تاویل سے تجسیم خدا کے عقیدے کا اثبات نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

﴿۳﴾ روایات کی زبان پر توجہ

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں روایات کی زبان اُس وقت کے اہل زبان کے روزمرہ کے مطابق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ شعر اور نثر میں مجاز، تشبیہ، استعارہ، تمثیل اور قرائن پر تکیہ کرتے ہوئے کچھ الفاظ حذف کئے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں مقصود سمجھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اگر ہم اپنی دن بھر کی پوری گفتگو کو سامنے رکھیں تو ہمیں ان میں علم معانی و بیان سے متعلقہ یہ تمام چیزیں دکھائی دیں گی جو ہماری روزمرہ زبان میں رائج ہیں۔

علم معانی و بیان کی یہ ساری چیزیں قرآن کریم میں بھی وسیع صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

(۱) ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت دھواں تھا۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔ (سورۂ حم سجدہ : آیت ۱۱)

اس آیت کے متعلق مفسرین کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں تمثیلی زبان استعمال کی گئی ہے کیونکہ آسمان و زمین دونوں جامد اور بے شعور ہیں لہٰذا اُن سے بات چیت نہیں کی جا سکتی۔ اس

۱۔ التوحید ص ۱۰۳ ۔ ۱۰۴۔ شرح ملا صالح مازندرانی ج ۳، ص ۱۹۶ ۔ ۱۹۸۔ بحار الانوار ج ۴، ص ۱۱ ۔ ۱۵

آیت میں ان کی طرف سے اطاعتِ حکم کو زبانِ حال اور مکالمے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔[۱]

(۲) وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ تیرا پروردگار اور ملائکہ صف در صف آجائیں گے۔

(سورۂ فجر: آیت ۲۲)

(۳) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ اس دن چہرے شاداب اور تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(سورۂ قیامت: آیت ۲۲ ـ ۲۳)

مفسرین لکھتے ہیں کہ ان آیات میں مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔[۲]

چند مفسرین کہتے ہیں کہ ان آیات میں لفظ ''رحمت'' محذوف ہے لہٰذا پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: تیرے پروردگار کی رحمت اور ملائکہ صف در صف آجائیں گے۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اس دن چہرے شاداب اور تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی رحمت کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس طرح کی تفسیر و تاویل کی صورت میں خدا کی تجسیم لازم نہیں آتی۔

یہی حال روایات کا ہے۔ ان میں بھی مجاز، تشبیہ، استعارہ، تمثیل اور حذف کی بہت زیادہ مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ احادیث دیکھیے:

(۱) لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ مسجد کے ہمسائے کی نماز، مسجد کے علاوہ نہیں ہوتی۔

اس حدیث کے بارے میں علماء نے کہا ہے کہ اس کی اصل صورت یہ ہے: لَا صَلَاةَ كَامِلَةً لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ مسجد کے ہمسائے کی نماز، مسجد کے علاوہ کامل نہیں ہوتی۔

اگر حدیث میں لفظ كاملة کو محذوف نہ مانا جائے تو اس کا مفہوم یہ نکلے گا کہ اگر مسجد کا ہمسایہ اپنے گھر میں نماز پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے جبکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مسجد کا ہمسایہ اپنے گھر میں نماز پڑھے تو اس کی نماز کمال کو نہ پہنچے گی۔[۳]

(۲) عَنْ اَبِيْ جَعْفَرٍ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ اسْتَنْطَقَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُ اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ

۱۔ اطیب البیان ج ۱۱، ص ۳۱۶۔ مخزن العرفان ج ۷، ص ۳۱۵۔ مجمع البیان ج ۵، ص ۶۔ التبیان ج ۹، ص ۱۰۹۔ تفسیر المیزان ج ۱۷، ص ۳۸۷۔ تفسیر نمونہ ج ۲، ص ۲۲۷

۲۔ التمہید فی علوم القرآن ج ۳، ص ۹۲ ـ ۹۷، ۱۱۲

۳۔ تذکرۃ الفقہاء ج ۱، ص ۱۷۰۔ ذکری الشیعہ ص ۲۶۷۔ عدۃ الاصول ج ۳، ص ۱۰

اس حدیث میں حرف ''لا''، ''نفی مطلق'' کی بجائے ''نفی کمال'' کے لیے آیا ہے۔ (مترجم)

اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ... امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے عقل کو پیدا کیا تو اسے بولنے کی قوت بخشی پھر اُس سے کہا کہ آگے بڑھ چنانچہ وہ آگے بڑھی۔ پھر اُس سے کہا کہ پیچھے ہٹ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئی۔[۱]

کچھ شارحین اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

اس سے عقل اور خدا کے درمیان حقیقی مکالمہ مراد نہیں ہے بلکہ اس میں عقل کی زبانِ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ عقل سے گفتگو اور اس کے آگے پیچھے ہونے کا تعلق بابِ تمثیل و استعارہ سے ہے۔ اس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شرعی ذمے داریاں عقل کے کمالات اور توفیقات کی بنیاد پر سونپی گئی ہیں۔[۲]

احادیث میں ہے کہ مومن کی موت پر زمین و آسمان روتے ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے اِذَا مَاتَ الْمُؤْمِنُ بَكَتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ وَبِقَاعُ الْأَرْضِ الَّتِي كَانَ يَعْبُدُ اللهَ عَلَيْهَا جب کوئی مومن مرتا ہے تو فرشتے اُس پر روتے ہیں اور زمین کے وہ ٹکڑے بھی اُس پر گریہ کرتے ہیں جن پر وہ خدا کی عبادت کیا کرتا تھا۔[۳]

فرشتوں کا رونا تو حقیقی ہے اور زمین کے ٹکڑوں کے رونے کا مطلب ممکن ہے کہ بابِ مجاز اور تمثیل سے ہو۔

علامہ شعرانی اس روایت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں: اس طرح کی گفتگو عربی اور فارسی زبانوں میں رائج ہے۔

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لما اتی خبر الزبیر تواضعت

سور المدینه والجبال الخشع

جب زبیر کی خبر پہنچی تو شہر کی دیوار اور پہاڑ اُس کے لیے جھک گئے اور سر پر خاک ڈالی۔[۴]

۱۔ کافی ج ۱، ص ۱۰

۲۔ مرآۃ العقول ج ۱، ص ۲۷

۳۔ کافی ج ۱، ص ۳۸

۴۔ یہ شعر جریر کا ہے۔ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ کو زبیر کے قتل کی خبر ملی تو آپ اور آپ کے بیٹوں نے اُس پر گریہ کیا اور فرمایا کہ زبیر کے قتل نے ہمیں رنجیدہ کر دیا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں: جریر نے اس پر یہ شعر پڑھا تھا۔
(تاریخ مدینہ دمشق ج ۱۸، ص ۴۲۸۔ طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۱۳)

فارسی کے ایک شعر میں بھی یوں بیان کیا گیا ہے:

ماتم سرای گشت سپهر چهارمین
روح الامین به تعزیتِ آفتاب شد
گردون سر محمد یحیی به باد داد
محنت رقیب سنجر مالک رقاب شد[1]

اسی طرح ملا صالح مازندرانی نے احتمال دیا ہے کہ شاید اس روایت کا تعلق باب مبالغہ سے ہو کیونکہ یہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی بڑے آدمی کی موت کا تذکرہ کرتے ہیں تو مبالغے کے طور پر کہتے ہیں کہ اس پر زمین اور آسمان گریہ کناں ہیں۔[2]

روایات میں آیا ہے کہ امام حسین علیہم السلام کی شہادت پر چالیس دن تک زمین و آسمان نے گریہ کیا تھا۔[3] ان روایات کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق مجاز اور تمثیل سے ہے۔

﴿۴﴾ معانی کے تعین میں سیاق کا کردار

''سیاق'' سے مراد وہ اسلوب ہے جس کی بنیاد پر عبارت کھڑی ہوتی ہے۔[4] طرز گفتگو، جملہ بندی کا طریقہ[5] تسلسل اور جملوں کے پے در پے واقع ہونے کو سیاقِ کلام[6] کہا جاتا ہے۔

آیت اللہ شہید محمد باقر صدر لکھتے ہیں:

''سیاق'' اُن علامتوں سے عبارت ہے جو موردِ نظر لفظ کے معنی کو کشف کرتی ہیں۔ یہ علامات لفظی بھی ہو سکتی ہیں جیسے وہ کلمات جو ایک کلام کے موردِ نظر لفظ کے اجزا کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ایک مکمل کلام تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور کبھی یہ علامات قرائن حالیہ ہوتی ہیں جو کلام

۱۔ شرح ملا صالح مازندرانی ج ۱، ص ۹ حاشیہ

۲۔ ایضاً

۳۔ مناقب آل ابی طالب ج ۲، ص ۲۱۲۔ العمدہ ص ۴۰۵۔ مدینۃ المعاجز ج ۴، ص ۱۳۶

۴۔ معجم لغۃ الفقہاء، ص ۲۵۲

۵۔ فرہنگ معین ج ۲، ص ۱۹۶۷

۶۔ معجم الفاظ الفقہ الجعفری ص ۲۳۶

میں پائے جاتے ہیں اور مخصوص معنی پر دلالت کرتے ہیں۔[1]

جب ہم سیاق کی کارکردگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ اس سے صرف لفظی علامات مراد ہوتی ہیں اور قرائن حالیہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا حالانکہ ہوسکتا ہے کہ یہ قرائن معنی دینے میں کوئی کردار ادا کرتے ہوں۔

ہر گفتگو الفاظ، تراکیب اور ابتدا و انتہا کے حوالے سے کچھ قرائن رکھتی ہے جو اُس کے صحیح فہم میں مدد دیتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید کی اُن آیات میں کہ جن کے فقرے بعنوان ''آیت'' جدا ہیں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر آیات کے ماقبل اور مابعد پر توجہ نہ دی جائے تو اُن کے مکمل معانی سمجھنا دشوار ہیں لیکن اگر ماقبل اور مابعد کی آیات یا آیت کی ابتدا و انتہا پر توجہ دی جائے تو معنی سمجھنے کا عمل پورا ہوجاتا ہے اور کئی احتمالی ابہامات ختم ہوجاتے ہیں۔[2]

روایات کو سمجھنے میں بھی سیاق موثر کردار ادا کرتا ہے اور ناقص و غلط مفہوم نکالنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

(۱) حدیث غدیر مسلم الثبوت حدیث ہے مگر اس کے باوجود اہل سنت کے متکلمین اس کی دلالت کو نہیں مانتے۔ بہتیرے علمائے اہل سنت یہ مانتے ہیں کہ حدیث **من کنت مولاہ** سند اور متن کے لحاظ سے درست ہے پھر وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت علیؑ کی امامت اور ولایت یعنی بعد رسولؐ حاکم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہاں لفظ ''مولا'' دوست اور مددگار کے معانی میں ہے یعنی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کا میں دوست اور مددگار ہوں علیؑ بھی اُس کا دوست اور مددگار ہے۔

اس کے جواب میں شیعہ متکلمین سیاقِ حدیث سے استفادہ کرتے ہوئے محکم ترین دلائل سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں **من کنت مولاہ...** کہنے سے پہلے فرمایا تھا: **اَلَسْتُ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ** یعنی آپ نے تمام مسلمانوں سے یہ پوچھا تھا کہ کیا میں تمہاری جان و مال پر تم سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ تمام مسلمانوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فائق حق کو قرآن کی آیت **اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ** سے منوانے کے بعد جو کہ حاکمیت کے معانی میں ہے فرمایا تھا: **من کنت مولا فھذا علی مولاہ**۔ یہاں ''فائق حق''

۱۔ تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی کی تفسیری روش ص ۲۰۲ بحوالہ دروس فی علم الاصول از شہید صدر ج ۱، ص ۱۳۰

۲۔ تفسیر المیزان ج ۲۰، ص ۳۷۰

سے مراد زیادہ حق دار ہونا ہے یعنی جس پر میں حق تصرف رکھتا ہوں اُس پر علیؑ بھی حق تصرف رکھتے ہیں۔
آپ نے دیکھا کہ یہاں سیاق کی محکم دلیل سے روایت کے ابہام کو دور کیا گیا ہے۔[۱]

﴿۵﴾ بیرونی قرائن پر توجہ

ائمہ اطہارؑ کی روایات لڑیوں کی طرح ایک دوسرے متصل ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آب وجد کی اسناد سے مروی روایات کو عین روایاتِ رسولؐ سمجھتے تھے۔ گویا ۲۵۰ سال کے فاصلے کے باوجود اُن کی روایات کا مقصود اور متن ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے جو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ معصومین کی روایات سرچشمۂ وحی سے متصل ہیں جیسا کہ اللہ نے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے:
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں انھیں بہت اختلاف دکھائی دیتا۔

(سورۂ نساء: آیت ۸۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز اللہ کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ بے عیب ہوتی ہے۔

یہاں دو نکات زیادہ قابلِ توجہ ہیں:

(۱) آیات اور روایات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں لہٰذا ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں اگر ہمیں کہیں کوئی ایسی روایت دکھائی دے جو قرآن اور سنت صحیحہ کے خلاف ہو اور وہ روایت کسی طرح قابلِ تاویل بھی نہ ہو تو وہ قابل قبول نہیں ہوتی یعنی وہ روایت ائمہ طاہرینؑ سے ہرگز صادر نہیں ہوئی۔ وہ یا تو جعلی روایت ہے یا پھر راوی کو نقل اور کتابت میں اشتباہ ہوا ہے۔

(۲) آیات اور روایات کا مجموعہ ایک دوسرے کا مبین اور مفسر ہے۔ یہ پورا مجموعہ ایک ہی متکلمؑ کے ایسے کلام کی مانند ہے جو شروع میں یا درمیان میں یا آخر میں قرائن کے ساتھ اپنے مقصود کو واضح کرتا ہے تفسیر قرآن بالقرآن کا راز بھی یہی ہے کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور روایات بھی قرآن اور دوسری روایات کی مفسر ہوتی ہیں یعنی اگر ایک روایت میں ابہام ہو تو دوسری روایت کے ذریعے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات کی روایات سے ''تطبیق'' اور روایات کی آیات اور دیگر روایات سے ''تطبیق'' بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور مجمل، مبین، عام و خاص، مطلق و مقید، محکم

۱۔ خلاصہ عبقات الانوار ج ۹، ص ۸۷۔ ۹۳

ومتشابہ اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ بھی اسی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر موضوعات پر اصولِ فقہ میں بحث کی جاتی ہے اور احکامِ فقہ کے استخراج میں یہ انتہائی کارآمد ہوتے ہیں۔

اور بیرونی قرائن کی طرف توجہ سے بھی ہمارا مقصود یہی نکتہ ہے کہ اگر کسی دینی معاملے میں الفاظ، جملوں اور سیاق ... کے حوالے سے ایک روایت کی تحقیق کی جائے اور اس کا مفہوم بھی سمجھ لیا جائے تب بھی ہمیں جلد بازی سے کام لے کر اسی مفہوم کو ائمہ کی احادیث کا واقعی مطلب نہیں سمجھنا چاہیے اور اسے دین کا حکم قرار نہیں دینا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ ہم مزید چھان پھٹک کریں اور اس موضوع سے متعلق تمام آیات اور روایات کو جمع کریں، پھر اُن کی درجہ بندی کریں، پھر فقہ الحدیث کے اصولوں کے مطابق اس سے آخری نتیجہ اخذ کریں۔

سیدھی سی بات ہے کہ ان مراحل میں جتنے غور وخوض سے کام لیا جائے گا ہمارا اخذ کردہ نتیجہ حقیقتِ واقعی سے اتنا زیادہ قریب ہوگا اور اگر اس طرح تمام آیات وروایات پر تحقیق نہ کی جائے تو پھر انسان دین کے حقائق سے بیگانہ ہوجائے گا اور یک طرفہ فیصلے کرنے لگے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے درمیان ہمیں جتنے انحرافات اور مختلف فرقے اور مسالک نظر آتے ہیں اُس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے دینی متون سے نتیجہ نکالنے میں غور وخوض اور بیرونی قرائن سے مدد نہیں لی۔

اس کی مثال:

کچھ مسلمان علماء عقیدۂ جبر کے قائل ہوگئے کیونکہ انھوں نے فقط جبر پر دلالت کرنے والی نصوص پر غور کیا اور بالغ نظری سے کام نہ لیا۔ انھوں نے اُن نصوص کو چھوڑ دیا جن میں انسان کی آزادی اور اُس کے اختیار کا اثبات کیا گیا ہے۔ اُن کی اس کم نظری کے سبب ''جبریہ'' وجود میں آگئے۔

کم وبیش یہی حال ''صوفیہ'' کا ہے۔ انھوں نے جب قرآن وحدیث میں ایسی نصوص ملاحظہ کیں جن میں زہد اور دنیا سے بے رغبتی کا درس دیا گیا ہے اور آخرت کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے تو انھوں نے گوشہ نشینی کو ہی دین داری کا ماحصل قرار دیا حالانکہ یہ نظریہ افراط پر مبنی ہے۔ اگر یہ لوگ قرآن کی ایسی آیات اور پیغمبرؐ کی ایسی روایات کا مطالعہ کرتے جن میں رزق حلال کمانے کی پُرزور تاکید کی گئی ہے تو وہ گوشہ نشینی کے خطرناک بھنور میں نہ پھنستے۔

اسی وجہ سے ائمہ طاہرینؑ لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں اور نہ کوئی رائے قائم کریں بلکہ کسی بھی رائے کو ماننے سے پہلے دین کی تمام نصوص کو اپنے سامنے رکھیں پھر اُن پر

سوچ بچار کے بعد کوئی تفسیر کریں۔ انھوں نے صرف چند نصوص کی بنا پر کوئی نظریہ اختیار کرنے والوں کی شدید مذمت کی ہے اور لوگوں کو اس روش کے برے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور اس طرز فکر سے بچنے کی بہت تلقین کی ہے۔[۱]

والحمد للہ رب العالمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین المعصومین

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۱۷، ابواب صفات القاضی، باب وجوب الجمع بین الاحادیث المختلفۃ و باب عدم جواز استنباط الاحکام النظریہ من ظواہر القرآن

ضمیمہ (۱)

اَمثال الحدیث

مقالہ نگار: رضا بابائی

ترجمہ: رضا حسین رضوانی

اقتباس از: آشنائی باحدیث، مطبوعہ دار الحدیث، قم

ضرب المثل اُس مختصر اور پُر معنی جملے کو کہتے ہیں جو عرصۂ دراز سے کسی خاص موقع پر بطور مثال بولا جاتا ہے۔ ضرب المثل انسانی مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے اور اپنی شیرینی اور حلاوت کی وجہ سے زبان زدِ عام ہوجاتی ہے۔ کلام کے معنی کو بہتر طور پر سمجھنے یا کلام کی تاثیر کو بڑھانے کے لیے اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ضرب المثل کا برمحل استعمال کلام کو خوب صورت بنا دیتا ہے لیکن اس کے بے موقع استعمال سے کلام کا پہلا حسن بھی جاتا رہتا ہے۔

ہر ضرب المثل کے پس منظر میں عموماً کوئی قصہ ہوتا ہے۔ بہت سی اَمثال سچے قصوں، افسانوں، دینی تعلیمات و اصولوں یا شخصی تجربوں پر مبنی ہیں اور بعض اہم تاریخی واقعات سے برآمد ہوئی ہیں۔[۱] جن داستانوں یا افسانوں سے یہ امثال بنی ہیں اسے اس مثل کی شانِ نزول کہتے ہیں اور بہت سی تاریخی ضرب الامثال کے پس منظر کی تحقیق ہوچکی ہے۔

بلاشبہ دینی متون اور اسلامی تعلیمات اہل ایران کے لیے فارسی زبان کی اَمثال وحکم کے اہم منابع ہیں۔ اس مقالہ میں ہم نے چند ایسی اَمثال بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن کی بنیاد معصوم کی

۱۔ اَمثال وحکم، علی اکبر دھخدا، مطبوعہ امیر کبیر، تہران۔ ریشہ ہای تاریخی اَمثال وحکم، مہدی پرتوی آملی، مطبوعہ سنائی، تہران

حدیث پر ہے تاکہ معلوم ہو کہ فارسی بولنے والوں نے ان اَمثال کے سلسلے میں حدیث یا قولِ معصوم سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

بہت سی اَمثال کا حدیث سے تعلق اس قدر واضح ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ کچھ اَمثال تو ایسی ہیں جو عربی زبان میں ہی جوں کی توں رائج ہوگئی ہیں لیکن کچھ ایسی ضرب الامثال بھی ہیں جو صرف احادیث سے ہم آہنگ اور ہم معنی ہیں۔ لفظی دلائل اور دیگر شواہد کو دیکھتے ہوئے اُن کی تاثیر یا تاثر کے بارے میں بات نہیں کی جا سکتی البتہ یہ بات شک و شبے سے بالاتر ہے کہ فارسی اَمثال میں اسلامی احادیث اولین منابع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فارسی اَمثال میں حدیث کی تاثیر دو طرح کی ہیں :

(۱) معنوی تاثیر

(۲) لفظی ۔ معنوی تاثیر

بعض اَمثال ایسی ہیں جن پر وہ معنی حاوی ہیں جو حدیث میں بیان کئے گئے ہیں بغیر اس کے کہ اُس حدیث کے الفاظ سے فائدہ اٹھایا گیا ہو لیکن کئی غیر معنی اَمثال ایسی ہیں جن کے الفاظ حدیث کے عربی متن سے مستعار لیے گئے ہیں یا کسی تبدیلی کے بغیر حدیث کے عین وہی الفاظ و معنی لیے گئے ہیں۔ ذیل میں ہم مذکورہ بالا دونوں صورتوں کے نمونے پیش کر رہے ہیں :

معنوی تاثیر

فارسی زبان کی بہت سی تمثیلوں یا اَمثال کی جڑیں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور اہل بیت پاکؑ کی روایات میں موجود ہیں اگرچہ ان احادیث کے زیادہ تر لفظوں اور جملوں سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے لیکن اُن کے مفہوم سے ضرور استفادہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ بعض اَمثال ہم معنی ہیں اور اُن کا تعلق بابِ توارُد[1] سے ہے چنانچہ اُن کی تاثیر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ توارُد یعنی مختلف منابع سے ملنے والی دو باتیں جو "ہم معنی" ہوں مگر انھوں نے ایک دوسرے سے اثر نہ لیا ہو۔ ادب کی اصطلاح میں توارُد کا مطلب ہے دو شاعر ایک دوسرے کو بغیر سنے ایسا شعر کہیں جو لفظ اور معنی میں یکساں ہو اور لگے کہ ایک شاعر دوسرے سے متاثر ہوا ہے۔ (رضوانی)

اس مقالہ میں ہم نے کوشش کی ہے کہ اُن نمونوں کو پیش کر کے یہ بتائیں کہ حدیث کی تاثیر پوری طرح واضح ہے اور وہ بابِ توارُد سے نہیں ہے۔

نمونے کے طور پر ہم ذخیرۂ حدیث سے مشتے از خروارے چند اَمثال ذکر رہے ہیں:

(۱) آدم کہ پیر شد، حرصش جوان می گردد[۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشِبُّ مِنْهُ اثْنَانِ: اَلْحِرْصُ وَالْاَمَلُ[۲]

آدمی جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اُس میں دو چیزیں جوان ہوجاتی ہیں: لالچ اور امید۔

یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب بوڑھا آدمی مال و منال کی فکر میں ہوتا ہے اور اپنی آخرت کے لیے کوئی کام نہیں کرتا۔

صائب تبریزی نے اِس حدیث کو نظر میں رکھتے ہوئے بوڑھے آدمی کی حرص کو خوابِ گراں سے تشبیہ دی ہے۔ اُن کا شعر ہے:

آدمی پیر کہ شد، حرص جوان می گردد
خواب، در وقتِ سحر گاہ، گران می گردد[۳]

آدمی جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اُس کی حرص زیادہ بڑھ جاتی ہے جیسے صبح کے وقت، نیند زیادہ گہری ہوجاتی ہے۔

(۲) آدم گرسنہ ایمان ندارد[۴]

منابع حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

۱۔ کتاب کوچہ ج ۱، ص ۳۶۴ (حرف آ)

۲۔ الخصال ص ۷۳

۳۔ دیوان صائب تبریزی، گزیدہ اشعار، تک بیتہای برگزیدہ، تک بیت ۶۲۰

۴۔ اَمثال و حکم ج ۱، ص ۲۵

لَوْلَا الْخُبْزُ مَا صُمْنَا وَلَا صَلَّيْنَا[۱]

اگر روٹی نہ ملے تو ہم نہ روزہ رکھتے نہ نماز پڑھتے۔

(اردو کی مثل ہے بھوک میں بھجن بھی نہ ہو)

حکایت کی گئی کہ ایک آدمی بھوک کی شدت سے مرنے کو تھا کہ یکا یک شیطان اُس کے سرہانے پہنچا اور بولا کہ اگر تو اپنا ایمان مجھے بیچ دے تو میں تجھے روٹی دوں گا۔ بھوکے نے شیطان سے روٹی کا ٹکڑا لیا اور کھا گیا۔ جب شیطان نے اُس سے کہا کہ تو مجھے اپنا ایمان دے تو وہ بولا کہ بھوک کی حالت میں میرے پاس ایمان تھا ہی کب کہ میں تجھے بیچوں۔ تو یہ بات خوب جانتا تھا اور تونے کسی چیز کے عوض مجھے روٹی نہیں دی۔[۲]

ایک اور مثل جو اس معنی کی تائید کرتی ہے اور بہت زیادہ بولی جاتی ہے یہ ہے:

اول وجود، بعداً سجود یعنی وجود میں پہلے طاقت تو ہو پھر خدا کی عبادت بھی کریں گے۔

بعض ناسمجھ لوگ اِس مثل سے غلط استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انسان کے پاس مادی وسائل نہ ہوں تو اُس پر خدا کی عبادت واجب نہیں۔

یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ انسان کے جسم و جاں میں قدرت کی دی ہوئی اَن مول نعمتوں سے اتنی توانائی تو بہر حال ہوتی ہے جو عبادت کے لیے کافی ہو۔ اِس بنا پر علمائے اَخلاق تاکید کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی گزر اوقات کے لئے اتنا سر و سامان تو ضرور کرنا چاہیے کہ اُس کے پاس خدا کی عبادت سے منہ موڑنے اور برے اَخلاق اپنانے کا کوئی بہانہ نہ رہے۔

(۳) از قضا، سرکنگبین، صفرا فزود[۳]

یہ مثل دراصل مولانا روم کے مشہور شعر کا مصرع اولیٰ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ المحاسن ج ۲، ص ۵۸۶

۲۔ اَمثال وحکم ج ۱، ص ۲۵

۳۔ اَمثال وحکم ج ۱، ص ۲۵

از قضا ، سر کنگبین ، صفرا فزود
روغن بادام ، خشکی می نمود [۱]

سرکنگبین [۲] نے حرارت اور روغن بادام نے خشکی مزید بڑھا دی۔

یعنی سرکنگبین جو صفرا کا علاج ہے اس نے بیماری کو بڑھا دیا ہے اور روغن بادام نے قبض توڑنے کی بجائے بیمار کے مزاج میں خشکی بڑھا دی ہے۔

یہ مثل اُس وقت بولی جاتی ہے جب کسی چیز کا اثر اُلٹا ہو یا کسی کام کا نتیجہ خلاف توقع ہو۔

یہ مثل حضرت علیؑ کے فرمان سے ماخوذ ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

رُبَّمَا كَانَ الدَّوَاءُ دَاءً وَالدَّاءُ دَوَاءً [۳]

کبھی کبھی دوا بیماری بن جاتی ہے اور بیماری دوا بن جایا کرتی ہے۔

اگرچہ قرآن مجید اور اسلامی روایات میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے اور تشویق دلائی گئی ہے کہ وہ مادی اسباب و وسائل سے فائدہ اُٹھائیں مگر کبھی کبھی مادی اسباب مقصود کے برخلاف نتیجہ دیتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کوئی دوسرا سبب، ان اسباب کو جنھیں ہم بروئے کار لائے ہیں نتیجہ بخش ہونے سے روک دے چنانچہ اسباب و وسائل پر بھروسا کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر عوامل و اسباب سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

از سبب سازی اش ، من سودائی ام
وز سبب سوزی اش ، سوفسطائی ام [۴]

سبب مہیا کرنے کے لحاظ سے میں سودائی ہوں اور اُس سبب کو جلا دینے کے لحاظ سے

۱۔ مثنوی ، دفتر اول ، بیت ۵۳

۲۔ سرکہ اور انگبین (شہد) کا شربت۔

۳۔ نہج البلاغہ ، مکتوب ۳۱ ، امام حسنؑ کو وصیت

۴۔ مثنوی ، دفتر اول ، بیت ۵۴۸

میں سوفسطائی ہوں۔

(۴) استخوان در گلو و خار در چشم داشتن[۱]

یہ مثل نہج البلاغہ کی اُس عبارت سے لی گئی ہے جس میں حضرت امیر المومنینؑ نے اپنی مظلومیت وتنہائی اور جبری سکوت کو بیان فرمایا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پریشان کن حالات پیش آنے پر آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔

فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًا[۲]

(ان حالات میں) میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غبارِ اندوہ کی) خلش تھی اور حلق میں (غم واندوہ کے) پھندے پڑے ہوئے تھے۔

آج بھی بہت سارے لوگ جو نامساعد حالات پر صبر کرتے ہیں اور اپنے دفاع کی طاقت نہیں رکھتے وہ یہ جملہ دہراتے ہیں۔

(۵) اول سلام، بعداً کلام[۳]

سید الشہداء حضرت امام حسینؑ سے نقل ہوا ہے: اَلسَّلَامُ، قَبْلَ الْكَلَامِ یعنی سلام کے بغیر گفتگو شروع نہ کرو۔[۴]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے:

مَنْ بَدَأَ بِالْكَلَامِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيبُوهُ[۵]

جو شخص سلام کرنے سے پہلے بات کرے اُس کی بات کا جواب نہ دو۔

۱۔ کتاب کوچہ ج ۲، ص ۴۵۷ (حرف الف)

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳، شقشقیہ

۳۔ دوازدہ مثل فارسی ص ۱۶۵

۴۔ تحف العقول ص ۲۴۶

۵۔ کافی ج ۲، ص ۶۴۴، حدیث رقم ۲

جب لوگ آپس میں ملاقات کریں تو سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کریں کیونکہ سلام سے دوستی بڑھتی ہے۔ جو گفتگو سلام کے ساتھ شروع کی جائے وہ تلخی اور دشمنی سے محفوظ ہوتی ہے۔

(۶) "ما خلق اللہ" اش، عیب دارد[۱]

یہ جملہ طنزاً اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کم عقل ہو۔ اس بات کو کبھی یوں بھی کہتے ہیں: "اول ما خلق اللہ اش را اجارہ دادہ است" یعنی اُس نے اپنی عقل دوسرے کو سونپ دی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ جس چیز کو خدا نے سب سے پہلے خلق فرمایا وہ عقل تھی۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ[۲]

حدیث کی یہ مثل اُس وقت بولی جاتی ہے جب کسی آدمی کی عقل واجبی ہو اور اُس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو۔

(جب کوئی بے تکی بات کہے تو اردو کی یہ مثل بولی جاتی ہے: عقل بڑی کہ بھینس)

(۷) با توکل، زانوی اُشتر ببند[۳]

حضرت امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوا اور بولا: یا رسول اللہؐ! اونٹ کو کھلا چھوڑ دوں اور خدا پر توکل کروں یا اُس کے گھٹنے باندھ دوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ[۴]

اونٹ کو باندھ دو اور خدا پر توکل کرو۔

۱۔ قند و نمک ص ۹۸

۲۔ بحار الانوار ج ۱، ص ۹۷، حدیث رقم ۸

۳۔ امثال وحکم ج ۱، ص ۳۴۷

۴۔ ارشاد القلوب ج ۱، ص ۱۲۱

اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ توکل کو سستی، بے کاری اور سہل انگاری کا بہانہ نہ بناؤ بلکہ مادی اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھاؤ جو ہر کام میں کامیابی کی شرط ہے۔

(۸) یک روز عدالت بهتر از هزار سال عبادت[۱]

یہ مثل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے ماخوذ ہے:

عَدْلُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَبْعِيْنَ سَنَةً[۲]

عدل و انصاف کا ایک لمحہ ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اس حدیث شریف سے اور فارسی کی اس مثل سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگان دین کے نزدیک عدل و انصاف کرنے سے بڑی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ حافظ کہتے ہیں:

شاه را به بود از طاعت صد ساله و زهد
قدر یک ساعته عمری که در آن، داد کند[۳]

شاہ نے اطاعت اور زہد میں جو سو سال گزارے اُس سے بہتر تھا کہ وہ پوری زندگی کا ایک لمحہ انصاف میں گزارتا۔

(۹) هر سخن، جائی و هر نکته، مکانی دارد[۴]

یعنی ہر بات کا کوئی نہ کوئی موقع محل ہوا کرتا ہے۔

(اردو میں یہ مثل یوں بھی مستعمل ہے: ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد)

دراصل یہ مثل حافظ شیرازی کے مشہور شعر کا مصرع ہے:

با خرابات نشینان، ز کرامات ملاف
هر سخن، وقتی و هر نکته، مکانی دارد[۵]

۱۔ دوازدہ مثل فارسی ص ۱۰۷

۲۔ مشکاۃ الانوار ص ۳۱۶

۳۔ دیوان حافظ، غزل ۱۹۰

۴۔ امثال و حکم ج ۴، ص ۱۹۳۰

۵۔ دیوان حافظ، غزل ۱۲۵

حضرت امیر المومنینؑ کے کلمات میں ایک مختصر سا جملہ ہے جو اس مثل کا منبع ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ حافظ اسی سے متاثر ہوئے ہوں۔ امام علیؑ نے فرمایا ہے:

لِکُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ[۱]

ہر بات کے لیے ایک موقع محل ہوتا ہے۔

یعنی ہر بات ہر جگہ نہیں کہی جاتی۔ اسے مناسب جگہ پر کہنا چاہیے تاکہ وہ بے اثر نہ ہو جائے۔ جو بات یا جو نکتہ مناسب موقع و محل پر نہیں بولا جاتا وہ اُس بارش کی طرح ہوتا ہے جو بے موسم برسے اور ممکن ہے کہ نقصان پہنچائے۔

(۱۰) دوری و دوستی[۲]

فارسی کی اس مشہور مثل کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے سے خال خال ملتے ہیں اُن کی دوستی زیادہ مضبوط ہوتی ہے البتہ عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جو دوست ہر روز اور ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اُن کی دوستی بھی دشمنی میں تبدیل نہیں ہوتی۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ اگر لوگ ایک دوسرے سے وابستہ رہیں اور اکثر ملتے رہیں تو اُن کی دوستی کم ہو جاتی ہے جبکہ وہ دوست جو ایک عرصے سے نہ ملے ہوں اور دور ہوں اُن سے ملنے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔

(اردو کی مشہور مثل ہے: قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا)

روایت ہے کہ ایک صحابی کو جب بھی فرصت ملتی تو وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے فرمایا:

زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا[۳]

چند دن کا وقفہ دے کر ملنے سے محبت بڑھتی ہے۔

۱۔ غرر الحکم، حدیث رقم ۷۲۹۳

۲۔ امثال و حکم ج ۲، ص ۸۳۵

۳۔ بحار الانوار ج ۷۱، ص ۳۵۵

لفظی ۔ معنوی تاثیر

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کبھی کبھی مثل میں حدیث کا پیغام نظر آتا ہے یا اُس کی روح نظر آتی ہے لیکن فارسی الفاظ میں۔ اور کبھی کبھی معنی سے بڑھ کر الفاظ بھی حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ طاہرینؑ سے لیے گئے ہیں۔ دراصل یہ مختصر احادیث عربی زبان میں ہی مشہور ہو گئی ہیں البتہ ممکن ہے کہ جو ایسی احادیث میں سے کسی حدیث کو استعمال کرے وہ اس مثل کے حرف بحرف معنی نہ جانتا ہو مگر اس کے مفہوم سے واقف ہو۔

اب ہم چند ایسی احادیث کے نمونے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

(۱) اِرْحَمْ، تُرْحَمْ

منابع احادیث میں ملتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے نوف بکالی سے فرمایا:

یَا نَوْفُ اِرْحَمْ تُرْحَمْ [۱]

اے نوف! رحم کر تا کہ تجھ پر رحم کیا جائے۔

آج کل یہ جملہ ضرب المثل کے طور پر بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک تم دوسروں پر ترس نہیں کھاؤ گے دوسرے بھی تم پر رحم نہیں کھائیں گے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ لَا یَرْحَمْ، لَا یُرْحَمْ [۲]

جو آدمی رحم نہیں کرتا، اُس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

۱۔ شیخ صدوق، امالی ص ۲۷۸

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ ج ۴، ص ۳۸۰، حدیث رقم ۵۸۱۰

لکھا ہے کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ نے اپنے ایک نواسے کو زانو پر بٹھا رکھا تھا اور اسے بار بار چوم رہے تھے۔ ایک شخص نے — جو اکابرین قریش میں سے تھا — رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل کو دیکھا اور آپ پر اعتراض کرتے ہوئے بولا: میرے دس بیٹے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے فرمایا: جس کے دل میں رحم نہیں ہوتا اُس پر رحم نہیں کھایا جاتا۔ اگر خدا نے تیرے دل سے رحم کو نکال دیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مَنْ لَا یَرْحَمْ، لَا یُرْحَمْ[1]

اس حدیث شریف کی فارسی مثل اس طرح ہے:

ہر کہ رحمت نہ کند، بروی، رحم نمی کنند[2]

سعدی شیرازی نے اپنے قصیدے میں کہا ہے:

ببری مال مسلمان و چو مالت ببرند
بانگ و فریاد، بر آری کہ مسلمانی نیست

(۲) اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ[3]

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد عالیشان ہے: اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

یہ خوب صورت مثل اُس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی حق بات کو اس بہانے سے نہیں سنتا یا اسے ہلکا سمجھتا ہے کہ یہ بات کہنے والا اُس کا مخالف ہے یا وہ اُس شخص کو پسند نہیں کرتا۔ بنا بریں امام عالی مقام کے اس فرمان کا پیغام یہ ہے کہ حق اور سچ بات کو قبول کرنا چاہیے خواہ کوئی بھی کہے۔

اسی طرح نہج البلاغہ میں امام عالی مقام کا یہ فرمان بھی ملتا ہے:

۱۔ بحار الانوار ج ۴۳، ص ۲۹۵، حدیث رقم ۵۶

۲۔ امثال وحکم ج ۴، ص ۱۹۶۴

۳۔ غرر الحکم، حدیث رقم ۵۰۴۸

مَنِ اسْتَقْبَلَ وُجُوْهَ الْآرَاءِ عَرَفَ مَوَاقِعَ الْخَطَاءِ[۱] جو شخص مختلف لوگوں سے رائے مشورہ[۲] کرتا ہے وہ خطا و لغزش کے مقامات کو پہچان لیتا ہے۔

(۳) اَلْجَارُ، ثُمَّ الدَّار

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ''پہلے پڑوس والے، پھر گھر والے''

یہ جملہ اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب پڑوسیوں کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہو اور ہم اُن کو اپنے اوپر فوقیت دینے کے قائل ہوں۔ فارسی بولنے والے بہت سے لوگ اس حدیث کو گھر کرائے پر دینے یا خریدنے کے وقت بولتے ہیں اور اس سے اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلے ہمسایوں کے اچھا ہونے کے بارے میں اطمینان کر لیں پھر گھر خریدیں یا کرائے پر لیں۔

یہ حدیث شریف دو طرق سے آئی ہے جن میں سے ایک اسی معنی کو ثابت کرتا ہے۔ کتاب الجعفریات میں ہے کہ ایک صحابی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور بولا کہ میں گھر خریدنا چاہتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں اور کس قبیلے کے درمیان گھر لوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْجَارُ، ثُمَّ الدَّارُ[۳]

یہی حدیث حضرت امام حسنؑ امام مجتبیٰؑ سے نقل ہوئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ایک رات میں نے دیکھا کہ میری والدہ محترمہ وقتِ سحر کے قریب نماز اور دعا میں مشغول تھیں۔ میں بستر میں لیٹا ہوا تھا اور سن رہا تھا کہ وہ اپنے جاننے والوں اور پڑوسیوں میں سے ہر ایک کا نام لے کر اُن کے لیے دعا کر رہی ہیں مگر اپنے لیے کوئی دعا نہیں مانگ رہیں۔ سحر کے وقت میں نے اُن سے پوچھا کہ مادر گرامی آپ نے اپنے دعا کیوں نہیں مانگی؟ انھوں نے فرمایا: ''بیٹا پہلے پڑوس والے، پھر گھر والے۔''[۴]

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۷۳

۲۔ قرآن مجید میں بھی مشاورت کی اہمیت و افادیت کا ذکر ہے مگر مشاورت ہر کہ و مہ سے نہیں ہو سکتی۔ مشاورت کا مطلب اُن لوگوں سے مشورہ کرنا ہے جو اُس معاملے کی نزاکتوں اور ضرورتوں کو سمجھتے ہیں جس میں مشورہ درکار ہوتا ہے۔ (رضوانی)

۳۔ الجعفریات ص ۱۶۴

۴۔ بحار الانوار ج ۴۳، ص ۸۱

(۴) بِشَرْطِهَا وَ شُرُوْطِهَا[1]

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کا یہ مشہور جملہ جو آپ نے نیشاپور سے گزرتے ہوئے لوگوں کے ایک ہجوم میں ارشاد فرمایا تھا جوں کا توں فارسی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز کسی اہم شرط یا بہت سے شرائط سے مشروط ہوتی ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام خراسان کے تاریخی سفر پر جاتے ہوئے جب نیشاپور پہنچے تو آپ نے اپنے چاہنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: میں نے اپنے والد ماجد سے سنا اور انھوں نے اپنے آبائے کرام سے سنا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: میں نے اپنے پدر بزرگوار سے سنا اور انھوں نے اپنے پدر بزرگوار سے اور انھوں نے اپنے آبائے کرام سے سنا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدائے عزوجل فرماتا ہے: كَلِمَةُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِيْ فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اٰمِنَ مِنْ عَذَابِيْ یعنی کلمۂ توحید میرا قلعہ ہے۔ جو اس قلعے میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔'' پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: بِشَرْطِهَا وَ شُرُوْطِهَا وَ اَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا کچھ شرائط کے ساتھ اور میں اُن میں سے ایک شرط ہوں۔[2]

(۵) اَلْحَسُوْدُ لَا يَسُوْدُ[3]

یہ مثل انھی الفاظ میں حضرت امیرالمومنینؑ سے نقل ہوئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حاسد ہرگز ترقی نہیں پاتا اور نمایاں مقام تک نہیں پہنچتا۔

اس حدیث کا مطلب — جو ایک مثل بن گئی ہے — یہ ہے:

''حسود ہرگز نیاسود'' یا ''حسود ہرگز سود نمی برد''

''حسد کرنا ہرگز فائدے کو جنم نہیں دیتا'' یا ''حسد کرنے سے ہرگز فائدہ نہیں ہوتا''

اگرچہ ان دونوں جملوں کا مضمون مستقل ہے جو شاید درست ہو مگر اِس حدیث شریف کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

۱۔ قند و نمک ص ۱۶۷

۲۔ عیون اخبار الرضا ج ۲، ص ۱۳۵، حدیث رقم ۴

۳۔ اَمثال وحکم دہخدا ج ۱، ص ۲۴۲۔ ارشاد القلوب ج ۱، ص ۱۲۹

(۶) اَلْاِنْسَانُ عَبِيْدُ الْاِحْسَانِ[1]

یہ مثل تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت امیرالمومنینؑ کے کلام میں آئی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ[2]

آدمی نیکی اور احسان کا بندہ ہے۔

یعنی انسان دوسروں کی نیکی کے آگے جھک جاتا ہے۔

احادیث سے ماخوذ لفظی اور معنوی تاثیر رکھنے والی دیگر امثال کو ہم نے اختصار کے پیش نظر یہاں بیان نہیں کر رہے لیکن ایسی دو چار احادیث کا مفہوم ذیل میں بیان کر رہے ہیں:

(۱) اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ

یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریقوں پر چلتے ہیں۔

یہ جملہ حضرت امیرالمومنینؑ کی اُس حدیث سے مماثل ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

اَلنَّاسُ بِاُمَرَائِهِمْ اَشْبَهُ مِنْهُمْ بِآبَائِهِمْ[3]

لوگ اپنے آباء و اجداد سے زیادہ اپنے حکمرانوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔

(۲) اَلْاِنْسَانُ حَرِيْصٌ عَلٰى مَا مُنِعَ[4]

یعنی انسان کو جس چیز سے منع کیا جائے وہ اُس چیز کا حریص ہوتا ہے۔

(۳) اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ[5]

یعنی صفائی ایمان کی نشانی ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ، يُحِبُّ الْجَمَالَ[6]

یعنی اللہ جمیل ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔

۱۔ امثال و حکم ج ۱، ص ۲۳۶ ۲۔ غرر الحکم، حدیث رقم ۲۶۳

۳۔ تحف العقول ص ۲۰۸ ۴۔ مج الدعوات ص ۱۲۲ میں ہے اِنَّ ابْنَ آدَمَ حَرِيْصٌ عَلٰى مَا مُنِعَ

۵۔ امثال و حکم ج ۱، ص ۲۷۹۔ بحار الانوار ج ۵۹، ص ۲۹۱

۶۔ امثال و حکم ج ۱، ص ۲۶۹۔ کافی ج ۲، ص ۴۳۸، حدیث رقم ۱

ضمیمہ (۲)

جعلی احادیث کے کچھ نمونے

مقالہ نگار: استاد کاظم مدیر شانہ چی

ترجمہ: علی محمد رحمانی

اقتباس از: علم الحدیث، مطبوعہ دفتر انتشارات اسلامی، قم

مناسب ہوگا کہ ہم یہاں شیخ بہاء الدین عاملی کی کتاب اربعین سے مشہور جعلی احادیث کے کچھ نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کریں جن کو علم الحدیث کے ماہر علماء نے اس علم کے قواعد کی رُو سے جعلی قرار دیا ہے۔ اگرچہ ایسی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ہم (بحار الانوار جلد ۳۰ سے) مشتے از خروارے چند موضوع احادیث کے نمونے نقل کر رہے ہیں:

(۱) اَلشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ بدبخت ماں کے شکم میں ہی بدبخت ہوتا ہے۔[۱]

(۲) اَلْجَنَّۃُ دَارُ الْاَسْخِیَاءِ سخی لوگوں کا مسکن جنت ہے۔

(۳) طَاعَۃُ النِّسَاءِ نَدَامَۃٌ عورت کی تابعداری، شرمندگی کا باعث بنتی ہے۔

(۴) دَفْنُ الْبَنَاتِ مِنَ الْمَکْرُمَاتِ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا قابل تعریف ہے۔

۱۔ اس حدیث کو مرحوم مامقانی نے مقباس الدرایہ میں من گھڑت قرار دیا ہے۔ نیز ابن شہر آشوب نے "متشابہات القرآن" میں اس کے جعلی ہونے کی تصدیق کی ہے مگر شیخ صدوق نے کتاب توحید میں اس حدیث کو امام کے بیان کردہ مطلب کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح طریحی نے بھی مجمع البحرین میں مادہ شقاء کی بحث میں اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

(۵) اُطْلُبِ الْخَيْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ خوبصورت چہروں سے بھلائی مانگو۔

(۶) لَا هَمَّ اِلَّا هَمُّ الدَّيْنِ وَلَا وَجَعَ اِلَّا وَجَعُ الْعَيْنِ قرضے کے علاوہ کوئی پریشانی نہیں اور آشوب چشم کی تکلیف کے سوا کوئی تکلیف نہیں۔

(۷) اَلْمَوْتُ كَفَّارَةٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ موت، مسلمانوں کے ہر گناہ کا کفارہ ہے۔

(۸) اِنَّ التُّجَّارَ هُمُ الْفُجَّارُ تاجر بدچلن ہوتے ہیں۔

(۹) زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا چند دن کا وقفہ دے کر ملنے سے محبت بڑھتی ہے۔

(۱۰) اَلنَّظَرُ اِلَى الْخُضْرَةِ تَزِيْدُ فِي الْبَصَرِ سبزہ دیکھنے سے بینائی تیز ہوتی ہیں۔

(۱۱) ان النبی قال: اِنَّ اللّٰهَ يَتَجَلّٰى لِلْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَامَّةً وَيَتَجَلّٰى لَكَ يَا اَبَا بَكْرٍ خَاصَّةً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ لوگوں کو قیامت کے دن عام دیدار کرائے گا اور اے ابوبکرؓ تم کو خاص دیدار کرائے گا۔

(۱۲) قَالَ حَدَّثَنِيْ جِبْرَئِيْلُ: اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمَّا خَلَقَ الْاَرْوَاحَ اخْتَارَ رُوْحَ اَبِيْ بَكْرٍ مِنَ الْاَرْوَاحِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو خلق کیا تو اُن سب میں سے ابوبکرؓ کی روح کو منتخب فرمایا۔

(۱۳) اَنَّ اَوَّلَ مَنْ يُعْطٰى كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَلَهٗ شُعَاعٌ كَشُعَاعِ الشَّمْسِ قِيْلَ فَاَيْنَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ سَرَقَتْهُ الْمَلَائِكَةُ سب سے پہلے جس کے ہاتھ میں نامۂ عمل دیا جائے گا وہ عمر بن خطاب ہوں گے۔ ان کا چہرہ سورج کی طرح چمک رہا ہوگا۔ پوچھا گیا ابوبکر کہاں ہیں؟ (حالانکہ وہ عمر سے افضل ہیں) فرمایا: انھیں فرشتے چرا کر لے گئے۔

(۱۴) مَنْ سَبَّ اَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ قُتِلَ وَمَنْ سَبَّ عُثْمَانَ وَعَلِيًّا جُلِدَ الْحَدَّ جو کوئی ابوبکرؓ اور عمرؓ کو گالی دے اسے قتل کر دیا جائے اور جو کوئی عثمانؓ اور علیؓ کو گالی دے اس کو بقدر حد شرعی کوڑے لگائیں جائیں۔

(۱۵) مَنْ قَادَ اَعْمٰى اَرْبَعِيْنَ خُطْوَةً غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ جو شخص چالیس قدم تک کسی نابینا کو راستہ بتاتے

ہوئے چلے تو اللہ اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔

(۱۶) اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ علم کی دو قسمیں ہیں: علم ادیان اور علم ابدان۔

(علامہ مجلسی کے علاوہ) شیخ بہاء الدین عاملی نے ان احادیث کو شیخ الحدیث صغانی[1] سے جعلی احادیث کے متعلق اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

اس کے بعد وہ ساتویں صدی ہجری کے ایک ہندوستانی شخص کی حکایت بیان کرتے ہیں جو صحابیِ رسولؐ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست احادیث نقل کرتا تھا اور یہ کہ لوگ بھی اس کی تصدیق کرتے تھے۔

حدیث گھڑنے والے

جب مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی ہے تو بر سبیل تذکرہ کچھ جعلی احادیث گھڑنے والوں کے بارے میں بتا دیا جائے۔ کتاب ''الغدیر'' کے مطابق کچھ جعلی احادیث گھڑنے والے افراد کا تذکرہ کریں گے اور اس کے ساتھ ان کے جھوٹے ہونے پر اس فن کے ماہرین اور علمائے رجال کی تصریح بھی بیان کریں گے۔

ان سے متعلق مزید تفصیل جاننے کے لیے عبقات الانوار کے مصنف علامہ سید میر حامد حسین

۱۔ حسن محمد صغانی یا صاغانی (جو صغانیاں = چغانیاں سے منسوب ہے) علوم ادب کے ایک برجستہ عالم اور محدث گزرے ہیں۔ وہ سید احمد بن طاؤس اور سید عبدالکریم ابن طاؤس کے شیخ الاجازہ تھے۔ حدیث کے متعلق ان کی درج ذیل کتابیں بہت مشہور ہیں:

شرح صحیح بخاری، مشارق الانوار النبویۃ من صحاح الاخبار المصطفویہ (جو استنبول سے شائع ہوئی ہے)،

الدرر الملتقطۃ فی بیان الاحادیث الموضوعہ (شیخ بہائی نے مذکورہ بالا احادیث کو اسی کتاب سے نقل کیا ہے)۔

لکھنوی (متوفی ۱۳۰۶ھ) کی تالیف ''استقصاء الافہام'' کی پہلی جلد ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) **ابو سعید ابان بن جعفر بصری:** یہ ایک جھوٹا شخص تھا جو احادیث گھڑ کر انھیں پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کر دیتا تھا۔ نیز اس نے ابو حنیفہ سے تین سو سے زائد احادیث نقل کیں حالانکہ ان میں سے کسی ایک روایت کا وہ راوی نہیں تھا۔[۱]

(۲) **ابو اسماعیل ابان بن ابی عیاش:** شعبہ کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص حدیث میں جھوٹ نہیں گھڑتا ہے تو میں اپنی ردا صدقہ کر دوں گا۔ مزید کہتے ہیں کہ زنا کرنا ابان سے حدیث نقل کرنے سے بہتر ہے اور اگر میں گدھے کا پیشاب پی لوں تو یہ ابان سے حدیث کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اس نے صرف انس بن مالک سے پندرہ سو بے بنیاد احادیث نقل کی ہیں۔[۲]

(۳) **ابو منصور ابراہیم بن فضل اصفہانی:** یہ بھی حافظ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو منصور اصفہان کے بازار میں کھڑے ہو کر اپنی زبانی اسناد سے روایت بیان کرتا تھا۔ نیز کہا گیا ہے کہ یہ ایسا جھوٹا آدمی تھا جو کھڑے کھڑے احادیث گھڑ لیتا اور بعض احادیث منکرہ کو صحیح اسناد میں بدل کر نقل کرتا تھا۔

(۴) **ابراهیم بن هدبه:** یہ خبیث بھی جھوٹا آدمی تھا۔ اوٹ پٹانگ احادیث گھڑ کر انھیں انس بن مالک سے منسوب کیا کرتا تھا۔ (منقول از تاریخ بغداد اور مذکورہ بالا تین کتابیں)

(۵) **احمد بن عبداللہ جویباری:** یہ شخص اتنا جھوٹا تھا کہ ''دجال'' کے نام سے مشہور تھا۔

بیہقی کہتے ہیں کہ اس نے ایک ہزار سے زیادہ احادیث گھڑی تھیں۔ حاکم کہتے ہیں کہ اس نے عمر رسیدہ لوگوں کی فضیلت میں ایسی ایسی احادیث گھڑی تھیں کہ ان کا بیان کرنا بھی زیب نہیں دیتا اور

۱۔ ذہبی نے **میزان الاعتدال** میں، مقدسی نے **تذکرۃ الموضوعات** میں اور سیوطی نے **للئالی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ** میں بھی بیان کیا ہے۔

۲۔ ابن حجر عسقلانی، تہذیب

سیوطی کہتے ہیں کہ اس نے کرامیہ کے متعلق ہزاروں احادیث گھڑی تھیں[1] نیز کہا گیا ہے کہ اس نے تقریباً دس ہزار جعلی احادیث گھڑی تھیں۔

(۶) **احمد بن صلت مغلس :** احادیث وضع کرنے والوں میں اس سے زیادہ بے حیا آدمی اور کوئی نہ تھا۔ اس نے ابو حنیفہ کی فضیلت میں احادیث گھڑی تھیں۔

(۷) **ابو بشر مروزی :** ایک نیک اور خوش بیان فقیہ تھا اس کے باوجود اُس نے اپنے باپ اور دادا سے احادیث نقل کیں اور ان احادیث کے لیے معمولی تبدیلی کے ساتھ سند صحیح کا سلسلہ وضع کیا۔[2]

(۸) **ابو عبداللہ باھلی :** یہ غلام خلیل کے نام سے مشہور تھا اور بڑا زاہد شخص تھا مگر حدیثیں گھڑنے میں شہرت رکھتا تھا۔ جب لوگوں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے پوچھا کہ تم ان احادیث کو کہاں سے اور کیوں نقل کرتے ہو تو اس نے کہا: یہ میں نے عام لوگوں کا دل جیتنے کے لیے گھڑی تھیں۔

۱۔ اس فرقے کا بانی محمد بن کرام تھا جسے ایران کے صوبے سیستان سے افغانستان کے پہاڑی علاقے غرجستان کی طرف جلاوطن کیا گیا تھا اور اُس وقت اُس کے پیروکار شورمین اور افشین شہروں کے غریب لوگ تھے۔ وہ محمد بن طاہر کی حکومت کے دوران نیشاپور آ گیا تھا اور اس شہر کے مضافات میں چند کسانوں نے اس کی بدعتوں کی پیروی شروع کر دی لیکن آج اُس کے پیروکاروں کی گمراہی ہر جگہ پھیل چکی ہے۔ جس میں سے ایک یہ ہے کہ ابن کرام اپنے پیروکاروں کو خدا کے مجسم ہونے پر یقین رکھنے کی ہدایت کرتا تھا۔ چنانچہ ابن کرام اپنی کتاب میں لکھتا ہے: خدا اپنے تخت سے چپکا ہوا ہے اور عرش پر متمکن ہے۔ (ترجمہ الفرق بین الفرق، ابو منصور بغدادی ص ۲۲۰)

اس کتاب کے حاشیے میں جواد مشکور نے اس کے حالات لکھے ہیں اور اس کے عقائد کی تفصیل مرحوم اقبال آشتیانی کی چھاپی ہوئی تبصرۃ العوام ص ۶۴ تا ۷۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ابن کرام ۲۵۵ھ میں وفات پا گیا۔ اُس کے باپ کے ''کرام'' کہلانے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کھجور کے ایک باغ کا مالک تھا۔ کرم (کاف پر فتح کے ساتھ) انگور کے درخت کو کہا جاتا ہے۔ حواشی سعید نفیسی بر تاریخ بیہقی ج ۲، ص ۹۱۵

۲۔ نقل از شذرات الذھب

(۹) **سلیمان نخعی** : اس کا شمار زاہدوں میں ہوتا تھا، اس کے دن روزوں اور راتیں عبادتوں میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود حاکم نیشاپوری کہتے ہیں کہ سلیمان حدیثیں گھڑا کرتا تھا اگرچہ وہ بلاشبہ بہت عبادت گزار شخص تھا۔[1]

(۱۰) **اسحاق بن مهشاد** : یہ "مذہب کرامیہ" کے متعلق جھوٹی حدیثیں گھڑتا تھا۔ اس نے محمد بن کرام کے فضائل میں ایک کتاب لکھی تھی جو جھوٹی احادیث سے بھری ہوئی ہے۔[2]

(۱۱) **عبدالمغیث حنبلی بغدادی** : (متوفی ۵۸۳) یہ حافظ تھا۔ اس نے یزید بن معاویہ کے فضائل پر ایک کتاب لکھی جو پوری کی پوری جھوٹی احادیث پر مشتمل تھی۔

ابن جوزی نے اس کی رد میں **الرد علی المتعصب العنید عن لعن یزید** کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔[3]

علامہ امینی نے الغدیر کی پانچویں جلد میں سات سو مشہور کذابین اور جھوٹی احادیث گھڑنے والوں کے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ ہم نے بطور نمونہ صرف چند کے حالات بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک گروہ زاہدوں اور عبادت گزاروں میں شمار ہوتا تھا لیکن غلط نظریات پھیلانے اور جھوٹی حدیث گھڑنے میں بے باک تھا بلکہ یہ لوگ اس کام کے عوض ثواب اور اجر کی امید رکھتے تھے۔

چنانچہ ابوعصمت سے پوچھا گیا کہ تم نے قرآن اور اس کی سورتوں کی فضیلت میں ابن عباس سے یہ ڈھیر ساری حدیثیں کہاں اور کس سند سے نقل کی ہیں؟ اس کا جواب تھا کہ جب میں نے دیکھا کہ لوگ قرآن سے روگرداں ہو کر فقہ ابوحنیفہ اور محمد بن اسحاق کی مغازی کی طرف رجوع کر رہے ہیں تو میں نے یہ حدیثیں گھڑ لیں۔

۱۔ سیوطی، **اللئالی المصنوعہ**۔ ابن درویش بیروتی، اسنی المطالب

۲۔ **اللئالی المصنوعہ**

۳۔ شذرات الذہب

حاکم نیشاپوری ایک زاہد سے نقل کرتے ہیں کہ جب اُس سے پوچھا گیا کہ تم نے قرآن اور سورتوں کی فضیلت میں جعلی احادیث کیوں گھڑی تھیں؟ اس نے ابو عصمت کا جواب دہرایا تو اس سے کہا گیا کہ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے اس کا ٹھکانا جہنم ہے؟ اس کا جواب تھا: ما کذبت علیہ انما کذبت لہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ نہیں باندھا بلکہ ان کے فائدے میں حدیث بنائی ہے۔

میسرہ بن عبدربہ کہتا تھا کہ میں نے لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے احادیث وضع کیں جس کا اجر اللہ سے طلب کرتا ہوں۔

ہمارا ان باتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سلسلۂ حدیث کے افراد کا نیک اور عابد و زاہد ہونا اس کا لازمہ نہیں کہ ان کی بیان کردہ احادیث صحیح ہوں بلکہ نقل کرنے والوں کے موثق ہونے کا اطمینان ہونا چاہیے۔ جب کسی حدیث کی سند قابل اطمینان ہو تو عقل کی میزان پر حدیث کے مضمون کو تولنا چاہیے جیسا کہ کہا جاتا ہے: حدیث تدری خیر من الف تروی ایک حدیث کو جاننا ایک ہزار احادیث نقل کرنے سے بہتر ہے۔

خصوصاً اعتقادات مثلاً توحید، صفات الٰہی، امامت، معاد اور معارف کے دوسرے ابواب مثلاً خلقت و مشیت، قضا و قدر، جبر و تفویض، طینت و میثاق، خلقت ارواح و علویات، فضائل و مناقب اور معراجیات وغیرہ لیکن فقہی احکام اور قواعد چونکہ زیادہ تر تعبد پر مبنی ہوتے ہیں اور دوسری طرف حجیت خبر (جو اپنی جگہ ثابت ہے) [۱] کے ادلہ ان کے مضمون کے مطابق عمل ہونے کو لازم قرار دیتے ہیں اس لیے یہ اشکال کم ہی وارد ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے فقہاء نے بہت سی زحمتیں اٹھا کر فقہ سے متعلق احادیث پر تحقیق کی ہے اور ان کی جرح و تعدیل کے لیے قواعد اور قوانین بنائے ہیں۔ [۲]

۱۔ کفایۃ الاصول ج ۲، بحث حجیت ظن

۲۔ شیخ انصاری، رسائل، بحث تعادل و تراجیح۔ کفایۃ الاصول ج ۲، بحث تعادل و تراجیح۔ تقریرات مرحوم نائینی از شیخ محمد علی خراسانی، مذکورہ بحث

نیز فقہی احکام میں جھوٹی احادیث گھڑنے کے دعوے بہت کم کیے گئے ہیں لیکن معارف اور اصول دین میں یہ دعوے زیادہ ہوتے ہیں اور اتفاقاً جو حضرات وعظ و تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں ان کے پیش نظر یہی احادیث رہتی ہیں اور لازمی طور پر ان کا واسطہ ایسی احادیث سے پڑتا ہے اور انھیں اسی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور علماء کی کاوشوں سے یہ کام اب آسان ہو چکا ہے اور اللہ کے اس وعدے کے مطابق کہ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۂ عنکبوت : آیت ۶۹) اب ان کے چشمۂ فیض (کلام معصومین) تک رسائی مل سکتی ہے اور انھوں نے خود کو اور تشنگان معارف کو اس وادی کے سراب سے نکال کر کلمات معصومین کے پاک اور شفاف پانی سے سیراب کیا ہے۔ ان شاء اللہ انھیں ان کاوشوں کی بہترین جزا ملے گی۔

شناختِ حدیث اور اشاعتِ حدیث کی اہمیت

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: حَدِيثٌ فِي حَلَالٍ وَ حَرَامٍ تَأْخُذُهُ مِنْ صَادِقٍ خَيْرٌ لَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيهَا مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ سچے راوی سے حاصل کردہ ایک حدیث تمہارے لیے دنیا اور اس میں موجود تمام سونے اور چاندی سے بہتر ہے۔[1]

مزید فرمایا: اَعْرِفُوا مَنَازِلَ النَّاسِ عَلَى قَدْرِ رِوَايَتِهِمْ عَنَّا لوگوں کی منزلت ہم سے بیان کردہ روایتوں کے لحاظ سے جانو۔[2]

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں: ہمارے شیعوں کی منزلت اور مرتبہ اُن کی نقل کردہ روایت اور معرفت کے لحاظ سے ہے کیونکہ معرفت بھی روایات کی سمجھ بوجھ پر منحصر ہے اور مومن روایت فہمی کے ذریعے ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوجاتا ہے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: اِعْرِفْ مَنَازِلَ الشِّيعَةِ عَلَى قَدْرِ رِوَايَتِهِمْ وَ مَعْرِفَتِهِمْ فَإِنَّ الْمَعْرِفَةَ هِيَ الدِّرَايَةُ لِلرِّوَايَةِ وَ بِالدِّرَايَاتِ لِلرِّوَايَاتِ يَعْلُو الْمُؤْمِنُ إِلَى أَقْصَى (أَفْضَلِ) دَرَجَاتِ الْإِيمَانِ شیعوں کی قدر و منزلت ان کی بیان کردہ روایات اور معرفت کے لحاظ سے پہچانو کیونکہ معرفت ہی روایت کے لیے درایت کا کام دیتی ہے اور روایات کی درایات کے ذریعے مومن ایمان کے بلند ترین درجات پر فائز ہوجاتا ہے۔[3]

۱۔ محاسن برقی ج ۱، ص ۲۲۷۔ بحار الانوار ج ۱، ص ۲۱۴

۲۔ کافی ج ۱، ص ۵۰

۳۔ نوادر فیض کاشانی ص ۳۱۔ بحار الانوار ج ۱، ص ۱۰۶

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے : مَنْ حَفِظَ مِنْ اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا مِمَّا یَحْتَاجُوْنَ اِلَیْهِ مِنْ (فِیْ) اَمْرِ دِیْنِهِمْ بَعَثَهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَقِیْهًا عَالِمًا اگر میرا کوئی امتی شخص چالیس ایسی احادیث یاد کرلے جو دینی امور میں اس کے کام آنے والی ہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقیہ اور عالم دین کی حیثیت سے محشور فرمائے گا۔[1]

اور یہی بات ائمہ طاہرینؑ کی سیرت میں بھی دیکھی جا سکتی ہے چنانچہ روایت ہے[2] کہ امام محمد باقرؑ نے جابر بن عبداللہ انصاری سے تقاضا کیا کہ وہ حدیث لوح کو ان کی خدمت میں پیش کریں جو انھوں نے حضرت فاطمہؑ کے پاس دیکھی تھی۔

اس کام کے لیے امام محمد باقرؑ بنفس نفیس جابر کے گھر تشریف لے گئے اور اس حدیث کا اپنے پاس موجود اصل سے موازنہ کیا۔

نیز روایت ہے کہ حضرت فاطمہؑ کی ایک کنیز نے ایک ایسے ریشمی کپڑے کو گم کر دیا جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ تحریر تھی۔ آپ نے کنیز کو اسے ڈھونڈنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: اُطْلُبِیْهَا فَاِنَّهَا تَعْدِلُ عِنْدِیْ حَسَنًا وَحُسَیْنًا اس تحریر کو ڈھونڈو کیونکہ یہ میرے لیے حسنؑ و حسینؑ سے قیمتی ہے۔[3]

معاویہ بن عمار روایت کرتے ہیں : قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ رَجُلٌ رَاوِیَةٌ لِحَدِیْثِکُمْ یَبُثُّ ذَالِكَ فِی النَّاسِ وَیُشَدِّدُهُ فِیْ قُلُوْبِهِمْ وَقُلُوْبِ شِیْعَتِکُمْ وَلَعَلَّ عَابِدًا مِنْ شِیْعَتِکُمْ لَیْسَتْ لَهُ هٰذِهِ الرِّوَایَةُ اَیُّهُمَا اَفْضَلُ قَالَ الرَّاوِیَةُ لِحَدِیْثِنَا یَشُدُّ بِهِ قُلُوْبَ شِیْعَتِنَا اَفْضَلُ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ معاویہ بن عمار ساباطی — جو امام جعفر صادقؑ کے خاص اصحاب میں سے ہیں — کہتے ہیں کہ میں نے

۱۔ شیخ بہائی، اربعین، حدیث اول۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۱۵۳

۲۔ کافی

۳۔ مقدمہ اصول کافی، (مطبوعہ آخوندی) نقل از سفینۃ البحار

امام عالی مقام کی خدمت میں عرض کیا کہ ایسا شخص جو آپ کی بہت ساری حدیثیں روایت کرتا ہے اور انھیں لوگوں میں عام کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں اور شیعوں کے دلوں میں دین کو مستحکم کرتا ہے یہ افضل ہے یا وہ شیعہ عابد جو کوئی روایت بیان نہیں کرتا؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: جو شخص کثرت روایت کے ذریعے ہمارے شیعوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کا باعث بنتا ہے وہ ہزار عابدوں سے افضل ہے۔[۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: رَحِمَ اللّٰهُ خُلَفَائِيْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ خُلَفَائُكَ قَالَ قَوْمٌ يَأْتُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ يَرْوُوْنَ آثَارِيْ وَ سُنَّتِيْ يُعَلِّمُوْنَهَا النَّاسَ اللہ میرے جانشینوں پر رحم فرمائے۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہؐ! آپ کے جانشین کون ہیں؟ فرمایا: میرے جانشین وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور میرے آثار نقل کریں گے اور لوگوں کو میری سنت کی تعلیم دیں گے۔

دوسری روایت میں رحم اللہ خلفائی تین مرتبہ تکرار ہوئی ہے۔[۲]

دوسری جگہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: سَارِعُوْا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَحَدِيْثٌ وَاحِدٌ تَأْخُذُهٗ عَنْ صَادِقٍ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا حَمَلَتْ مِنْ ذَهَبٍ وَ فِضَّةٍ طلب علم میں جلدی کرو کیونکہ خدا کی قسم جس کے قبضے میں جان ہے، سچے راوی سے اخذ کردہ ایک حدیث دنیا اور اس میں موجود سونے چاندی سے بہتر ہے۔[۳]

جابر کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: لَحَدِيْثٌ تُصِيْبُهٗ مِنْ صَادِقٍ فِيْ حَلَالٍ وَ حَرَامٍ خَيْرٌ لَكَ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ حَتّٰى تَغْرُبَ ایک ثقہ شخص سے اخذ کردہ حلال وحرام کے احکام پر مشتمل ایک حدیث ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔[۴]

۱۔ اصول کافی ج ۱، ص ۳۳، حدیث رقم ۹، باب صفۃ العلم وفضلہ، وفضل العلماء

۲۔ بحار الانوار

۳ و ۴ وسائل الشیعہ ج ۲۷، ص ۹۸

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَ ذَاكَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِرْهَمًا وَلَا دِينَارًا وَإِنَّمَا أَوْرَثُوا أَحَادِيثَ مِنْ أَحَادِيثِهِمْ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِنْهَا فَقَدْ أَخَذَ حَظًّا وَافِرًا علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء ورثے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ وہ لوگوں کے لیے اپنی احادیث چھوڑ کر جاتے ہیں پس جس نے ان سے کچھ حاصل کر لیا اسے وافر حصہ مل گیا۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے: تَذَاكَرُوا وَ تَلَاقَوْا وَ تَحَدَّثُوا فَإِنَّ الْحَدِيثَ جِلَاءٌ لِلْقُلُوبِ ایک دوسرے سے مذاکرہ کرو، ملاقات کرو اور آپس میں احادیث بیان کرو کیونکہ حدیث دلوں کو جلا بخشتی ہے۔[2]

ایک اور جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: الْمُؤْمِنُ إِذَا مَاتَ وَ تَرَكَ وَرَقَةً وَاحِدَةً عَلَيْهَا عِلْمٌ تَكُونُ تِلْكَ الْوَرَقَةُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِتْرًا فِيمَا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ النَّارِ وَ أَعْطَاهُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى بِكُلِّ حَرْفٍ مَكْتُوبٍ عَلَيْهَا مَدِينَةً اگر کوئی مومن انتقال کر جائے اور ایک ایسا صفحہ چھوڑ جائے جس میں علمی بات لکھی ہو تو یہ صفحہ قیامت کے دن اُس کے اور آتش جہنم کے درمیان حائل ہوگا اور اللہ اس صفحے پر لکھے ایک ایک حرف کے بدلے اسے ایک شہر عطا فرمائے گا۔[3]

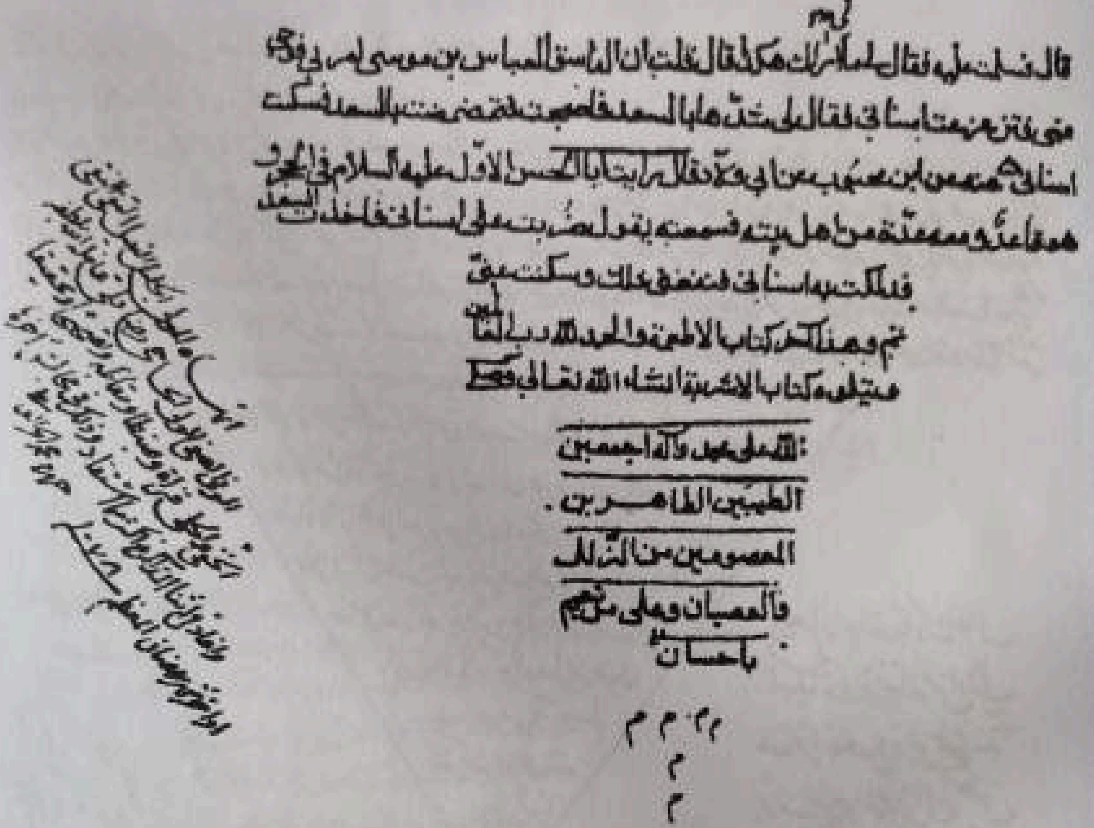
داؤد بن قاسم جعفری کہتے ہیں کہ میں نے یونس کی کتاب ''یوم و لیلہ'' کو امام حسن عسکریؑ کی خدمت اقدس میں پیش کیا تو آپ نے پوچھا: یہ کس کی تصنیف ہے؟ میں نے عرض کیا: یہ یونس مولیٰ آل یقطین کی تصنیف ہے۔ آپ نے فرمایا: أَعْطَاهُ اللهُ بِكُلِّ حَرْفٍ نُورًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اللہ اسے ہر حرف کے بدلے قیامت کے دن ایک نور عطا فرمائے گا۔[4]

۱۔ کافی ج ۱، ص ۳۲

۲۔ نوادر فیض کاشانی ص ۹۔ کافی ج ۱، ص ۴۱۔ ممکن ہے یہاں لفظ حدیث لغوی معنی میں استعمال ہوا ہو یعنی دوستانہ بات چیت

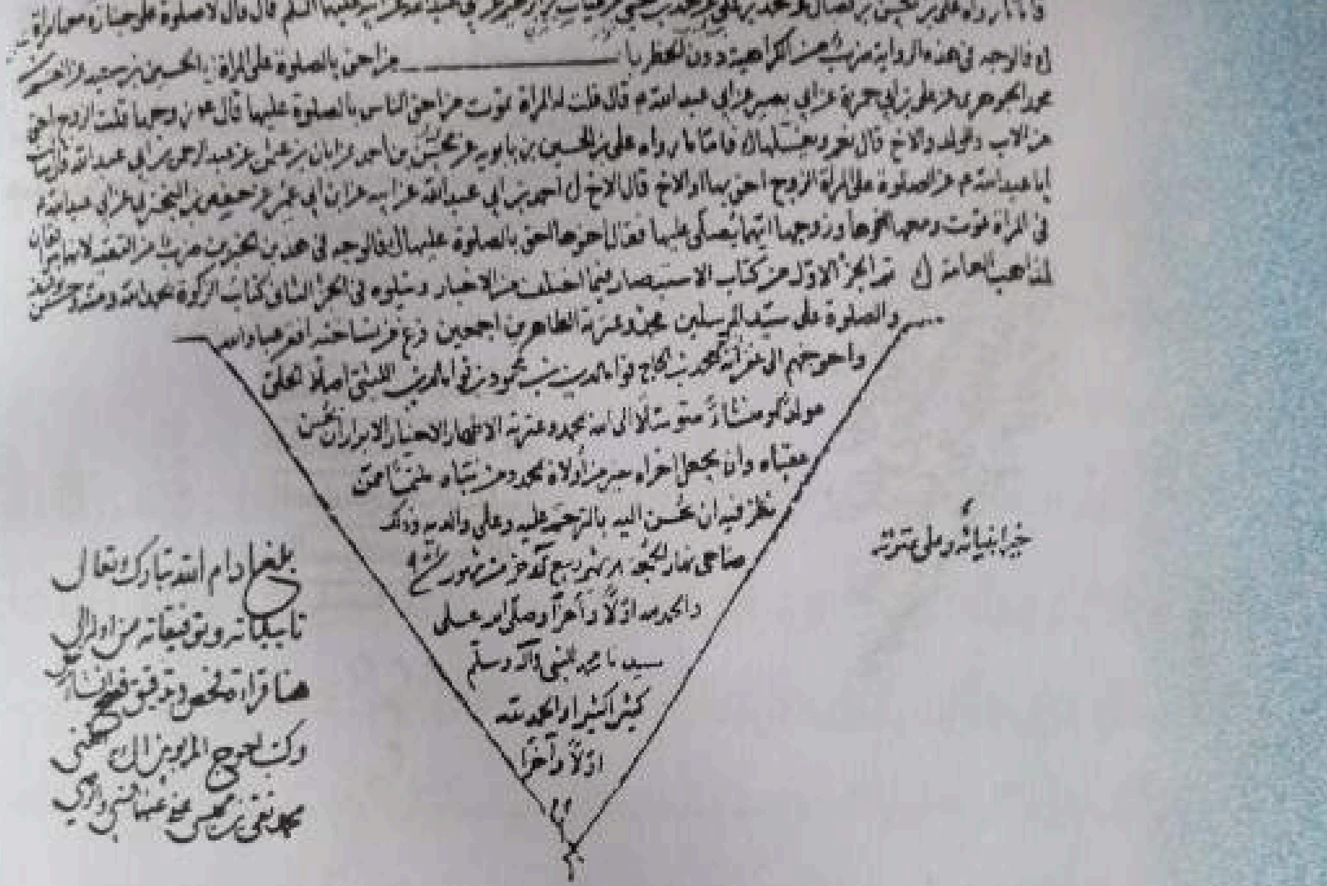
۳۔ نوادر فیض کاشانی ص ۹۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۱۴۴

۴۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۱۵۰



فروع کافی کا صفحہ اور شیخ حر عاملی کا نسخہ جو مؤلف کی ذاتی لائبریری میں ہے۔

(صفحہ ۱۰۰ سے مربوط)

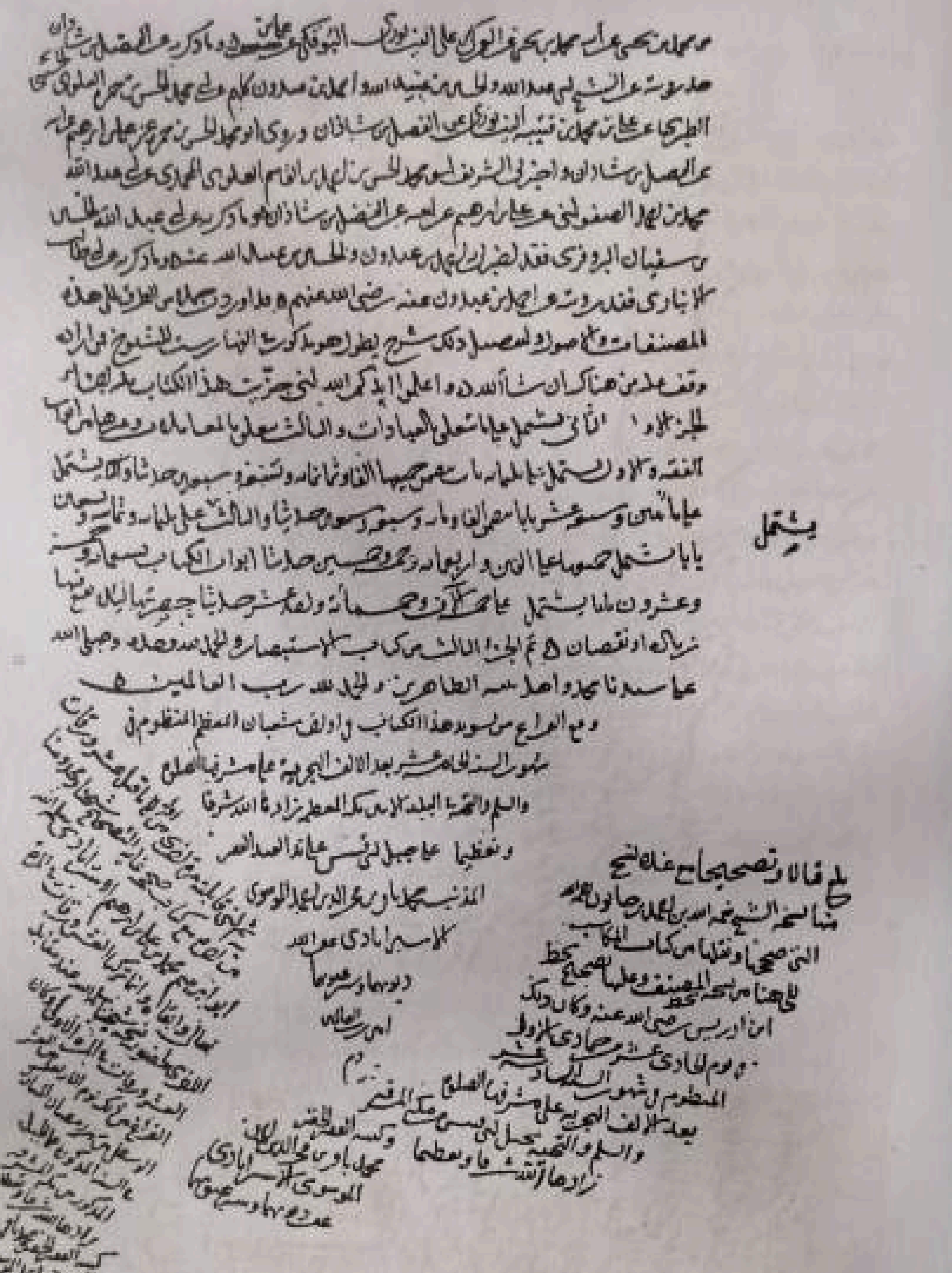


فأما ما رواه علي بن الحسن بن فضال عن محمد بن علي عن محمد بن يحيى عن غياث بن إبراهيم عن أبي عبد الله عن أبيه عليهما السلم قال قال لا صلوة على جنازة معها امرأة
فالوجه في هذه الرواية ضرب من الكراهية دون الحظر با ———— من أحق بالصلوة على المرأة. الحسين بن سعيد عن القسم
عن الجوهري عن علي بن أبي حمزة عن أبي بصير عن أبي عبد الله عم قال قلت له المرأة تموت من أحق الناس بالصلوة عليها قال زوجها قلت الزوج أحق
من الأب والولد والأخ قال نعم ويغسلها. فأما ما رواه علي بن الحسين بن بابويه عن محمد بن يحيى عن أحمد عن ابان بن عثمان عن عبد الرحمن بن أبي عبد الله قال سألت
أبا عبد الله عم عن الصلوة على المرأة الزوج أحق بها أو الأخ قال الأخ. أحمد بن أبي عبد الله عن أبيه عن ابن أبي عمير عن حفص بن البختري عن أبي عبد الله عم
في المرأة تموت ومعها أخوها وزوجها أيهما يصلي عليها فقال أخوها أحق بالصلوة عليها. فالوجه في هذين الخبرين ضرب من التقية لأنهما موافقان
لمذهب العامة. تم الجزء الأول من كتاب الاستبصار فيما اختلف من الأخبار ويتلوه في الجزء الثاني كتاب الزكوة والحمد لله وحده وحسبنا
والصلوة على سيد المرسلين محمد وعترته الطاهرين أجمعين. فرغ من نساخته أقر عباد الله
وأحوجهم إلى غفران الله محمد بن ... [illegible]
[illegible]
كثيراً كثيراً والحمد لله أولاً وآخراً

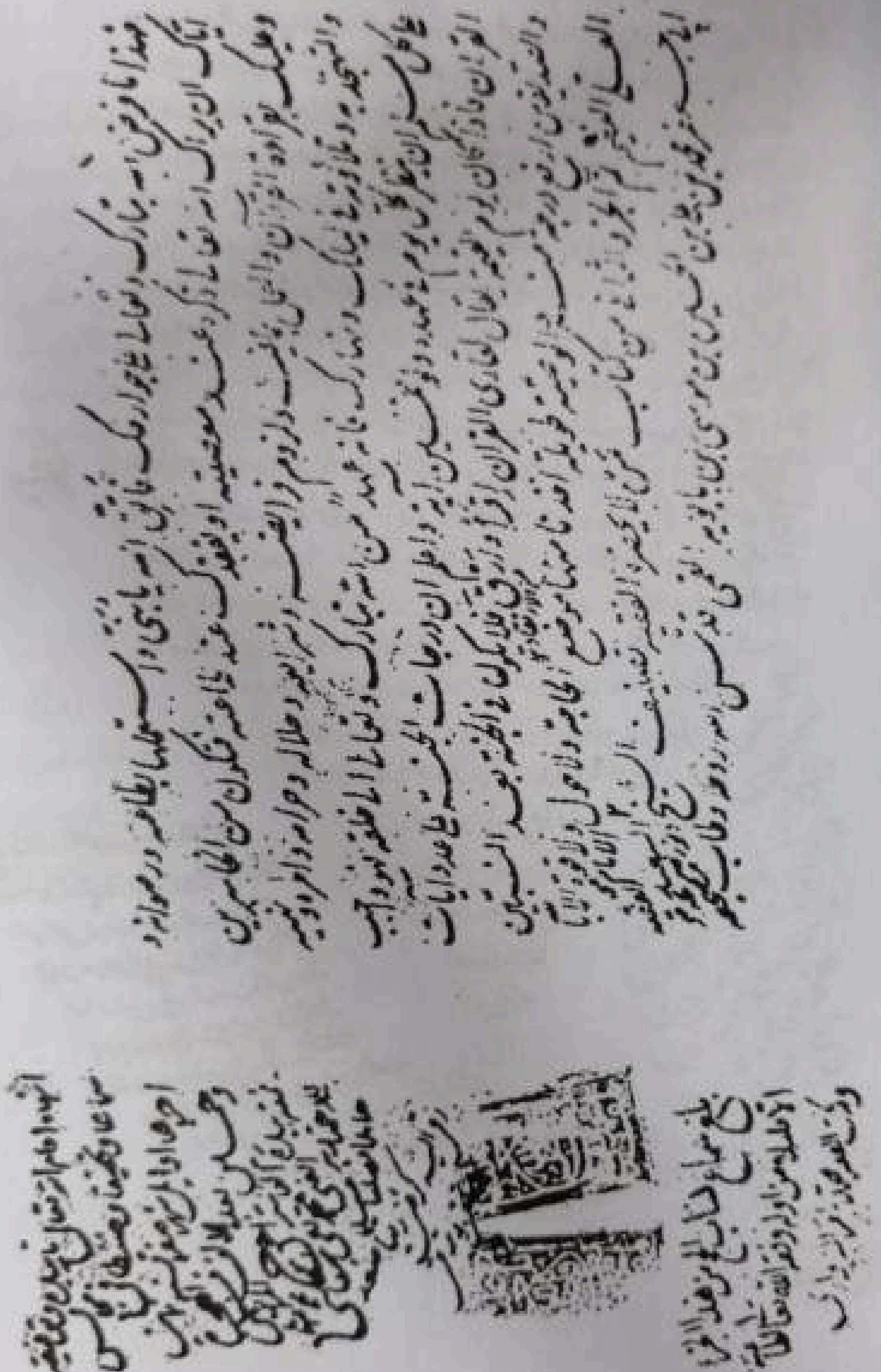
[illegible]

مؤلف کی ذاتی لائبریری میں موجود شیخ طوسی کی استبصار، مجلسی اوّل کے دستخط کے ساتھ

(صفحہ ۱۰۰ سے مربوط)

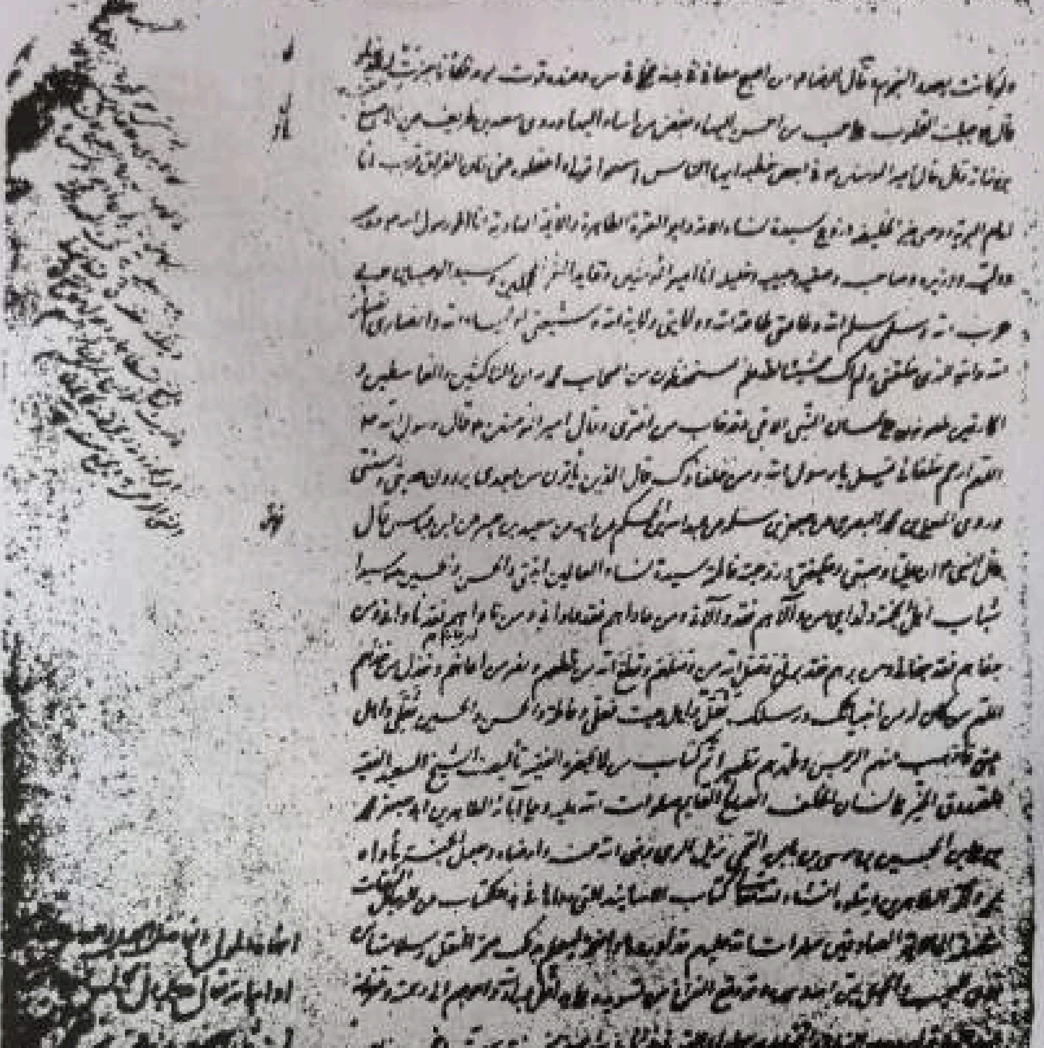


شیخ طوسی کی استبصار کا صفحہ، میر محمد باقر موسوی کے دستخط اور شہید ثانی کے نواسے شیخ محمد کے اجازۂ روایت کے ساتھ (یہ نسخہ مؤلف کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ صفحہ ۱۰۰ سے مربوط)



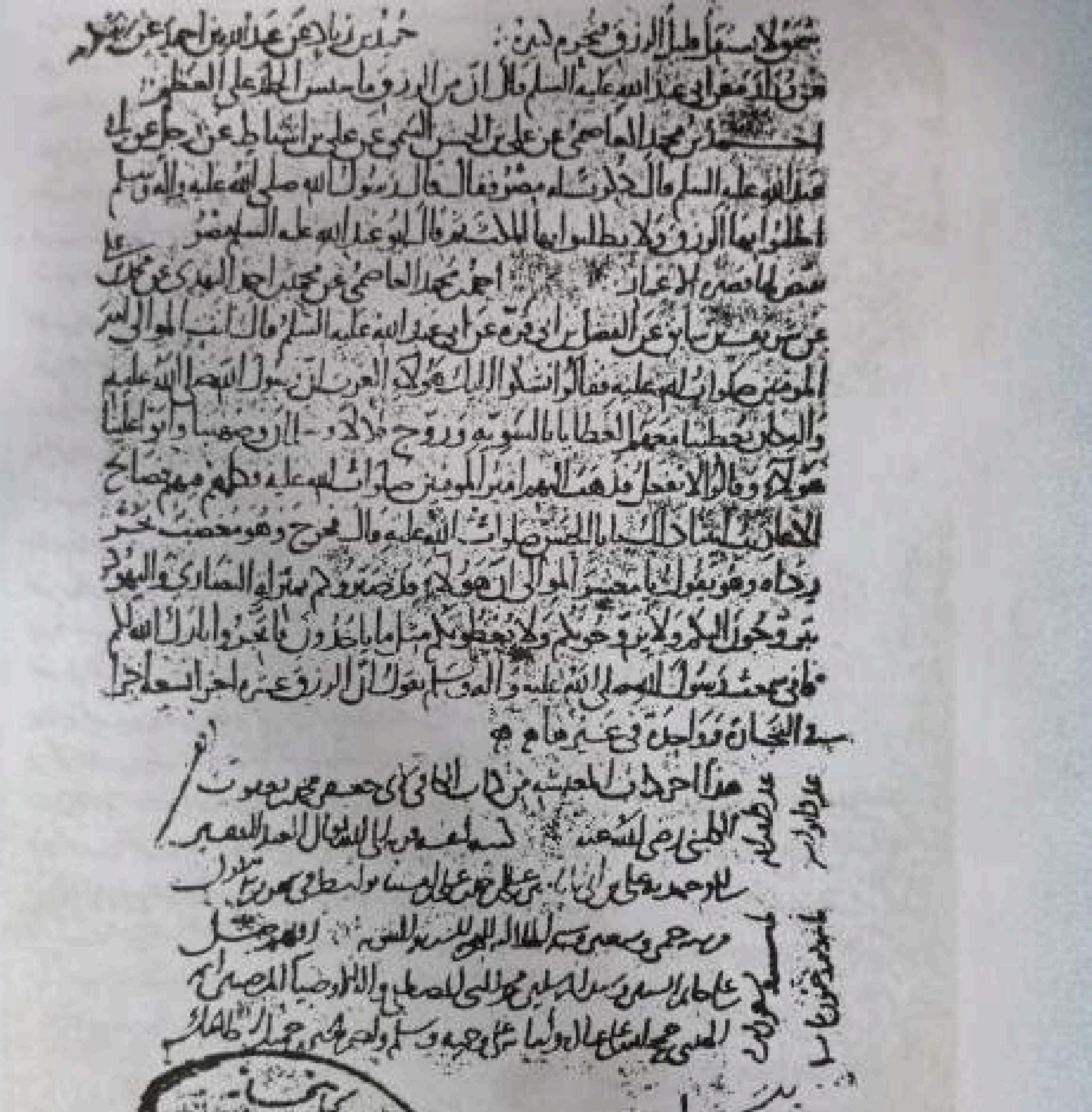
شیخ صدوق کی من لا یحضرہ الفقیہ کا صفحہ، مجلسی اوّل اور محقق سبزواری کے دستخط کے ساتھ

(یہ خطی نسخہ مدرسہ نوّاب مشہد کے کتب خانے میں موجود ہے۔ صفحہ ۹۸ سے مربوط)



شیخ صدوق کی من لا یحضرہ الفقیہ کا آخری صفحہ، مجلسی اوّل کے دستخط کے ساتھ

(یہ خطی نسخہ مدرسہ نوّاب مشہد کے کتب خانے میں موجود ہے۔ صفحہ ۹۸ سے مربوط)



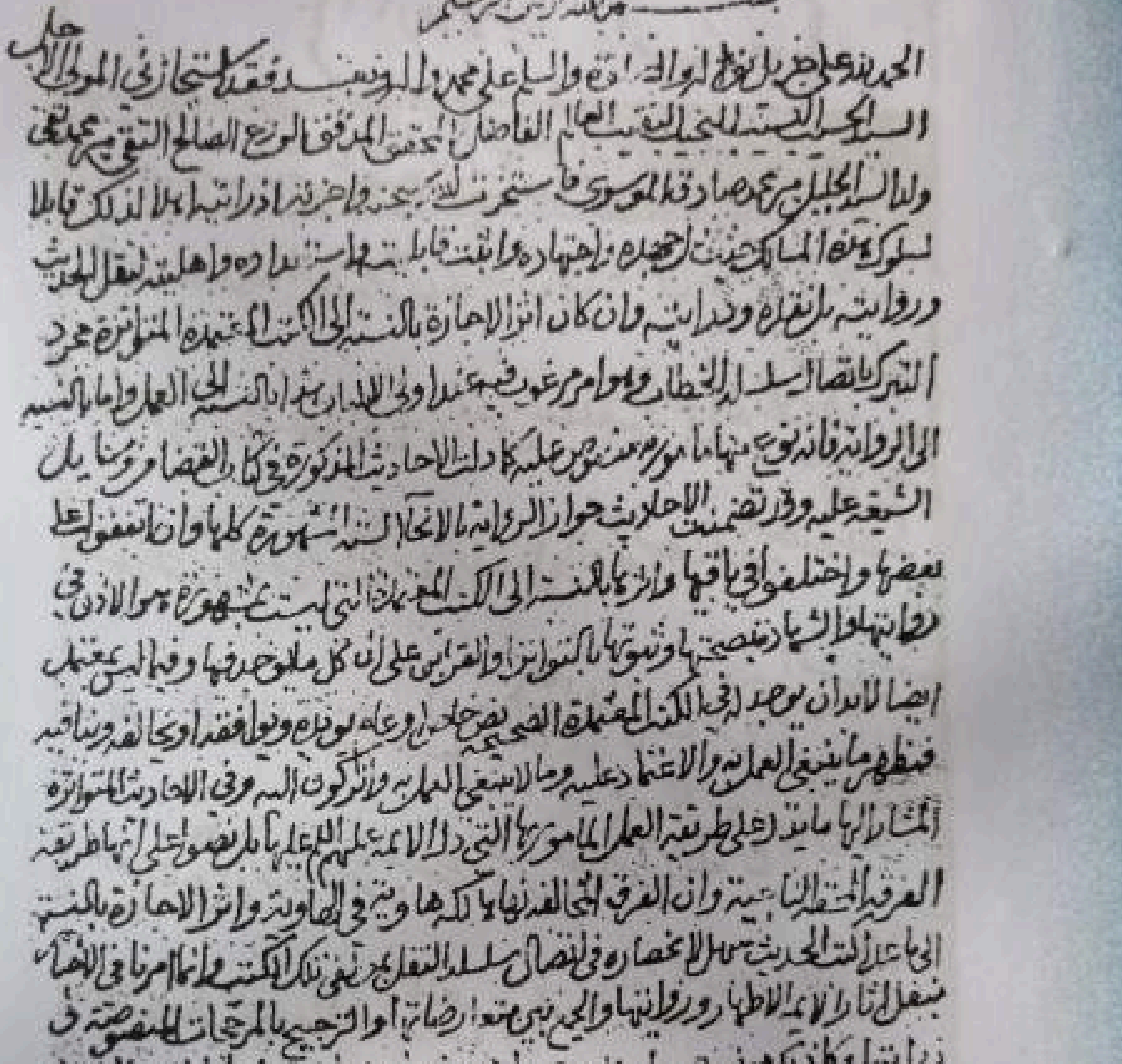
المعيشة

شيء لا يسأل أهل الرزق محروم [illegible] حميد بن زياد عن عبد الله بن أحمد عن بعض [illegible]
عن [illegible] عن أبي عبد الله عليه السلام قال إن من الرزق [illegible]
أحمد بن محمد العاصمي عن علي بن الحسن التيمي عن علي بن أسباط عن رجل عن أبي
عبد الله عليه السلام قال [illegible] قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم
اطلبوا بها الرزق ولا تطلبوا بها [illegible] قال أبو عبد الله عليه السلام [illegible]
[illegible] أحمد بن محمد العاصمي عن محمد بن أحمد النهدي عن محمد بن
عن بعض أصحابنا عن الفضل بن [illegible] عن أبي عبد الله عليه السلام قال أتت الموالي أمير
المؤمنين صلوات الله عليه فقالوا نشكو إليك هؤلاء العرب إن رسول الله صلى الله عليه
وآله كان يعطينا معهم العطايا بالسوية وزوج سلمان وبلالا وصهيبا وأبوا علينا
هؤلاء وقالوا لا نفعل فذهب إليهم أمير المؤمنين صلوات الله عليه فكلمهم فيهم فصاح
الأعاريب أبينا ذلك يا أبا الحسن صلوات الله عليه [illegible] فخرج وهو مغضب يجر
رداءه وهو يقول يا معشر الموالي إن هؤلاء قد صيروكم بمنزلة اليهود والنصارى
يتزوجون إليكم ولا يزوجونكم ولا يعطونكم مثل ما يأخذون فاتجروا بارك الله لكم
فإني قد سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله يقول الرزق عشرة أجزاء تسعة أجزاء
في التجارة وواحدة في غيرها تم

هذا آخر كتاب المعيشة من كتاب الكافي [illegible] محمد بن يعقوب
الكليني رضي الله عنه [illegible]
[illegible]

کافی کے نسخے کا آخری صفحہ جو ۶۷۵ھ میں اواسط میں لکھا گیا۔

(مدرسہ نواب مشہد کے کتب خانے میں موجود کتاب کے صفحہ ۹۸ سے مربوط)



بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله على ما من به من نعمه [illegible] والصلاة والسلام على محمد وآله الطيبين وبعد فقد استجازني المولى الأجل

السيد الحسيب النسيب النجيب النقيب العالم الفاضل المحقق المدقق الورع الصالح التقي محمد تقي

ولد السيد الجليل مير محمد صادق الموسوي فاستخرت الله سبحانه وأجزت له إذ رأيته أهلا لذلك قابلا

لسلوك تلك المسالك من حيث تحصيله واجتهاده واتصافه بما يناسب [illegible] سداده وأهليته لنقل الحديث

وروايته بل نقله ودرايته وإن كان أثر الإجازة بالنسبة إلى الكتب المعتمدة المتواترة مجرد

التبرك باتصال سلسلة الخطاب [illegible] بالنسبة إلى العمل وأما بالنسبة

إلى الرواية فإنه نوع منها مأمور به منصوص عليه كما دلت الأحاديث المذكورة في كتاب القضاء من وسائل

الشيعة عليه وقد تضمنت الأحاديث جواز الرواية [illegible] كلها وإن اتفقوا على

بعضها واختلفوا في باقيها وأثرها بالنسبة إلى الكتب المعتمدة التي ليست بمشهورة هو الإذن في

روايتها [illegible] بالتواتر أو القرائن على أن كل [illegible] وفيها [illegible]

أيضا لا بد أن يوجد في الكتب المعتمدة الصحيحة [illegible]

فيظهر ما ينبغي العمل به والاعتماد عليه وما لا ينبغي العمل به [illegible] في الأحاديث المتواترة

المشار إليها ما يدل على طريقة العمل المأمور بها التي دل الأئمة عليهم السلام عليها [illegible] طريقة

الفرقة الناجية وإن الفرق التي [illegible] وأثر الإجازة بالنسبة

إلى ما عدا كتب الحديث [illegible] اتصال سلسلة النقل [illegible] في [illegible]

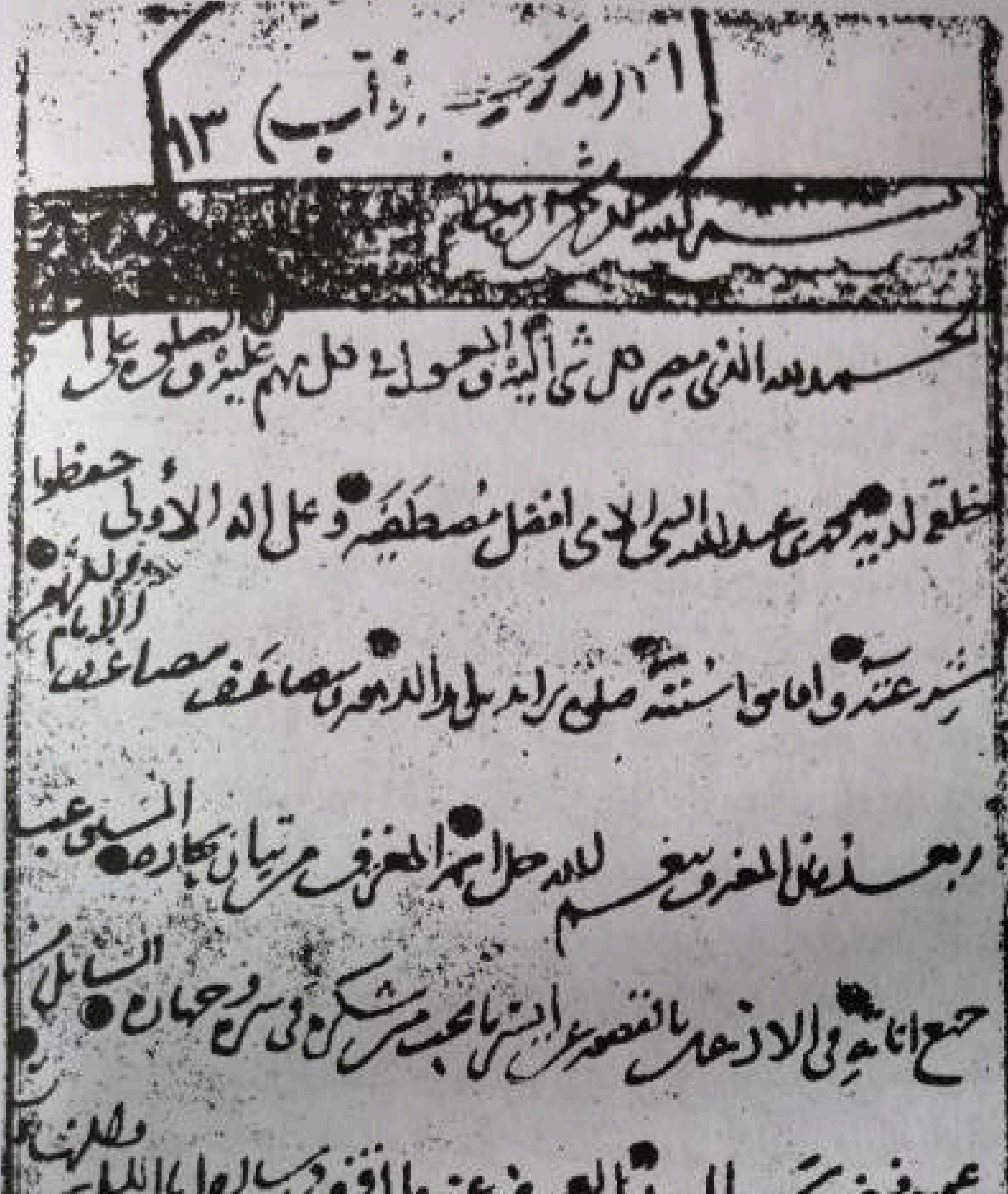
بنقل آثار الأئمة الأطهار وروايتها والجمع بين [illegible] أو الترجيح بالمرجحات المنصوصة في

رواياتها [illegible] وحيث عرفت أن الإجازة من

[illegible] الفرقة الناجية منصوصة في أحاديث العترة الهادية فقد أجزت

للسيد المشار إليه [illegible] أن يروي عني جميع كتب الحديث الأربعة وسائر الكتب

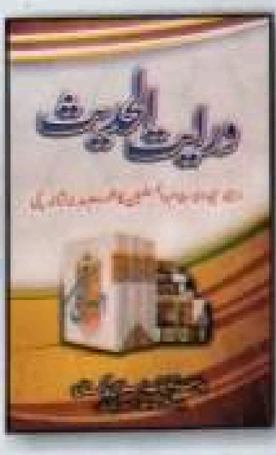
وسائل الشیعہ کے آخر میں شیخ حر عاملی کے دستخط کے ساتھ اجازۂ روایت کا عکس جو ۱۱۰۰ھ میں تحریر کیا گیا۔ (مدرسہ نواب مشہد کے کتب خانے میں موجود کتاب کے صفحہ ۱۹۸ سے مربوط)

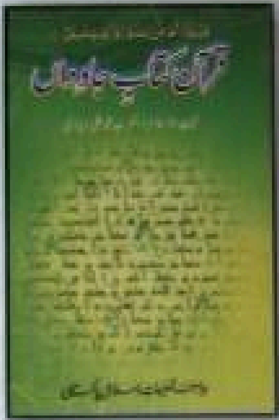
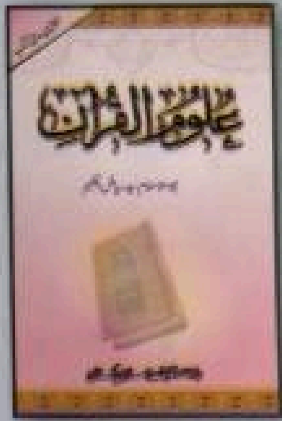


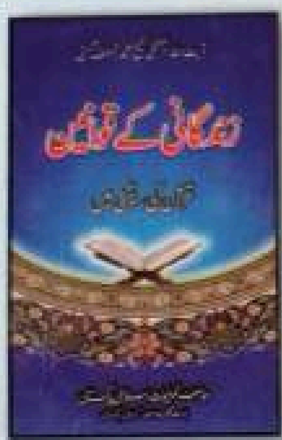
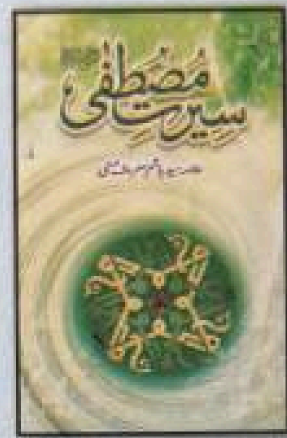
شہید اوّل کے دستخط کے ساتھ اجازہ کا پہلا صفحہ جو ۷۷۰ھ میں لکھا گیا۔

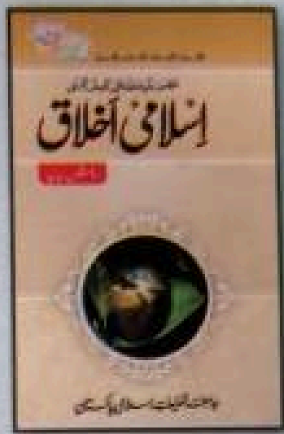
(یہ صفحہ غایۃ المراد کے آخر سے نقل کیا گیا ہے جو مدرسہ نوّاب مشہد کے کتب خانے میں موجود ہے)

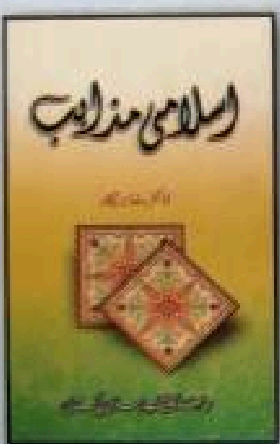
لا إله إلا الله
محمد رسول الله

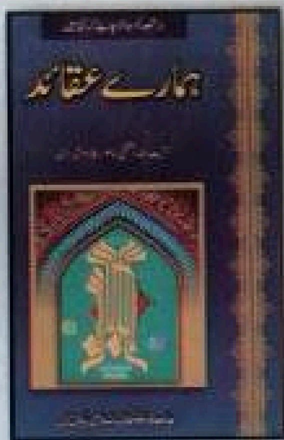


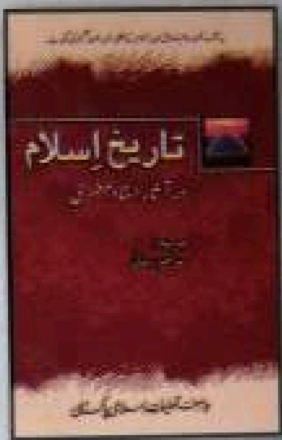



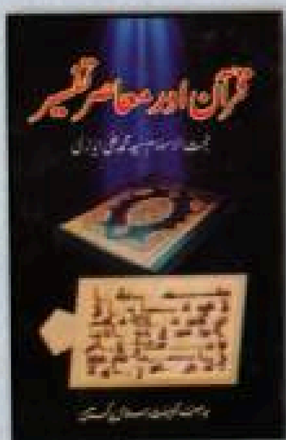
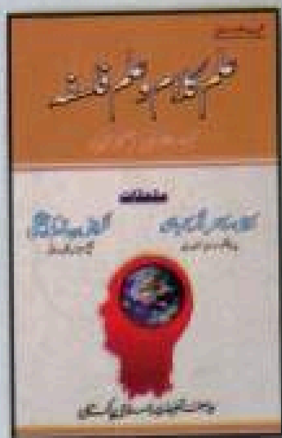











جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان